ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّب

سعید احمد اکبر آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آہ ناموسِ شریعت و قاموسِ علم

واویلا! آج ہم کو اس ذاتِ گرامی کا مرثیہ لکھنا ہے جس کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حِکم کے کشف و تحقیق میں گہرافشانی کرتا رہا۔ آج زبانِ خامہ کو اُس کی ماتم سرائی کا فرض انجام دینا ہے جو زندگی بھر ملّت بیضا کی جراحتوں کے لئے مرہم کی بہم رسانی کی فکر میں لگا رہا۔ جس کی زبان قرآن کی ترجمان تھی اور جس کا نطق نوا میس شریعت کا بیان۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا سانحۂ وفات اگرچہ "وطن سے دور" پیش آیا لیکن الحمد للہ کہ "دیارِ غیر" میں نہیں جہاں غالب کے بقول بیکسی کی شرم رہ کے رہ جانے کی تمنا ہوتی۔ بے شمار فرزندانِ توحید نے نماز جنازہ پڑھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو ذاتِ خود ایک انجمن ہو وہ وطن سے دور رہ کر بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ جہاں بیٹھتا ہے اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے۔

دیوبند گرچہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن مقامی اعتبار سے یہاں کے تین خاندانوں نے اس کو ہندوستان کے آسمان شہرت پر آفتاب و ماہتاب بنا کر چمکایا اور اسے اس مرز و بوم کی کلاہِ افتخار کا گوہرِ نور بنا دیا۔ ایک مولانا نانوتوی کا خاندان جن کے فرزند ارجمند حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم تھے۔ دوسرا مولانا ذوالفقار علی مرحوم کا خاندان جس کے گلِ سر سبد حضرت شیخ الہند تھے اور تیسرا خاندان مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم کا تھا جن کے دو صاحبزادے عارف عصر و شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور عربی کے بہترین ادیب اور نظری شاعر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ عہد حاضر کے اکابر علما و فضلا تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی اسی خاندان کے چشم و چراغ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے فرزند ارجمند تھے۔

حضرت الاستاذ ماہ محرم ۱۳۰۳ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے والد ماجد ضلع بجنور میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر مامور تھے تعلیم دار العلوم دیوبند میں پائی، اپنی غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے طلباء میں ہمیشہ ممتاز اور اساتذہ میں موقر ومحبوب رہے۔ دار العلوم دیوبند کا یہ دور نہایت شاندار تھا۔ درسِ حدیث کی مسند حضرت شیخ الہند کے وجودِ گرامی سے مزین تھی ہی اور اساتذہ بھی اپنے اپنے علوم وفنون کے ماہر اور نامور استاذ تھے۔ اساتذہ ایسے اور شاگرد حضرت الاستاذ ایسا۔ پھر کمی کس چیز کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عنفوان شباب میں ہی اسلامی علوم وفنون کے بلیغ النظر مبصر بن گئے پھر چونکہ ذہانت آپ کا جوہر تھی اور خوش تقریری وخطابت ایک فطری ملکہ اس بناء پر سب سے کم سِن ہونے کے باوجود جلد ہی اکابر دیوبند میں شمار ہونے لگے۔ حضرت الاستاذ کی ذات سے سلسلۂ دیوبند کے دورِ آخر کی پوری تاریخ مربوط تھی۔ آج وہ عہد زریں یاد آتا ہے تو سینہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے کہ ہائے! الٰہی کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا! خوشا خاک دیوبند کی زرخیزی وزہے سرزمین دار العلوم کی مردم آفرینی! کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں جو بزرگ اس خطہ سے اٹھے ان کے نفوس قدسیہ نے یہاں کے ذروں کو ہمدوش کوکب وانجم بنا دیا اور زمین حقیقۃً رشکِ آسمان ہوگئی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جو انگریزوں سے لڑنے کے بعد مکہ معظمہ میں جاکر قیام گزیں ہوگئے تھے انھوں نے اس ملک کی نئی صورت حالات کے ماتحت یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور روحانی واخلاقی تباہ حالی کا جائزہ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح کعبۃ اللہ کے در ودیوار سے لپٹ کر دیوبند کے لئے دعائیں مانگی ہوں گی کہ خدا اس خطہ کو ہندی مسلمانوں کے لئے "مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا" بنا دے تاکہ اُن کی دینی نشاۃِ ثانیہ کا سر وسامان یہاں سے ہو سکے اور سیاسی طاقت وقوت سے یک بیک محروم ہو جانے کے بعد مسلمان جس دینی ابتری اور روحانی واخلاقی اختلال وپراگندگی کا شکار ہو سکتے تھے اس سے محفوظ

سنہ ۱۳۱۰ھ میں درجہ قرآن مجید میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۲ھ میں دورۂ حدیث کی پوری جماعت میں اول درجے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۳۲۹ھ میں دار العلوم میں باقاعدہ مدرس مقرر ہو گئے اور کچھ عرصے کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری کے صدر مدرس بنا کر بھیجے گئے

ہو جائیں۔ چنانچہ ان کی فغانِ نیم شبی و گریۂ صبح گاہی کا یہ اثر ہوا کہ یہاں یکے بعد دیگرے مسلسل ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جو اس ملتِ برگشتہ بخت کے زخموں پر ٹانکے لگا لگا کر اس کے جسم میں دینی شعور وملی حیت کا خون پیدا کرتے رہے، دینِ قیم کی حفاظت وصیانت اور شریعت غرا کی ترقی واشاعت گویا ایک امانت تھی جو اس عہد سے لے کر اب تک سینہ بسینہ اور دست بدست ایک بزرگ سے اس کے جانشین دوسرے بزرگ کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے قصبہ اور ایک مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بند ہو کر ان بزرگوں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی کو نئی روح دینے میں جتنے مختلف نوع بنوع اور ہمہ جہتی کام کئے ہیں اتنے دیوبند کے سوا اور کہیں کسی جگہ نہیں ہوئے۔

اب ایسے خوش نصیب تو شاید ہی کوئی ہو جس نے اس سلسلہ کی ابتدائی کڑیوں یا یوں کہئے اس عہد کے صدر اول کو دیکھا ہو۔ البتہ ایسے حضرات بحمد اللہ کم نہیں ہیں۔ جنہوں نے اس عہد کے دور آخری کی بہاریں . . . . خود اپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی۔ تصور کیجئے تو ایک نیا عالم ہی نظروں کے سامنے آجاتا ہے ایک طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ہیں کہ مسندِ درس پر علم وعرفان کے دریا بہا رہے ہیں اور ساتھ ہی خلوتوں میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا تختہ اُلٹ دینے اور اس ملک کو فرنگی اقتدار سے آزاد کرا دینے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔ زبان قال اللہ اور قال الرسول کے لاہوتی نغموں سے سرشار ہے تو دماغ انقلابی پروگرام سوچنے میں مصروف! کوئی اس کو محسوس کرے یا نہ کرے لیکن ایک بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ حضرت شیخ الہند کی یہ سرگرمیاں آئندہ آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں نہایت موثر اور کارگر ثابت ہوں گی اور اس کے اثرات ایک عرصہ تک فضا میں محسوس کئے جاتے رہیں گے، دوسری طرف دیکھئے تو عارف ربانی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی تزکیۂ نفس وتجلیۂ باطن کی محفل گرم کر رہے ہیں مسندِ افتا پر بیٹھتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شیخ ابن ہمام نے ایک دوسرے پیکرِ خاکی میں جنم لیا ہے علم و فن کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی جائے تو حضرت الاستاذ العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کے روپ میں نظر آئیگا کہ حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم، ابن دقیق العید، ملا علی قاری اور امام رازی و فارابی ان سب کے دل و دماغ نے مل جل کر ایک قالب میں ظہور کیا ہے۔ شعر و ادب میں نظر آئیگا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی زبان سے امرء القیس اور نابغۂ ذبیانی بول رہے ہیں پھر جہاں تک عہد حاضر کے گوناگوں معاملات ومسائل کا اسلامی حل سوچنے اور ان پر فکر کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں مولانا عبید اللہ سندھی عالم اسلام کے ایک مفکرِ جلیل کی حیثیت سے نظر آئیں گے۔ وعظ و ارشاد اور اصلاح و تذکیۂ نفس کی انجمن مولانا تھانوی کے دم سے زندہ اور روشن دکھائی دیگی حضرت الاستاذ اسی گلزار سدا بہار کے ایک گل صد رنگ و بلبل ہزار داستان تھے کہ جس محفل میں شریک ہوتے رونق محفل بن کر رہتے تھے جس انجمن میں جا بیٹھتے شمع انجمن بن جاتے تھے۔ آہ صد افسوس کہ اب یہ محفل سونی ہو چلی ہے حضرت مولانا مدنی مدظلہ العالی کو چھوڑ کر اس بزم کے سب ارکان عالم آخرت کو سدھار گئے اور اب یہ بساط زرنگار الٹی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تونے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

۱۳۳۰ھ میں موتمر الانصار نامی ایک انجمن کا جسے حضرت شیخ الہند نے قائم کیا تھا اور جس کے سکریٹری مولانا عبید اللہ سندھی تھے مراد آباد میں ایک نہایت عظیم الشان تاریخی جلسہ منعقد ہوا اس میں حضرت الاستاذ نے "الاسلام" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی اور آپ کی پبلک شہرت کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا پھر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد آپ نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں۔ سہارنپور۔ غازی پور۔ لکھنؤ۔ بنارس کانپور اور علیگڈھ و دہلی وغیرہ کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں آپ کی عظمت و برتری کا سکہ بٹھادیا۔ تقریر و خطابت کے علاوہ تحریر و تصنیف کا ذوق بھی شروع سے ہی تھا چنانچہ دار العلوم دیوبند کے پرانے

ماہناموں القاسم و الرشید میں مستقل اور مسلسل مقالات کے علاوہ آپ نے "العقل والنقل" کے نام سے بھی ایک رسالہ تصنیف کیا جس کی علمی اور دینی حلقوں میں بڑی شہرت ہوئی ان مشاغل کے ساتھ مسند درس بھی آپ کے فیض سے محروم نہیں رہا ایک عرصہ تک خالصتہً لوجہ اللہ تمام علوم وفنون اور خصوصیت سے حدیث شریف کا درس دیوبند میں دیتے رہے اس زمانہ میں حضرت الاستاذ کی زندگی بالکل درویشانہ اور متوکلانہ تھی دارالعلوم کی خدمت درس بالکل مفت انجام دیتے تھے اور معاش کا صرف یہ ایک ذریعہ تھا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب غالباً سترہ روپیہ ماہوار اپنی جیب سے مولانا کے گھر بھیج دیا کرتے تھے اسی زمانہ میں زیارت حرمین شریفین کے جذبہ بیقرار سے مجبور ہو کر اپنا گھر فروخت کر کے حجاز چلے گئے اور واپس آکر پھر حسب سابق درس حدیث میں مشغول ہو گئے ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں اختلافات رونما ہوتے ان کے نتیجہ میں آپ ایک جماعت کثیر کے ساتھ ڈابھیل منتقل ہوئے چند سالوں کے بعد آپ کا انتخاب دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کے عہدہ پر ہوا اور اب آپ پھر دیوبند آگئے لیکن سات سال کے بعد آپ کو اس عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا اور اب آپ دیوبند میں ہی خانہ نشین ہو کر رہنے لگے یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۸ء میں ترک وطن کر کے کراچی تشریف لے گئے اور آخر کار ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی شام کو ریاست بہاولپور میں دو روز علیل رہنے کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا جنازہ یہاں سے کراچی لایا گیا جہاں علم وفضل کا یہ پہاڑ سپرد خاک کر دیا گیا۔

یوں تو مسلمانوں کی دینی اور علمی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو براہ راست حضرت الاستاذ کے فیوض وبرکات سے مستفید نہ ہوا ہو لیکن اس میں آپ کے سب سے زیادہ شاندار اور دیرپا کارنامے دو ہیں۔ ایک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے ترجمہ قرآن مجید کی تکمیل اور اس پر حواشی وفوائد اور دوسرا صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم ارباب نظر جانتے ہیں کہ حضرت الاستاذ نے کس جامعیت۔ اصابت رائے اور دقتِ نگاہ کے ساتھ قرآن وحدیث کی خدمت کے یہ دونوں شاہکار مرتب کئے ہیں موخرالذکر کا چرچا تو ہندوستان چھوڑ ممالک اسلامیہ تک میں ہے۔ مصر کے اکابرِ علم نے فتح الملہم کی داد دی ہے۔

فنونِ ظاہری میں درک وادراک اور جامعیت وکمال کے ساتھ آپ علومِ باطنیہ سے بھی بہرۂ
وافر رکھتے تھے اس سلسلہ میں پہلے حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے پھر پیر و مرشد مالٹا کے اسیر ہوگئے
تو آپ نے مولانا تھانوی سے رجوع کر لیا اور جب حضرت شیخ الہند واپس آئے تو پھر انھیں کی طرف
رجوع ہوگئے نماز انتہائی خشوع خضوع سے پڑھتے تھے۔ خشیۃ اللہ اور شرم وحیا کا پیکر تھے، قلب
نہایت نازک اور رقیق پایا تھا۔ لیکن تقریر کے وقت عقل کو کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہونے
دیتے تھے جو بات کہتے تھے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ بہت ناپ تول کر کے کہتے تھے
تحریک خلافت کا زمانہ حد درجہ اشتعال اور جذبات کی برانگیختگی کا عہد تھا لیکن اس زمانہ میں بھی کبھی
تقریراً یا تحریراً کوئی بات ایسی نہیں کہی جو صرف جذباتیت کا نتیجہ ہو۔ حق بات کہنے میں ہمیشہ بیباک
اور نڈر تھے۔ ہر معاملہ میں اپنی رائے صفائی اور آزادی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ چنانچہ شاید لوگوں کو اب تک
یاد ہو کہ دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے مقابلہ پر اور ۱۹۲۲ء میں گیا میں جمعیۃ
علمائے ہند کے سالانہ جلسہ کے موقع پر کونسلوں کے بائیکاٹ کے مسئلہ پر حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی مخالفت
میں حضرت الاستاذ نے کس قدر ہنگامہ آفریں اور معرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں۔ طبیعت کے مرنج و مرنجان
تھے۔ کسی کو دکھ پہنچانا یا کسی کی بدخواہی کرنا اُن کے دائرہ تصور سے باہر تھا جس سے جو وضع تھی اس کو
ہر حالت میں نباہتے تھے جمعیۃ علمائے اسلام کے قیام کے بعد بھی جب کبھی دہلی تشریف لاتے یہ ناممکن تھا
کہ کتنی ہی عدیم الفرصتی ہو دو چار گھنٹہ کے لئے اپنے بھتیجہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اُن کے بچوں
اور ہم خدام سے ملنے کے لئے دفتر برہان میں تشریف نہ لاتے۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے حضرت الاستاذ اپنے مخصوص افتادِ طبع کے باعث کبھی بھی اس میدان
کے مردِ دار و رسن نہیں ہوئے البتہ خیالات وافکار میں وہ ہمیشہ حضرت شیخ الہند کی قائم کی ہوئی جمعیت علمائے
ہند کے ساتھ رہے اور اس کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے اس کے فیصلوں میں برابر کے شریک و
سہیم رہے۔ آخر میں جب ہندوؤں کی بد دماغی اور ان کی تنگ نظری سے خوف زدہ ہو کر مسلمانوں کی اکثریت
تحریک پاکستان کی ہمنوا ہو گئی تو حضرت الاستاذ بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ اور آخر کار اس ملک کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ گئے

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ راقم الحروف کو جہاں اور اکابرِ دیوبند کی بارگاہ میں خصوصی تقرب کا شرف حاصل رہا ہے جو بلاشبہ اس گنہگار کے لئے ذخیرۂ آخرت ہے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ بھی خاص محبت کرتے اور شفقت فرماتے تھے۔ اس میں جہاں دخل اس ہیچمیرز کی استعداد کے ساتھ بزرگانہ حسن ظن کو تھا اس بات کو بھی تھا کہ بھائی عتیق (مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) کے ساتھ خصوصی برادرانہ تعلق کی وجہ سے میں گویا عثمانی خاندان کا ہی ایک فرد بن گیا تھا جب کبھی ملاقات ہوتی انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے۔ دیوبند جانا تو کئی کئی وقت کی دعوت کرتے اور خود اپنے ہاتھ سے عمدہ کھانوں کی قابیں میری طرف بڑھا کر مجھے سے کھانے کی فرمائشیں کرتے میری تقریروں اور تحریروں کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اکثر دعائیں دیتے تھے۔ ترکِ وطن کر جانے کے بعد ہم تہیدستانِ قسمت آپ کے فیوض و ارشادات علمیہ سے محروم ہو گئے تھے یہاں تک کہ اس مدت میں خط و کتابت کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا کہ کراچی سے ایک عزیز دوست نے لکھا تھا کہ "حضرت مولانا" تم کو یاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہاں چلے آؤ۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے اس دوست کو حکیم ناصر خسرو کا صرف یہ شعر لکھ بھیجا تھا

حاجی بہ رہ کعبہ و من طالب دیدار   او خانہ ہمی جوید و من صاحبِ خانہ

ایک عرصہ تک ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض معاملات میں کئی مرتبہ شکوہ سنج ہونے کی نوبت بھی آئی لیکن حضرت الاستاذ کی شفقتوں کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ ان سے شکوہ سنج ہونے میں بھی ایک لذت ملتی تھی پھر دل میں خواہ کیسے ہی شکوے ہوں لیکن جہاں خندۂ زیرِ لب اور آنکھوں کی ایک خاص جنبش کے ساتھ آپ نے خطاب کیا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ دل میں شکایت و گلہ کا گویا کبھی احساس پیدا ہی نہیں ہوا۔ آہ صد حیف! اب یہ شفقتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ من   الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکا   بطولِ اجتماعٍ لم نبت لیلۃ معا

حضرت الاستاذ کا حادثۂ وفات ملتِ اسلامیہ کے جسم پر ایک ایسا زخم کاری ہے جو عرصہ تک مندمل نہیں ہو سکتا۔ اس حادثہ سے علمِ شریعت کی دیوار میں جو شگاف پیدا ہو گیا ہے وہ مدت تک بند نہیں کیا جا سکیگا انکا وجود اس عہدِ ضلالت و گمراہی میں اللہ کی رحمت کا ایک سایہ تھا۔ وہ شریعتِ مصطفوی کے ناموس اور دینِ قیم کی آبرو تھے۔ اللہ تعالٰے ان کی قبر کو نور سے بھرپور کرے اور آخرت میں صدیقین و شہداء کیساتھ انکا حشر فرمائے۔ آمین!

حضرت شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ

اور

ہندوستان

(از جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے ال ال بی لکچرار شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی)

حضرت شیخ محی الدین بن عربیؒ کو صوفیاء اسلام کی تاریخ میں خاص شہرت اور عظمت حاصل ہے۔ اُن کے افکار و نظریات سے مسلمانوں کے بہترین دماغ متاثر ہوئے ہیں تشنگان معرفت نے اُن کی کتابوں کو آنکھوں سے لگایا ہے اور اُس میں معرفت الٰہی کی راہیں تلاش کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض مشاہیر اسلام نے اُن کے نظریات کی تردید بھی نہایت شد و مد کے ساتھ کی ہے اور بعض نے تو اُن کی تصانیف کو جلایا بھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عمل کس عظیم الشان کتاب کے ساتھ نہیں کیا گیا؟ —— تاریخ عالم شاہد ہے کہ انسانی ذہنیت نے ندرت فکر و عمل کی ہر کوشش کا استقبال طعن و تشنیع سے کیا ہے۔

اس مضمون میں میرا مقصد شیخ اکبرؒ کے عقائد یا فلسفہ پر بحث کرنا نہیں۔ بلکہ صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ شیخؒ کی تصانیف ہندوستان میں کب اور کس طرح پہنچیں؟ یہاں اُن پر کتنے حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں؟ شیخ کے نظریۂ فکر سے کون کون لوگ متاثر ہوئے؟ پھر شیخ اکبرؒ کے ان نظریات کے خلاف کس کس نے احتجاج کیا؟ اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ شیخ اکبرؒ کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔

شیخ اکبرؒ کے حالات ۔ ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۴ء کو شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ اسپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر　　تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

یہ زمانہ وہ تھا جب اسپین اپنے عروج و شباب کا دور ختم کر چکا تھا۔ ہر طرف ابتری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ اکبرؒ کا خاندان مذہبی تقدس کی وجہ سے مشہور تھا۔ اُن کے والد ماجد علی بن الحاتمیؒ اور درویش صوفی مشرب اور پاکیزہ خصلت کے بزرگ تھے۔ مرسیہ میں لوگ اُن کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ شیخ اکبرؒ ۸ سال کی عمر میں مرسیہ سے لسبن آگئے اور وہاں شیخ ابوبکرؒ سے قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اشبیلیہ چلے گئے۔ اور وہاں مشاہیر صوفیاء کی صحبت سے مستفیض ہوتے۔ اشبیلیہ سے شیخ اکبرؒ کو کچھ ایسی دلچسپی ہوگئی کہ اُسی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ لیکن ناساعد حالات نے وہاں زیادہ قیام کا موقع نہ دیا۔ اسپین کے ہر گوشہ میں شیخ اکبرؒ پہنچے اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ قرطبہ میں ابن رشد سے ملاقات ہوئی۔ ۵۹۸ھ ۱۲۰۱ء میں شیخ اکبرؒ نے مغرب کو خیرباد کہا اور مشرق کی راہ لی۔ مصر، حجاز، بغداد، ایشیائے کوچک ہر ہر جگہ گئے لیکن اُن کے نظریات میں کچھ ایسی ندرت اور سختی تھی کہ کسی جگہ لوگوں نے اُن کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ عمر کا بیشتر حصہ اسی مسافرانہ حالت میں گذرا یہاں تک کہ ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے:-

"اُن کی زندگی ایک طویل سفر تھی جنوبی اسپین سے شمالی افریقہ کے کنارے کنارے مکہ تک۔ مکہ سے ترکی اناطولیہ میں قونیہ تک۔ اور پھر وہاں سے واپس دمشق تک۔ دمشق ان کی آخری منزل تھی جہاں وہ مدفون ہیں[۱]۔

شیخ اکبرؒ کے مخالفین نے اُن کی تصویر کچھ ایسے رنگوں میں کھینچی ہے[۲] کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ شیخ پر ہمیشہ سکر کا عالم طاری رہتا تھا۔ دنیا و مافیہا سے وہ کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی اُن کا شعار تھا۔ یہ خیال انتہائی غلط اور گمراہ کن ہے۔ شیخ اکبرؒ کا مرتبہ بہ حیثیت ایک

---

[۱] Muslim Mysticism by Professor M. Habib یہ اُن لیکچروں کا مجموعہ ہے جو پروفیسر محمد حبیب نے تصوفِ اسلام پر شانتی نکیتن میں دئے تھے۔ [۲] ہندوستان کی ایک مشہور مذہبی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

عالم حدیث کے بہت بلند ہے۔ انھوں نے ملّت کی شیرازہ بندی اور احیاءِ دین کے لئے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں[1] مسلمانوں کی پریشاں حالی کو دیکھ کر جس کا یہ حال ہوگیا ہو ؎

کتبتُ کتابی والدموع تسیل ۔۔۔ وما لی الی ما ارتضیہ سبیل

میں اپنا خط لکھ رہا ہوں اور آنسو بہہ رہے ہیں ۔۔۔ اور میرے بس میں نہیں کہ اُن کو راضی کردوں

ارید اری دین النبی محمدٍ ۔۔۔ یقام ودین المبطلین یزدل[2]

چاہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو دیکھوں ۔۔۔ کہ وہ بلند کیا جائے اور جھوٹوں کا دین مٹ جائے

اس کے قلب و جگر کے اضطراب کا اندازہ کون کرسکتا ہے! شیخ اکبرؒ کے متعلق امام ذہبی کا یہ قول یاد رکھنے کا ہے ؎

"انہ کان عالماً بالاثار والسنن قوی ۔۔۔ وہ آثار و احادیث کے عالم تھے اور علوم میں انھیں

المشارکۃ فی العلوم وقولی فیہ انہ ۔۔۔ محکم دستگاہ حاصل تھی میرا قول اُن کی نسبت یہ

یجوز ان یکون من اولیاء اللہ الذین ۔۔۔ ہے کہ کچھ عجب نہیں کہ وہ ان اولیاء اللہ میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) درس گاہ کے فارغ التحصیل نے اُن کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے وہ ملاحظہ ہوں ـــــ

"اس عقیدہ کا پرجوش علمبردار ابن العربی اندلس کا رہنے والا تھا۔ اس لئے قرینِ قیاس ہے کہ وہ افلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوا ہو" الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۵

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کو ایک انگریزی داں طالب علم سے شکایت تھی کہ اُردو میں لکھتے ہیں "امام غزالی کہتا ہے" (تقریظ فتوح السلاطین) یہاں ایک مشرقی علوم کی درسگاہ کے فاضل کا اخلاق ملاحظہ ہو۔!

کسی شخص کے نظریات سے اختلاف کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے لیکن مشاہیر اسلام کے متعلق اس طرح گفتگو کرنا علمی محفل کے آداب سے نابلد ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

[1] یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ انشاء اللہ آیندہ اس کی وضاحت کرونگا۔

[2] فتوحات مکیہ۔ (مطبوعہ مصر) ج ۴ ص ۶۹۲۔

اجذبھم الحق الی جنابہ عند الموت ہوں جن کو جاذبہ الٰہی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور
ختموا بالحسنی[۱] اُن کا خاتمہ بخیر ہوتا ہے۔"

شیخ کی تصانیف | شیخ اکبرؒ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف کا ایک بیش بہا ذخیرہ چھوڑا تھا۔ مولانا جامی نے اُن کی تصانیف کی تعداد ۵۰۰ بتائی ہے[۲]۔ بر کلمان نے اُن کی ڈیڑھ سو اسی تصانیف کی فہرست دی ہے جو اب بھی دستیاب ہیں[۳]۔ شیخ کی ان سب کتابوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ کے نظریات اور عقائد کا نچوڑ ان ہی کتابوں میں ملتا ہے۔

شیخ اکبرؒ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود ہے۔ مختصراً اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ یا یہ کہ جو کچھ وجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اہل ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے۔ صوفیاء کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں ہے

با وحدت حق ز کثرت خلق چہ باک صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگادی جاتی ہیں، اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے ممتاز نظر آتا ہے لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا گرہ کوئی زائد چیز نہیں۔ صرف صورت بدل گئی ہے[۴]۔

---

[۱] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۲۳ [۲] نفحات الانس۔

[۳] Muhyid-Din Ibn ul Arabi by Affifi, p. XVII

[۴] جناب محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، "مولانا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ناقد" میں لکھتے ہیں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے اس حقیقت کو ایک نہایت دل پسند مثال سے اس طرح سمجھایا ہے کہ آپ ایک شمع لیجئے اور اُس کے چاروں طرف مختلف رنگوں کے شیشے لگا دیجئے۔ آپ دیکھا ہے کہ ہر شیشہ سے اس کے رنگ کے مطابق ہی رنگین روشنی منعکس ہو رہی ہے، لیکن کیا یہ روشنی شیشہ کی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ دراصل وہی ایک شمع کی روشنی ہے جو مختلف رنگ کے شیشوں سے منعکس ہو ہو کر باہر نمودار ہو رہی ہے۔" ص ۹۰

شیخ اکبرؒ کی تصنیفات ہندوستان میں | شیخ اکبرؒ کی تصنیفات ہندوستان میں کب اور کس ذریعہ سے پہنچیں؟ اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل امور پہ غور کرنا ہے۔

(۱) شیخ کے خیالات اور تصنیفات کے ہندوستان میں پہنچنے کے کیا کیا ذریعہ ہو سکتے تھے؟

(۲) شیخ اکبرؒ کا نام اور اُن کی تصانیف کے حوالے ہندوستان کے مذہبی لٹریچر میں کب سے ملتے ہیں؟

(۳) شیخ کے نظریات کا باقاعدہ اثر کب سے اور کن تصانیف میں محسوس ہوتا ہے؟

شیخ محی الدین بن عربیؒ کی امام فخر الدین رازیؒ سے بعض اہم نظریات پہ خط و کتابت ہوئی تھی[1] امام رازیؒ کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کے دربار سے اُن کا قریبی تعلق تھا۔ اور سلطان کے ہمراہ وہ ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ ممکن ہے کہ امام رازیؒ کے ذریعہ ہندوستان میں شیخ اکبرؒ کا نام یا اُن کی تصانیف پہنچ گئی ہوں! لیکن یہ صرف قیاس ہے۔ شیخ اکبرؒ کے نظریات اور اُن کے نام کے ہندوستان میں پہنچنے کا حوالہ سب سے پہلے شیخ صدر الدین عارف سہروردیؒ کے ذکر میں ملتا ہے۔ سیر العارفین میں لکھا ہے——

"بعد از وفات حضرت شیخ الاسلام (شیخ بہاؤ الدین ذکریا) چوں (عراقی) از ملتان عزیمت بیت اللہ نمود، از آنجا در روم رسید، در شہر قونیہ در آمد، آنجا شیخ صدر الدین قونوی خلیفہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ

---

[1] شیخ اکبرؒ کے ایک خط کی نقل آصفیہ کتب خانہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ خط امام رازی کے نام ہے اس خط میں شیخ اکبرؒ نے عقل و وجدان، یا دل و دماغ کی صلاحیتوں پہ نہایت ہی پُر تاثیر گفتگو کی ہے۔ اور امام رازی کو بتایا ہے کہ "کار دین" استدلال سے ممکن نہیں۔ عقل انسانی کے ذرائع محدود ہیں۔ اُن پہ اعتماد کرنا درست نہیں۔ اُن کی رہنمائی میں انسان ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ عقل، دل کو سکون نہیں پہنچاتی۔ وہ دماغ میں ہیجان پیدا کرتی ہے۔ اس کے بعد شیخ اکبرؒ نے امام فخر الدین رازی سے کہا ہے کہ وہ اپنے اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں کہ جب تیس سال کی محنت کے بعد ایک نتیجے پہ پہنچے تھے، لیکن عقل نے پھر ایک لمحہ میں ایک شبہ پیدا کر کے ساری عمارت گرا دی۔

قدس سرہٗ بود، چندگاہ در صحبت ایشاں گزرانید و نسخہ لمعات مذکور در قونیہ تصنیف فرمودہ است و ازاں جا کتابے متضمن کلمات و نکات عرفان بجانب شیخ الاسلام صدرالدین عارفؒ نوشتہ کہ مارا آلان بعونی صحبت افتاد کہ کلماتش ایں است،۔۔۔۔۔ در ایامے کہ شیخ فخرالدین عراقی در قونیہ آمد اول بہ صحبت شیخ نورالدین جندی رسید کہ او نیز از مریدان کبار شیخ محی الدین ابن عربی است و باتفاق او حضرت شیخ صدرالدین قونوی را دریافت و نسخہٗ فصوص در صحبت ایشاں مطالعہ کرد چنانچہ در فصوص، بیست و ہشت فص است، او نیز در لمعات بیست و ہشت لمعہ نوشت[۱]

شیخ صدرالدین عارفؒ نے ۶۸۴ھ میں وصال فرمایا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قبل شیخ اکبرؒ کا نام اور نظریات ہندوستان پہنچ گئے تھے۔

شیخ اکبرؒ کی تصانیف کے ہندوستان میں پہونچنے کے سلسلہ میں تاریخ فرشتہ کی ایک عبارت بھی قابل غور ہے ——— لکھتا ہے:-

"شیخ نظام الدین اولیاء جامع علوم ظاہری و باطنی بودہ، پیوستہ دل انوار منزل را بہ کتب معتبرہ تصوف مثل فصوص الحکم و مواقع النجوم و شرح آنہا مشغول میداشت[۳]"

سیر العارفین کی جو عبارت اس سے قبل درج کی گئی اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ عارفؒ کے زمانہ میں کم از کم شیخ اکبرؒ کا نام اور اُن کے نظریات ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ شیخ عارفؒ کا انتقال ۶۸۴ھ

---

[۱] سیر العارفین۔ ص ۱۰۹ [۲] شیخ عارفؒ، سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اُن کا ذکر اخبارالاخیار میں نہایت تفصیل سے کیا ہے (ص ۶۳-۶۱) انھوں نے شیخ عارفؒ کے بعض ملفوظات بھی نقل کئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبرؒ کے نظریات سے وہ بھی متاثر ہوتے تھے مثلاً فرمایا کرتے تھے ———

"آرزوئے بہشت و خوف دوزخ در دل نیار و جز بحق قرار نگیرد۔۔۔۔۔۔" ص ۶۲

مولانا شاہ حسن میاں صاحب بن شاہ محمد سلیمان پھلواروی، تذکرہ حضرت ابوالنجیب عبدالقاہر السہروردی میں لکھتے ہیں ——— واضح رہے کہ حضرت شیخ کے بعد حضرت کے سلسلے کے جتنے اکابر گذرے ہیں وہ سب وحدت وجود کا مسلک رکھتے تھے۔ سوائے حضرت علاءالدولہ سمنانی کے۔۔۔۔۔" ص ۱۱۵

[۳] تاریخ فرشتہ۔ ج ۲ ص ۳۹۱۔

میں ہوا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ۷۲۵ھ میں وصال فرمایا۔ ہوسکتا ہے کہ ان ۱۲ سال کی مدت میں شیخ اکبرؒ کی کتاب فصوص الحکم بھی ہندوستان آگئی ہو۔ لیکن میں فرشتہ کا یہ بیان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ فصوص الحکم، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ شاید قرون وسطیٰ کے کسی صوفی بزرگ کے متعلق ہمارے پاس اتنا مواد نہیں ہے جتنا شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے متعلق ہے۔ ان کے معاصر ملفوظ نگار۔ میر حسنؒ اور میر خوردؒ نے اُن کی زندگی کا ہر ہر گوشہ روشن کردیا ہے۔ انھوں نے کسی جگہ شیخ اکبرؒ یا فصوص الحکم کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں فرشتہ نے یہ بات قیاساً لکھدی ہے۔ بہرحال سلطان فیروز تغلق کے عہد میں (۷۵۲ - ۷۹۰) شیخ اکبرؒ کی تصانیف ہندوستان میں خوب اچھی طرح پھیل گئی تھیں، اس کا ثبوت مسعود بیک کی مراۃ العارفین اور شیخ ہمدانی کی شرح فصوص الحکم ہے۔

مسعود بک پر شیخ اکبرؒ کے نظریات کا اثر | مسعود بک، سلطان فیروز تغلق کے رشتہ داروں میں تھے جذبہ الٰہی غالب آیا اور لباس غنا کو ترک کرکے درویشی اختیار کرلی۔ شیخ محدثؒ نے اُن کو شیخ رُکن الدین بن شیخ شہاب الدین امامؒ کا مرید بتایا ہے[1]۔ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں ان کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا مرید بتایا ہے[2]۔ انھوں نے اپنی یادگار ایک دیوان اور ایک کتاب مرآۃ العارفین چھوڑی ہے۔ ان دونوں میں گفتگو کا عنوان وحدت الوجود ہے۔ لفظ لفظ پکار کر کہتا ہے کہ میں جس کی زبان سے نکلا ہوں وہ امام اکبرؒ کے رنگ میں رنگا جا چکا ہے مرآۃ العارفین کا دیباچہ ملاحظہ ہو ــــــ

"لسان وقت ناطق است دمین غیب شاہد ما غائباں حاضریم وحاضراں غائب ازاں روے کہ ما ئیم پیدا نہ ایم واز انروے کہ ما نہ ایم ہویدا ئیم اگر کشف رموز غیب جزئی ما را ما گوئی"[3]

اس کتاب میں جس جس جگہ حقیقت روح، من عرف نفسہ فقد عرف ربہ وغیرہ پر گفتگو کی ہے وہاں شیخ اکبرؒ کے اثرات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ شیخ محدثؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے ــــ

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۱۹۹۔ [2] گلزار ابرار۔ ص ۹۱م۔ [3] مراۃ العارفین (قلمی نسخہ)

"دے از مستان بادۂ وحدت وخم شکنانِ خمخانۂ حقیقت است، سخن مستانہ می گوید، در سلسلہ چشتیہ ہیچ کس ایں چنیں اسرارِ حقیقت فاش نگفتہ دستی نکردہ کہ او کردہ، بگویند اشک او بحدے گرم بود کہ اگر بر دست کسے می افتاد می سوخت"[1]

حضرت میر علی ہمدانیؒ کی شرح فصوص الحکم | حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر کے سب سے زیادہ ممتاز صوفیاء میں ہیں۔ ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء میں ایران میں پیدا ہوئے تھے۔ ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء میں وطن چھوڑ کر کشمیر آ گئے تھے اور وہیں ۱۳۸۴ء کو وصال فرمایا تھا۔ شیخ ہمدانی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے فصوص الحکم کی شرح عربی میں لکھی تھی۔ اس شرح کا ایک نادر نسخہ سجادہ نشین گولڑہ شریف کے پاس ہے[2]۔ یہ غالباً فصوص الحکم کی پہلی شرح ہے جو ہندوستان میں لکھی گئی ہے۔

حضرت میر ہمدانی کی بعض مشہور تصانیف یہ ہیں:-

مجمع الاحادیث۔ شرح اسمائے حسنی۔ مراۃ التائبین۔ ذخیرۃ الملوک۔

ابوالمحاسن شرف الدین دہلوی کی شرح فصوص الحکم | ابوالمحاسن شرف الدین دہلویؒ (المتوفی ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء) نے فصوص الحکم کی شرح عین الفصوص شرح الفصوص کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ کتب خانہ حیدرآباد میں ہے۔ (رج نمبر ۲۷۶)

حضرت سید محمد گیسو درازؒ اور شرح فصوص الحکم | حضرت سید محمد گیسو درازؒ (۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) حضرت چراغ دہلویؒ کے خلیفہ تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اُن کو چشتیہ سلسلہ کا "سلطان قلم" کہا جا سکتا ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے فصوص الحکم کی ایک شرح لکھی تھی۔ اُن کے ملفوظات جوامع الکلم میں شیخ اکبرؒ کا متعدد جگہ ذکر ہے۔ اُن کی ایک کتاب آداب پیر و مرید کے کئی موقعوں

---

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۱۶۹ [2] ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اپنی کتاب

The Contribution of India to Arabic Literature

میں اس کتاب کو معدوم بتایا ہے۔ سجادہ نشین درگاہ گولڑہ شریف کے پاس جو قلمی نسخہ ہے وہ حال ہی میں علی گڈھ سے گولڑہ پہنچا ہے

پر حوالے ہیں[۱]۔

شیخ علی پیر و مہائمی کی شرح فصوص الحکم | شیخ علی پیر و ابن شیخ احمد مہائمی (المتوفی ۸۳۵ھ) ہندوستان کے نہایت ہی مایۂ ناز علماء میں ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم، یادِ ایام میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں

"میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں اُن کا کوئی نظیر نہیں[۲]"

شیخ اکبرؒ کی تصانیف پر اُن کو ایسا عبور تھا کہ بقول حکیم سید عبدالحئی مرحوم، اُن کو "ابن عربی ثانی" کہا جا سکتا ہے[۳]۔ فصوص الحکم سے متعلق انھوں نے دو کتابیں لکھی تھیں ——— مشرح الخصوص فی شرح الفصوص لابن العربی ——— فصوص النعم فی شرح فصوص الحکم

اُن کی شرح کی خوبی بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی یہ تھی کہ

"دراں در تطبیق ظاہر و باطن کوشیدہ[۴]"

شیخ اکبرؒ سے اُن کو اس قدر تعلق تھا کہ یہ سن کر کہ یمن میں ایک عالم شیخ کی مخالفت کرتا ہے، انھوں نے یمن کا سفر کیا تاکہ اس عالم کو شیخ کے نظریات سمجھائیں[۵]۔

شیخ مہائمی کی دو اور مشہور کتابیں تفسیر تبصرۃ الرحمٰن اور زوارف شرح عوارف المعارف ہیں تفسیر تبصرۃ الرحمٰن کو حضرت مجدد صاحبؒ انتہائی ناپسند کرتے تھے بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شیخ مہائمی نے اپنے نظریات کی روشنی میں قرآن پاک کی تفسیر کی ہو گی۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی شرح فصوص الحکم | حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ چشتیہ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ شیخ محدث نے اُن کی ساری خوبیوں کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔

"صاحب علم و عمل و ذوق و حالت و حلاوت وجد و سماع[۶]"

شیخ اکبرؒ کے نظریات کا اُن پر بہت گہرا اثر تھا۔ محمد غوثی کا بیان ہے کہ شیخ گنگوہی نے فصوص

---

[۱] جوامع الکلم، مطبوعہ حیدرآباد۔ ص ۲۱۴-۲۱۱ [۲] یادِ ایام۔ ص ۵۲ [۳] ایضاً ص ۵۲ [۴] اخبار الاخیار [۵] گلزار ابرار [۶] اخبار الاخیار

کی ایک شرح لکھی تھی۔ یہ شرح جہاں تک مجھے معلوم ہے اب دستیاب نہیں ہوتی۔

شیخ عماد الدین عارف کی شرح الفصوص | شیخ عماد الدین محمد عارف العثمانی المعروف بہ عبد النبی شطاری آگرہ کے مشہور بزرگ شیخ عبداللہ شطاری[1] کے مرید تھے۔ انھوں نے فصوص الحکم کی شرح "شرح الفصوص" کے نام سے لکھی تھی۔

شیخ علی اصغر قنوجی کی شرح الفصوص | شیخ علی اصغر (۱۰۵۱ - ۱۱۴۰ھ) قنوج کے مشہور علماء میں تھے حدائق الحنفیہ میں لکھا ہے "فقہ۔ حدیث۔ تفسیر۔ صرف۔ نحو۔ منطق۔ معانی میں وحید العصر، فرید الدہر تصوف و سلوک میں امام وقت تھے"[2] انھوں نے فصوص الحکم کی شرح ——— "جوامع الکلم فی شرح فصوص الحکم" ——— کے نام سے لکھی تھی اس کا ایک نادر نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے (نسخہ نمبر ۱۲۷۴) شیخ قنوجی کی بعض مشہور تصانیف یہ ہیں ——— "ثواقب التنزیل" ——— "تبصرۃ المدارج"

محمد افضل الہ آبادی کی شرح فصوص | شیخ محمد افضل الہ آبادی (۱۰۳۸ - ۱۱۲۴ھ) میر سید محمد کالپی کے مرید تھے۔ انھوں نے فصوص الحکم کی شرح لکھی تھی جو اُن کے زمانہ میں بہت پسند کی گئی تھی۔ اب یہ شرح نایاب ہے۔

شیخ نور الدین احمد آبادی کی شرح | شیخ نور الدین (۱۰۶۴ - ۱۱۵۵ھ) کا شمار گجرات کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا۔ حکیم سید عبد الحئی مرحوم اُن کے متعلق لکھتے ہیں "علامہ وجیہہ الدین کے بعد گجرات میں باعتبار درس و تدریس اور کثرتِ تصنیفات کے اُن سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا"[3] آزاد بلگرامی نے لکھا ہے ———

"زیادہ بر یکصد و نیجاہ تصنیف صغیر و کبیر در سلک تحریر کشید"[4]

انھوں نے فصوص الحکم کی ایک شرح ——— "طریقۃ الامم فی شرح فصوص الحکم" لکھی تھی۔ اُن کی مشہور تصانیف کی فہرست یاد ایام[5] اور حدائق الحنفیہ[6] میں درج ہے۔

---

[1] گلزار ابرار [2] گلزار ابرار [3] ص ۴۳۸ [4] یاد ایام۔ ص ۶۲ [5] ماثر الکرام ص ۲۱۶ [6] ص ۶۲

[6] ص ۴۴۳

سید عبد الاول دولت آبادی کی شرح فتوحات | سید عبد الاول دولت آبادی، ہندوستان کے سب سے پہلے عالم ہیں جنہوں نے "صحیح البخاری کی شرح (فیض الباری)" لکھی ہے۔ شیخ محدث نے اُن کے متعلق لکھا ہے

"دانش مند بود جامع جمیع علوم عقلی و نقلی و رسمی و حقیقی[1]"

حضرت ابن عربیؒ کی تصانیف پر اُن کا عبور ضرب المثل تھا۔ گلزار ابرار کے مصنف نے لکھا ہے۔

"شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات میں خطبہ سے لے کر خاتمہ تک جو دشواریاں تھیں اُن کو مطالعہ کے زور سے حل کیا تھا۔ اور حاشیے اور تعلیقات لگا کر صاحبان استعداد کے واسطے آسان کر دیا تھا[2]"

شیخ محب اللہ الہ آبادی کی شرح فصوص الحکم | شیخ محب اللہ الہ آبادی (المتوفی ۱۰۵۸ھ) اپنے زمانہ کے مشہور علماء و مشائخ میں تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ کی تصانیف پر اُن کے عبور کا یہ عالم تھا کہ

"تحقیقات و تدقیقاتش در علم تصوف بدرجۂ اجتہاد رسیدہ بلکہ می رسد کہ شیخ ابن العربی را شیخ اکبر و دے را شیخ کبیر گویند[3]"

انھوں نے فصوص الحکم کی شرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی تھی۔

بحر العلوم کی شرح فصوص الحکم | ملا عبد العلی بحر العلوم (المتوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء) کا شمار ہندوستان کے نہایت ہی عظیم المرتبت علماء میں کیا جاتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں۔

"ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادے ملا عبد العلی ہیں۔ جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض بڑھ کر دریائے فیض بن گیا۔ اور دنیا نے اُن کو بحر العلوم کہہ کر پکارا۔ یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا ہوا، خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا[4]"

انھوں نے فصوص الحکم کی شرح "شرح الفص النوحی من فصوص الحکم" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا ایک نادر نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے (نمبر ۴۸۴۳) ان شروحوں کے علاوہ بعض اور

---

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۲۵۳ [2] گلزار ابرار۔ ص ۲۰۵ [3] تذکرہ علمائے ہند [4] حیات شبلی۔ ص ۲۱

شرحیں بھی ہندوستان میں لکھی گئی تھیں۔
مثلاً شیخ عبدالکریم لاہوری کی فارسی شرح الفصوص، مولوی احمد حسین کانپوری کی فارسی شرح یا اُردو میں عبدالغفور دوستی، مولوی سید مبارک علی، اور مولوی عبدالقدیر صاحب حیدرآبادی کے فصوص الحکم کے ترجمے۔ ظاہر ہے کہ ایک مضمون میں ان سب شرحوں کا ذکر ممکن نہیں یہاں صرف چند اہم شرحوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

مسئلہ وحدت الوجود پر لٹریچر | شیخ اکبرؒ کی تصنیفات پر شرحوں کے علاوہ اُن کے نظریہ وحدت الوجود پر ہندوستان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض اہم کتابیں یہ ہیں۔

(۱) شرح التوحید ۔ شیخ علی مہائمی ۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس میں ہے ۔ (نمبر ۱۳۶۲)

(۲) الرسالہ فی اثبات الاحدیہ شیخ امان اللہ پانی پتی۔ (آصفیہ کتبخانہ حیدرآباد میں قلمی نسخہ ہے ع ۱۳۶۲

(۳) کتاب الوحدۃ ۔ سبغتہ اللہ بن روح اللہ حسینی گجراتی

(۴) عقائد الموحدین ۔ شیخ عبدالکریم بن مخدوم الملک عبداللہ

(۵) عقائد الخواص ۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی۔

(۶) رسالہ فی مسئلہ وحدت الوجود۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

(۷) الروض المجود فی تحقیق الوجود۔ امام فضل حق خیرآبادی۔

(۸) رسالہ الہامات الموجود ۔ شیخ محمدؒ تھانوی

(۹) ریاض القدس ۔ شاہ نظام الدین بلخی وغیرہ وغیرہ

ہندوستان میں شیخ اکبرؒ کے نظریات اور کتابوں کے سلسلہ میں مشائخ کی احتیاط | ہندوستان کے مشائخ اور صوفیاء نے شیخ اکبرؒ کے نظریات اور تصنیفات کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ چشتیہ سلسلہ کے مشائخ کا وحدت وجود پر ایمان تھا۔ لیکن اس تمام عقیدت اور ارادت کے باوجود وہ عوام کو اس کے مطالعہ کی دعوت دینا مناسب نہ سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ وحدت الوجود کی کل گفتگو اس قدر نازک ہے کہ عوام اس کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور ایسی صورت میں گمراہی اور بے دینی کا پیدا ہو جانا لازمی

امر ہے۔ شاہ نور محمد صاحب مہاروی جن کا وحدت الوجود پر ایمان راسخ تھا، فرمایا کرتے تھے
"بر امم ماضیہ کہ حوادث واقع می شدند محض برائے اظہار وحدت وجود[1]"
چنانچہ اس خیال کے پیش نظر مشائخ نے جو احتیاطیں برتیں وہ یہ تھیں۔
(۱) مشائخ نے اس مسئلہ پر (یعنی وحدت وجود پر) گفتگو کی سخت ممانعت کر دی تھی۔
شاہ کلیم اللہ صاحب شاہ جہاں آبادیؒ ایک مکتوب میں اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو ہدایت کرتے ہیں۔
"مسئلہ وحدت وجود را پیش ہر آشنا و بے گانہ نخواہید بر زبان آورد[2]"
حافظ محمد علی صاحب خیرآبادیؒ اس معاملہ میں اتنی سختی برتتے تھے کہ وحدت وجود پر گفتگو کو "الحاد و زندقہ" کہا کرتے تھے[3] یاد رہے کہ وحدت الوجود پر اُن کا ایمان کامل تھا۔
(۲) ہر کس و ناکس کو شیخ اکبرؒ کی کتابوں کے مطالعہ کی اجازت نہ ملتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ جب تک فصوص الحکم کی قرأت کسی "صاحب نظر" بزرگ کے سامنے نہ کی جائے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ محمد غوثی کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فصوص الحکم کو پڑھانے کے لئے باقاعدہ سند حاصل کی جاتی تھی[4]۔ خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ نے اپنے ایک مرید کو فصوص الحکم کا درس اپنا حجرہ بند کرا کر دیا تھا۔
(۳) فصوص الحکم کی زیادہ تر شرحیں عربی میں لکھی گئی ہیں۔ میرے خیال میں علماء و مشائخ نے عربی کا انتخاب بھی مصلحتاً کیا تھا وہ عوام کو اس نازک گفتگو میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے شاہ فخر الدین صاحب دہلویؒ نے فصوص کی شرح فارسی میں اسی لیے نہیں لکھی کہ عوام اس کو ٹھیک طرح نہ سمجھ سکیں گے پھر غلط فہمی پیدا ہوگی۔
(۴) مشائخ، فصوص الحکم کا درس دینے سے اس لئے بھی گریز کرتے تھے کہ اُن کی نظر میں فصوص کا معاملہ دماغ سے نہیں دل سے تھا۔ اس کو مطالعہ کرنا ایک کیفیت کو اپنے اوپر طاری کرنا تھا۔

---
[1] مناقب المحبوبین۔ ص ۷۰ [2] مکتوبات کلیمی ص ۴۷ [3] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۵۵ [4] گلزار ابرار۔ ص ۵۴۳

خواجہ یعقوب بن خواجہ بن خواجگی (م ۹۱۶ھ) کا طرزِ عمل اس کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ گلزار میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ قاضی کمال الدین نے خواجہ سے نصوص الحکم کا درس دینے کی درخواست کی، فرمایا اس کے واسطے پڑھانے والے، پڑھنے والے یا شاہ وقت، تینوں میں سے ایک کو کو اپنی جان دینی پڑتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شیخ اکبرؒ کی کتابیں جو ہندوستان میں مثنوی رومیؒ اور تصانیف حضرت امام غزالیؒ کی طرح ہر کس و ناکس کے مطالعہ میں نہیں رہیں اس کی وجہ زیادہ تر علماء و مشائخ کی یہ پابندی ہی تھیں۔ انھوں نے شیخ اکبرؒ کے فلسفۂ وحدت الوجود کو عوام کی فہم سے بالاتر سمجھ کر، ان کو اس میں شریک نہیں کیا۔ خود وہ اپنے لئے وحدت الوجود پر اعتقاد کو ایمان کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔ لیکن عوام کے لئے اس کو سم قاتل۔

مسئلہ وحدت الوجود پر عوام سے گفتگو | ان تمام پابندیوں کے باوجود بعض مشائخ اور صوفیاء نے شیخ اکبرؒ کے نظریات اور مسئلہ وحدت الوجود پر عوام سے گفتگو کرنی شروع کر دی۔ سب سے پہلے ہندوستان میں جس بزرگ نے وحدت الوجود کو عام گفتگو کا مبحث بنایا وہ مسعود بک تھے۔ یہ فیروز تغلق کا زمانہ تھا۔ عوام کو اس گفتگو میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "انا الحق" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ سلطان فیروز تغلق نے فتوحات فیروز شاہی میں ایسے چند لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک شخص احمد بہاری کے متعلق لکھا ہے۔

"وطائفہ از بہار اورا خدامی گفتند"[1]

پھر گجرات کے ایک شخص کے متعلق لکھا ہے۔

"کلمۂ انا الحق می گفت"[2]

جاہل انسانوں سے ان ہی صداؤں کا اندیشہ تھا جس کی وجہ سے مشائخ اسلام نے مسئلہ وحدت وجود پر بحث کرنے کی ممانعت کی تھی۔ ان حالات میں اسلامی سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہو جانا لازمی امر

[1] فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۸ [2] ایضاً۔

اسلامی سوسائٹی کی اساس و بنیاد شریعت ہے۔

فیروز شاہ نے ان حالات میں شریعتِ اسلامیہ کی پاسبانی کا حق ادا کیا اور اس قسم کے لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔

پھر کچھ عرصے کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے بھی شیخ اکبرؒ کے نظریات پر برسرِ عام گفتگو کی۔ اپنے مکتوبات میں حالانکہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اس مسئلے کے لکھنے کا سبب مسلمانوں کی غفلت تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کا اثر عوام پر کچھ اچھا نہ پڑا۔ خود شیخ گنگوہی بڑے عظیم المرتبت بزرگ تھے انھوں نے سینکڑوں گمراہیوں کا سدباب کیا اور وحدت الوجود پر عوام میں گفتگو سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں اُن کا بھی ازالہ کیا۔ لیکن اُن کے بعد ایک عام مذہبی انتشار پیدا ہو گیا۔ شیخ اکبرؒ کی کتابیں مشائخ کے ہاتھ سے نکل عوام تک پہنچ گئیں۔ محمد غوثی نے دولت خاں لودی کے لڑکے کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ شیخ اکبرؒ کی ایک عبارت کا مفہوم سمجھنے کے لئے سید احمدؒ افغان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔[۱]

شیخ امان اللہ پانی پتیؒ دوسرے عظیم المرتبت بزرگ ہیں جنہوں نے شیخ اکبرؒ کے نظریات پر عوام سے گفتگو کی۔ انھوں نے اسرارِ حقیقت کو فاش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ گلزارِ ابرار کا مصنف لکھتا ہے ـــــ

"وحدت وجود کے بارہ میں آپ کی تحقیقات سے شیخ محی الدین بن عربیؒ کا زمانہ یاد آتا تھا۔ فصوص اور فتوحات وغیرہ کتبِ صوفیہ کی تمام مشکلات بآسانی بیان فرمایا کرتے تھے۔"[۲]

شیخ پانی پتی پر "مشربِ توحید" اس طرح غالب تھا کہ اُن کی صحبت میں پہنچ کر اُن کے نظریات سے متاثر نہ ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے والد ماجد شیخ سیف الدین صاحبؒ جب اُن کی خدمت میں پہنچے تھے تو

"عالم از دوست بد دوست و ہمہ اوست"[۳]

۱؎ گلزارِ ابرار۔ ص ۱۵۵ ۲؎ گلزارِ ابرار ۳؎ اخبار الاخیار

کے نعرے لگانے لگے تھے۔

پھر شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کی خانقاہ وحدت الوجود کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ اورنگ زیب نے اُن کے بعض رسائل (مثلاً کتاب تسویہ) کو عوام کے لئے مضر سمجھ کر ضائع کرا دیا تھا۔

اٹھارویں صدی میں حضرت شاہ نیاز احمدؒ صاحب بریلوی نے ساری فضا کو "ہمہ اوست" کے ترانوں سے معمور کرا دیا۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

؎ اگر کوئی جانے جہاں غیر حق ہے	سو میں اس کو دھو کا گماں دیکھتا ہوں
یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عین حق ہے	کہ ایک بحر ہستی رواں دیکھتا ہوں
؎ صورت گل میں کھل کھلا کے ہنسا	شکل بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہو کر کے اور پروانہ	آپ میں آپ کو جلا دیکھا
کر کے دعویٰ کہیں انا الحق کا	بر سر دار کھنچا دیکھا

چشتیہ سلسلہ کے اور بزرگ حاجی نجم الدین صاحبؒ شیخاواٹی نے بھی اسی انداز میں وحدت الوجود کے اسرار و رموز کو اپنی نظموں میں بیان کیا۔ راجپوتانہ میں شاید وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسرار حقیقت کو عوام کی زبان میں بیان کیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی چشتیہ سلسلہ کے ایک ایسے عظیم المرتبت بزرگ ہیں جن کو اس مسئلہ پر غضب کا عبور ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب نیازی نظامی دہلوی بڑے جید عالم اور مرتاض بزرگ ہیں۔ اُن کے استغنا میں متقدمین کی شان جھلکتی ہے۔ شیخ اکبرؒ کے نظریات اور مسئلہ وحدت الوجود پر ہر کس و ناکس سے گفتگو نہیں کرتے مجھے اس مسئلہ پر اُن سے کچھ سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، عرفی نے

فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا

ردعمل یعنی شیخ اکبرؒ کے نظریات کی مخالفت | ہندوستان سے باہر تو شیخ اکبرؒ کے نظریات کی مخالفت

بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، ہندوستان میں اس کی ابتدا حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوتی ہے۔ شیخ مجددؒ نے اعلان کیا ــــ "ہمیں فتوحات مکیہ کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں فتوحات مدنی درکار ہیں" (مکتوبات)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریات سے اُن کے معاصرین بے حد متاثر ہوئے۔ نقشبندیہ سلسلہ نے اُن کے بعد سے وحدت الشہود کو اپنا مسلک بنالیا اور وحدت الوجود کی تردید کو اپنے لئے لازمی سمجھنے لگے۔ شیخ مجددؒ کے بعد خواجہ محمد معصوم، خواجہ میر درد، مولوی غلام یحییٰ شاہ غلام علی صاحب، مولانا سید احمد شہید بریلویؒ وغیرہ نے شیخ اکبرؒ کے نظریات کی مخالفت نہایت شد و مد کے ساتھ کی

اعتدال پسند طبقہ | افراط و تفریط کے اس ہنگامہ میں کچھ مشاہیر ایسے بھی تھے جنہوں نے اس معاملہ میں اعتدال کی راہ پسند کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحب ایسے ہی بزرگوں میں تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے استاد شیخ عبدالوہاب متقی نے اُن کو ہدایت کی تھی کہ فصوص الحکم کے واضحات سے محظوظ ہونا چاہئے اور مبہمات سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس میں شکر بھی ہے اور زہر بھی۔ "مطلقاً از فوائداں محروم نشوند"

شیخ عبدالحق محدثؒ اسی مسلک پر تمام عمر قایم رہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ نہ فصوص الحکم کے اتباع و اعتقاد میں مبالغہ کرنا چاہئے اور نہ اس کے انکار ورد میں۔

شیخ محدثؒ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بالغ نظر عطا فرمائی تھی، ان متصادم نظریات میں تطابق کی کوشش کی۔ ان کی نظر میں شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ دونوں قابل تعظیم ہستیاں تھیں۔ فیصلہ الوحدت الوجود و شہود میں لکھتے ہیں کہ کل فرق صرف تشبیہ و استعارہ کا ہے ورنہ بنیادی طور پر شیخ اکبرؒ اور شیخ مجدد کا نظریہ ایک ہے۔

قرآنِ حکیم کے لفظی و معنوی حقوق

تلاوت، فہم، عمل

(جناب خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب اسحاقی رحمانی سہارنپوری)

حقیقی ترقی کا معیار | قرآنِ کریم انسان کے اندر جو عقل و دانائی پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کی قلبی ظلمت اور روحی کثافت کو دور کر کے جو روحانی سکون اور قلبی انبساط بخشنا چاہتا ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمِ کتاب و حکمت سے تمام عالم انسانی کو فلاح و ترقی کے جس مقامِ بلند کی دعوت دی ہے، حق یہ ہے کہ اب تک نسلِ انسانی کے تمام افراد و اقوام نے اس کے پایانِ کار کو نہیں پایا۔ اور بالخصوص ہم مسلمان اس کے اولین زینہ کو بھی طے نہیں کر پاتے اور ابتدائی سیڑھیوں سے بھی آگے نہیں بڑھے۔

دنیا بہت آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی دعویدار ہے اور اس کا رُخ ترقی کی طرف مائل ہے حالانکہ ہر قسم کا فوز و فلاح، ہر نوع کی کامیابی، اور تمام ترقییں قرآن و رسول والوں کے دم قدم سے وابستہ، اور کتاب و سنت کے سمجھنے والوں اور عمل کرنے والوں کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ الْآخَرِينَ۔ یعنی حق تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) پر ایمان لانے، اس پر عمل کرنے، اس کی تلاوت کرنے اور اس کو اخلاص کے ساتھ قبول کرنے کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو بلند مرتبہ بناتا اور اس کے خلاف کرنے والوں کو پست کر دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے پیغمبر ہادیِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

سے اس روشن حقیقت کو سن کر دنیا کے سامنے پیش کیا - اور دنیا نے ایک عرصہ دراز تک اس واقعی حقیقت کی جیتی شہادت دی اور آج تک تاریخ کے صفحات اور سیر و سوانح کے اوراق اس کے شاہد صدق موجود ہیں

اور اب بھی مادی و روحانی، دینی و دنیاوی، تمدنی و تعبدی، شخصی و انفرادی، قومی و اجتماعی ہر قسم کی ترقی و تنزل اور اقبال و ادبار کا یہی ایک معیار و اصول ہے اور آخر دنیا تک ہمیشہ اسی طرح رہیگا - اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ -

مسلمانوں کا قرآن پاک سے تعلق | یہ صحیح ہے کہ عام و خاص مسلمانوں کی ایک غیر کافی تعداد کو اتنی بات ضرور حاصل ہے کہ قرآن شریف کی مختلف سورتیں اور متعدد آیتیں، اس کی اکثر دعائیں اور بہت سے کلمات و الفاظ ہمارے مردوں، عورتوں، بچوں اور بڑوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور عام طور پر ہر وقت یا حسب موقع بولنے اور لکھنے پڑھنے میں بھی آتے ہیں اور اُن کے معانی و مطالب سے بھی کسی نہ کسی درجہ میں واقفیت ضرور رکھتے ہیں. نیز قرآن مجید کی تفسیریں اور ترجمے بھی پڑھنے، سننے، دیکھنے میں آتے اور مطالعہ میں رہتے ہیں اور درس و مواعظِ قرآنی میں بھی شریک ہوتے رہتے ہیں. اور اس فطری مناسبت، روحانی ذوق اور ایمانی تعلق کی بنا پر جو اسلام کی وجہ سے مسلمانوں کو حاصل ہے ہر مسلمان، مرد، عورت، بچہ، بوڑھا قرآن پاک سے بہت قریب ہے

عمل کے لئے قرآن فہمی کی ضرورت | لیکن جہاں تک قرآنِ عزیز کی تعلیمات اور اس کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے کا تعلق اور معاملہ ہے ہر ایک انسان خصوصاً ہر مسلمان اس امر کا مکلف اور ذمہ دار ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی زبان میں اس کے ترجمہ و معانی اور مضامین و مطالب سے وابستگی پیدا کرے اور قرآن مکرم کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے عربی زبان کی اتنی واقفیت اور لیاقت پیدا کرے جس سے سطحی اور معمولی طور پر اس کے ترجمہ و معانی سے اس کے احکام و تعلیمات کو جان سکے اور اس مفہوم و مراد پر اجمالی طور سے آگاہ ہو سکے جو اس کے متکلم کا مقصود و منشاء ہے -

تاکہ عمل کرنے میں سہولت اور آسانی ہو. تلاوت کرنے میں زیادہ جی لگے اور دھیان جمے

معاملات عبادات کا بھی پورا حق ادا ہو سکے اور اپنی زندگی کے ہر امر کو قرآن مقدس کی کسوٹی پر پرکھ کر اور قرآنی معیار پر جانچ کر نجاتِ ابدی کا مستحق بنے اور فلاح دارین سے بہرہ مند ہو۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا

قرآن پاک کی دعوت عمل | چونکہ علم کے ساتھ عمل (یعنی برائیوں سے بچنا، اور بھلائیوں کا کرنا) قرآن عظیم کے نزول کا اولین مقصد اور اہم مقصود ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (سورۃ التوبہ)

اس آیت کا سیاق و سباق، شانِ نزول اور مَورِد اگرچہ خاص ہے لیکن حکم ایسا عام ہے جو بواسطہ نبی و اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے ہر فرد کو شامل ہے۔ آیت پاک کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

اے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تم برابر عمل کئے جاؤ اور ہمیشہ عمل کرتے رہو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور مسلمان تمہارے کام اور عمل و کردار کو دیکھ لیں گے اور تم یقیناً جلد ہی اس ذات پاک کے حضور میں جو تمہارے باطنی حالات اور دل کی نیتوں پر اور ظاہری اعمال اور ہر قول و فعل اور کھلی چھپی چیزوں سے واقف ہے پیش کئے اور لوٹائے جاؤ گے پھر وہ تم کو تمہارے ہر ایک عمل اور ہر ایک بات کو جتا دیگا اور جو کچھ تم نے کیا اور کرتے تھے وہ سب تم کو بتا دیگا اور ہر ایک کے ساتھ اُس کی واقعی حالت اور اصلی کیفیت کے موافق جزا و سزا کا معاملہ کرے گا۔

دینِ یُسر | قرآن مبین سے علم و عمل دونوں چیزیں مقصود ہیں۔ عمل بغیر علم کے ناممکن ہے اور عمل میں آسانی اور سہولت، اس ملت ابراہیمی اور دین محمدی کا مایۂ ناز فخر و شرف اور اُمم سابقہ کے مقابلہ میں اس اُمت وسط کے لئے مخصوص امتیازی نشان۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (سورۃ البقرہ)

يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (سورۃ النساء)

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورہ البقرہ)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کو تمہارے واسطے آسانی منظور ہے۔ وہ دشواری اور سختی کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے لئے دین میں کوئی جبر و اکراہ اور زبردستی نہیں اور دین میں کوئی اذیت کی بات اور کوئی موجب ثقل و ضیق اور عسر و حرج امر نہیں۔

قرآن پاک کا مقصد | قرآن پاک سے علم و عمل دونوں چیزیں اولیں و بالذات مقصود ہیں۔ انسانی تخلیق اور اس کی پیدائش کا مقصد اور ما حصل حیات آفرینندۂ عالم نے اپنے اس نورانی و سرمدی کلام میں کھول کھول کر بغیر کسی گنجلک کے صاف صاف بیان فرما دیا ہے اور اپنے اس مقدس کلام اور اس کی روشن اور پاک آیتوں کو دینی و دنیاوی بہبود اور جسمانی و روحانی ہدایت کا سرچشمہ بنا کر انسان کو دے دیا ہے۔

اس حیات آفریں اور روح پرور لاہوتی نظم و کلام کے

(۱) الفاظ و عبارت اور آیات کی تلاوت و قراءت

(۲) اور اس کے معانی و مطالب کے فہم و تدبر

(۳) اور اس کی تعلیمات و احکام پر عمل پیرا ہونے کو

ان تین چیزوں کو :—

(۱) خالق و مخلوق کے درمیان تعلق و رابطہ پیدا کر کے اس کو قائم و استوار رکھنے اور

(۲) خالق و مخلوق کے حقوق پہچان کر ان کو صحیح طور پر ادا کر کے نجاتِ ابدی حاصل کرنے

(۳) اور اپنی عبادت اور اپنی رضا و توجہ اور قرب و مشاہدہ کا اعلیٰ ذریعہ اور

(۴) جسمانی و روحانی ہر نوع کی ترقی و فلاح کا قوی سبب ٹھہرایا ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۔ (سورۃ العنکبوت ۵)

قرآن پاک کی جامعیت و مرکزیت | قرآن صرف لفظوں کا یا صرف معانی کا نام نہیں ۔ بلکہ کلام الٰہی کے لفظ و معنے دونوں کا نام قرآن ہے ۔ اور قرآن کے لفظ و معنی دونوں منجانب اللہ ہیں ۔ الفاظ میں معانی پوشیدہ ہوتے ہیں اور معانی و مطالب کا فہم پر عمل موقوف ہوتا ہے اس لئے بہر صورت قرآن حکیم ہی انسان اور اس کی زندگی اور اس کی ہر حرکت و سکون اور فکر و عمل کا مرکز و محور قرار پایا ۔

قرآنِ مبارک کا دائرہ علم و عمل انسان کی زندگی اور اس کے ہر ہر شعبہ پر حاوی اور جملہ اصولِ تمدنی و تعبدی، تہذیب الاخلاق، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن پر جامع و مشتمل ہے ۔ حیات و موت اور اُن کے مابین اور ماقبل حیات و مابعد ممات کا کلی بیان اس میں مفصل موجود ہے ۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (سورہ انعام ۴) أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (سورہ انعام)

یہی وجہ ہے کہ

قرآن مجید کا حاصل کرنا، سیکھنا، سکھلانا اور پڑھنا ۔ پڑھانا ہر مسلمان پر فرض ہے[۱] اور اس کی ایک سورت (سورۃ فاتحہ ۔ الحمد شریف) کا حفظ اور بر زبان یاد کرنا ہر مسلمان کے ذمہ واجب ہے[۲] الحمد شریف روایت حدیث کے مطابق ۔ ام القرآن ۔ فاتحۃ الکتاب اور اساس القرآن ہے ۔ گویا قرآن مجید کی تمام تفصیلات کے لئے بمنزلہ وصف عنوانی یا عنوان اجمالی اور موضوع و دیباچہ کے ہے[۳] ۔ اور اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت جو قرآن پاک کی اور کسی سورت یا آیت کی نہیں ہے ۔ یہ ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھا جانا ضروری ہے[۴] ۔

اور الحمد شریف کے ساتھ قرآن پاک کی کسی دوسری ایک سورۃ کا حفظ اور بر زبان یاد کرنا ہر مسلمان کے ذمہ واجب ہے[۵] ۔ گویا بالفاظ دیگر قرآن شریف کا اتنا حصہ بر زبان اور حفظ یاد رکھنا جس سے نماز ادا ہو جائے ہر فرد مسلم و مسلمہ کے ذمہ فرض عین ہے، اور جتنی مقدار سے

---

[۱] صحاح ستہ ۔ [۲] مظاہر حق ج ۲ ص ۱۹۵ [۳] در منثور ج ۱ ص ۳ [۴] احکام القرآن جصاص حنفی ج ۱ ص ۲۵

[۵] مظاہر حق ج ۲ ص ۱۹۵

پڑھنے سے قرآن شریف کی قرأت کا واجب درجہ ادا ہوجائے ہر مسلمان کے ذمہ واجب علی العین ہے۔ اور مجموعی امت پر حفاظت وصیانت کی غرض سے تمام وکمال قرآن شریف حفظ یاد کرنا اور زبانی یاد رکھنا فرض علی الکفایہ ہے۔

تمام دنیا میں ہر مقام پر ہر دور اور ہر زمانہ کے مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اتنی کثیر تعداد قرآن مجید کے حافظوں اور اپنے دل ودماغ میں اس پاک کلام کو محفوظ رکھنے والوں کی اپنے اندر موجود رکھیں جس سے دنیا کے سامنے قرآن پاک کے متواتر منقول ہونے کا ثبوت بہم پہنچے۔

غرضکہ قرآن عزیز کو اپنے دل ودماغ میں جگہ دینے اور اس کے حفظ یاد کرنے اور اس کی قراءت کے تین درجے ہیں ایک فرض عینی دوسرے واجب عینی تیسرے فرض کفائی۔ فرض عینی وواجب عینی ہر مسلمان مرد عورت اور ہر متبع اسلام پر اور فرض کفائی مجموع امت کے ذمہ لازم متحتم ہے

اور یہ تینوں درجے صرف الفاظِ قرآنی اور نظم وعبارت کلام اللہ کے ہیں یعنی جہاں تک قرآن پاک کے الفاظ اور نظم ومتن کا تعلق ہے۔ پیروانِ اسلام کے ذمہ ان تینوں درجوں کا حصول وتحفظ حاملین قرآن ہونے کی حیثیت سے ضروری اور لازم ہے چاہے ان کے معانی ومطالب سمجھیں یا نہ سمجھیں اور خواہ ان کے مفہوم ومراد کو سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ پھر سورۂ فاتحہ سے زیادہ قرآن مجید کا یاد کرنا بوجہ فرض کفایہ ہونے کے نماز نفل جیسی عبادت سے افضل ہے[1]۔

اور اس کلامِ الٰہی کی قراءت اور اس کی پاک سورتوں اور آیتوں کی تلاوت، تسبیح وتحمید تکبیر وتہلیل اور تمام اوراد ووظائف اور تمام ریاضتوں اور چلوں اور سب دعاؤں سے افضل ہے[2]۔ اور نماز فرض جیسی افضل العبادات اور اکمل الطاعات شے کے بعد حق تعالیٰ کی نزدیکی وخوشنودی کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے فرمایا۔ اور شاہ صاحبؒ کا یہ قول مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر اور احادیث نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے مقتبس و مستنبط ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے تین درجے ہیں۔ کمتر درجہ یہ ہے کہ دس آیتیں تلاوت کریں

---

[1] مظاہر حق ج ۲ ص ۱۹۵ [2] مظاہر حق ج ۲ ص ۲۰۹

متوسط درجہ میں سو آیتیں اور سو آیات سے زیادہ تلاوت کرنا اعلیٰ درجہ میں داخل ہے[1] اور تلاوت کا طریقہ جو سید الاولیاء حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عالم رؤیا میں حضرت شاہ صاحبؒ کو تعلیم فرمایا ہے یہ ہے کہ مبتدی قرآن شریف کی اس طرح تلاوت کرے کہ اپنے آپ کو پڑھنے والا اور اللہ پاک کو سننے والا تصور کرے گویا پڑھنے والا اللہ پاک کے سامنے حاضر ہے۔ جیسے شاگرد استاد کے سامنے پڑھا کرتا ہے۔

اور منتہی یہ خیال رکھے کہ اگرچہ وہ خود پڑھ رہا ہے مگر اللہ پاک کو متکلم اور پڑھنے والا سمجھے اس طرح کہ حق تعالےٰ اپنا کلام مری زبان سے جاری فرما رہا ہے۔ اور اپنے آپ کو سننے والا قرار دے یعنی حق تعالےٰ مری زبان سے کلام فرما رہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔

عوارف میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا کہ میں قرآن پاک کی آیات اس طرح تلاوت کرتا ہوں گویا اس کے متکلم و قائل سے سن رہا ہوں

نماز سے باہر اور نماز کے علاوہ قرآن شریف پڑھنے پر ایک حرف کے بدلہ میں دس۔ اور نماز کے اندر تلاوت میں ہر حرف کے صلہ میں پچیس نیکیوں کا اجر و ثواب ہے اور حسن نیت و خلوص کے مراتب کے لحاظ سے یہ اجر و ثواب اس حد تک متضاعف ہوتا ہے جس کی کوئی انتہا مقرر نہیں[2]

قرآن مجید حفظاً اور بہ زبان پڑھنے کا اجر و ثواب ایک ہزار درجہ تک اور دیکھ کر پڑھنے کا دو ہزار درجہ تک زیادہ کیا جاتا ہے[3]

قرآن شریف دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت حفظ پڑھنے پر ایسی ہے جیسی فرض کی نفل پر۔[4] دیکھ کر پڑھنے میں حضور قلب اور جمعیت خاطر زیادہ ہوتی ہے۔ تدبر و تفکر خوب ہوتا ہے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہاتھوں میں لیا جاتا اور اٹھایا جاتا ہے۔ سر اور پیشانی سے لگایا جاتا ہے چہرہ و لب اور سینہ و بدن سے مس کیا جاتا اور چھوا جاتا ہے۔ غرضکہ دیکھ کر پڑھنے میں کئی عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں۔

---

[1] شفاء العلیل صد ۱۳ ۔ [2] مشکوٰۃ صد ۱۸۱ ۔ [3] صفۃ الصفوۃ ج ۲ صد ۱۸ [4] اشعۃ اللمعات صد ۱۱ ج ۲

بہت سے صحابہ اور تابعین اور علمائے اُمت قرآن شریف دیکھ کر پڑھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس کثرتِ تلاوت کی وجہ سے دو قرآن شریف پھٹے تھے۔ حضرت عروۃ بن الزبیرؓ روزانہ ربع قرآن شریف دیکھ کر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عکرمہؓ قرآن شریف کو اپنے چہرہ سے لگایا کرتے اور کہا کرتے کتاب ربی، کتاب ربی،

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ اگر حفظ پڑھنے میں حضور قلب، جمعیت خاطر اور تدبر و تفکر زیادہ ہو تو حفظ پڑھنا اور اگر دیکھ کر پڑھنے میں ہو تو دیکھ کر پڑھنا اور اگر دونوں میں زیادہ ہو تو دیکھکر پڑھنا افضل ہے۔ ؎

بہرحال قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے سے لسانی عبادت کے ساتھ قلب و جوارح کی عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں اور قلب و لسان و جوارح کی عبادات کامل طور پر ادا ہوتی ہیں ـــ اور خلوص و حضور، خشوع و خضوع، تذلل و رقت قلب کے جملہ اسباب یکجا بہم ہو جاتے ہیں۔

لحن عرب اور صوت عربی اور قرآن پاک کی صحیح کیفیت ادا | قرآن مجید عربی زبان میں ہے اور عربیت اپنی خصائص لسانی کے ساتھ قرآن پاک کے لوازم میں سے ہے۔

بلسان عربی مبین (سورہ شعراء پ۱۹) وھذا کتاب مصدق لسانا عربیا

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قرآنا عربیا (سورہ یوسف پ۱۲)

انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون (سورۃ الزخرف پ۲۵)

اور ظاہر ہے کہ ہر زبان کی صحت اس کے حروف و مفردات اور کلمات و الفاظ کی صحت کے ساتھ ادائیگی۔ اس زبان کے خاص لہجہ (آواز) ۔ اور اس کے مخصوص طرز ادا اور طریق تکلم پر موقوف ہوتی ہے۔

اس لئے قرآن پاک کا صحیح تلفظ، اور صحیح کیفیتِ ادا کے ساتھ پڑھنا اور تلاوت و قرأت میں صحت و نطق کا اہتمام ہر مسلمان کے ذمہ بلکہ عرب جو اہل لسان ہیں ان سے زیادہ ہم اہل عجم

؎ اشعۃ اللمعات ج ۲ ص۱۸۱

(غیر اہل لسان) کے ذمہ لازم اور ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک الفاظ صحیح نہ پڑھے جائیں جس سے کلام غیر عربی سے نکل کر عربی نہ سمجھا جائے اس وقت تک قراءت کا فرض درجہ ادا نہیں ہو سکتا

حدیث قولی میں اسی لحنِ عرب اور صوتِ عربی کے ساتھ جس سے بلاتکلف عرب کی زبان، عرب کا لہجہ اور آواز اور عرب کا طرزِ ادا معلوم ہو پڑھنے کا حکم ہے۔ اقرءوا القرآن بلحون العرب واصواتھا ؎

عرب کی صوت طبعی کی مشق و تمرین اور اپنی طبع کی اعانت سے اس کی تزیین و تحسین میں کوشاں رہنا ضروری ہے پھر اس صحیح طرز و کیفیتِ ادا کے ساتھ تغنی و ترنم یعنی تحسین صوت اور خوش گلوئی و خوش آوازی بھی شریعت کا مامور بہ اور عین مطلوب ہے اگرچہ قرآن پاک کی تلاوت و قراءت پر بغیر تحسین صوت اور تغنی و ترنم کے بھی ثواب ملتا ہے۔ بلکہ جس پڑھنے والے کو زبان کی دشواری کی وجہ سے گرانی ہو لیکن وہ اس کی صحت کے حصول میں کوشاں رہے اس کے لئے دوا جر اور دوہرا ثواب ہے اور چونکہ تلاوت قرآن شریف سے مقصود حضور و خشوع، رقتِ قلب اور خشیتِ الٰہی کا پیدا کرنا ہے اور حسن صوت اور خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا اس مقصود کے حصول کے لئے زیادہ ممد و معاون ہے اس لئے اگر آواز اچھی نہ ہو تو اپنی حسب مقدرت آواز کو اچھا بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور آواز کو خوب بنا سنوار کر پڑھنا چاہئے ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ خود صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) مری قراءت سن رہے تھے تو آپ سے عرض کیا کہ اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ آپ میرا پڑھنا سن رہے ہیں تو میں اپنی آواز کو خوب اچھی طرح بنا کر پڑھتا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا بلکہ سکوت فرمایا یہ تقریری حدیث کہلاتی ہے۔ اور اس سے بھی آواز کو اچھی طرح بنا کر پڑھنے کا ثبوت حاصل ہوا اور حدیث قولی میں تو صاف ارشاد ہے کہ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ۔

؎ زینوا القرآن باصواتکم یا زینوا اصواتکم بالقرآن۔ آواز کا حسن قرآن کی زینت اور قرآن کی زینت آواز کا حسن مآل دونوں حدیثوں کا ایک ہی ہے۔

یعنی وہ ہمارے طریق پر نہیں ہے جو قرآن کو خوب اچھی آواز سے نہ پڑھے اور آواز کو نہ بنائے اور سنوارے
قرآن پاک کی تلاوت و قراءت جیسا کہ علامہ ابن الصلاحؒ نے لکھا ہے ایک ایسا خصیصہ ہے جو صرف نوعِ انسانی کو موہبت ہوا ہے۔ ملائکہ کو یہ کرامت نہیں بخشی گئی۔ فرشتے انسانوں سے قرآن پاک سننے کے شائق و منتظر رہتے ہیں۔ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا۔ نماز فجر میں ملائکہ کا شہود و حضور اہل ایمان سے قرآن پاک سننے کے شوق میں ہوتا ہے علامہ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ تمام قرآن پاک میں سورۂ فاتحہ ایک ایسی سورت ہے جس کے پڑھنے کی ملائکہ کو اجازت ہے تاہم تمام قرآن پاک کی تلاوت و قرارت کی خصوصیت انسانوں ہی کے ساتھ ہے اور یہ نعمت اہل ایمان ہی کے ساتھ مختص ہے۔

علامہ طیبی شارح مشکوٰۃ نے لکھا ہے کہ قرآن شریف پڑھنے میں آواز کو تغنی و ترنم اور سرود کے ساتھ خوبصورت بنانا اور نغمہ والحان کے ساتھ زینت دیکر پڑھنا جس صورت سے بھی ہو بہر طریق جائز و درست ہے تاوقتیکہ قرآن شریف عربیت کی حدود سے باہر نہ نکلے۔ اور عربی قراءت کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ اور موضوع کلام متغیر نہ ہو۔

قرآن عظیم کے معانی سے وابستگی کی اہمیت و ضرورت | قرآن شریف عربی میں ہے۔ اور اس کے معانی و مطالب کا جاننا عربی جاننے پر اور عربی زبان کا جاننا اس کی لغت اور قواعد زبان کے علم پر موقوف ہے۔ اس لئے کلام الٰہی نیز احادیث نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے جاننے کے لئے عربی زبان اور لغت و قواعد کا جاننا ضروری اور اہم واجبات سے ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی زبان کے جاننے، سیکھنے اور حاصل کرنے میں عقل و قیاس اور رائے کو کچھ دخل نہیں ہو سکتا کیونکہ زبان جو الفاظ و کلمات اور کلام و محاورات وغیرہ کا مجموعہ ہوتی ہے وہ اہل لسان کے مصطلحہ و موضوعہ ہوتے ہیں ان میں کسی کو اپنی رائے کے کچھ دخل دینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل زبان سے جس طرح نقل و سماع ثابت ہو وہی طریق مستند و مقبول ہوتا ہے اور وہی معنے و مطلب اور مفہوم و مراد اس کلام کی متعین ہوتی ہے جو اہل لسان کے نزدیک معتبر

اوران کے عرف میں متبادر الی الفہم ہو۔

اس بناء پر قرآن کریم نیز روایات و حدیث کے وہی معنی جو اپنی عربیت اور زبان عربی کے لحاظ سے متبادر الی الفہم اور اہل زبان کے نزدیک معروف و مسلم ہیں اور نزولِ قرآن کے وقت عہد نبوت میں سمجھے جاتے تھے یا شارع علیہ السلام نے جس طرح بیان کیے ہیں مراد لئے جائینگے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (سورہ ابراہیم ۱۳)

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (سورۃ النحل ۱۴)

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمْ (ایضاً)

قرآن پاک کے الفاظ و معانی کا تواتر و توارث | قرآن پاک کے الفاظ و معانی ہمارے اس زمانہ میں اس کے قبل کے لوگوں سے اور ان کو ان کے پہلے زمانہ کے لوگوں سے علی ہذا سلسلہ بہ سلسلہ و واسطہ بواسطہ تبع تابعین اور ان کو تابعین اور ان کو صحابہ اور صحابہ کو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بواسطۂ جبریل امین حضرت حق جل مجدہ سے جو اس کلام کے متکلم ازلی و قدیم ہیں پہنچے ہیں۔ وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ۔ (سورۃ النمل ۱۹)

قرآن پاک کی تفسیر کے بارے میں جمع الفوائد میں مسند ابو یعلی موصلی اور مسند ابوبکر بزار سے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث تخریج کی گئی ہے۔ اور دیر جل لم یسم) سے اس حدیث کے مبہم ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ اِن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یفسر شیئاً من القرآن برأیہ الا آیا بعد علمھن ایاہ جبریل :۔

جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان میں مسند بزار سے حضرت عائشہ کی اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ عن عائشۃؓ قالت ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفسر شیئاً من القرآن الا آیا بعد علمہ ایاھن جبریل :۔

سیوطیؒ نے یہ حدیث نقل کر کے لکھا ہے کہ ابن کثیرؒ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے اور ابن جریر وغیرہ علماء نے اس کو ماؤل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے ان مشکل آیات کی طرف

اشارہ ہے جن کا مطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح نہیں ہو سکا اور آپ نے اللہ پاک سے ان کے علم و وضاحت کے بارے میں سوال کیا اور حق تعالےٰ نے بواسطہ جبریلؑ آپ کو ان کے معانی کی خبر دی اور آپ کا اشکال وابہام دور فرما دیا تاہم حدیث مذکور کے مبہم یا منکر ہونے کی صورت میں ۔ثم ان علینا بیانہ ۔ اور لتبین للناس ما نزل الیھم اور ان مفاہیم کی دوسری آیات اس امر کی مصدق و موئد ہیں۔ اور اصول کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قرآنی نظم و کلام کے لئے بیان و تفسیر رسول ضرور ہونا چاہئے ۔ خواہ فعلاً اور قولاً ہو یا حالاً اور تقریراً و سکوتاً۔

لیکن حدیث مذکور کے ماوّل ہونے کی صورت میں معاملہ بالکل بے غبار اور واضح ہے اور قرآن آیات کی تصدیق و تائید حدیث کی صحت و نادیل و قوت استدلال کے لئے مرجح

اسی کی مزید تائید و توثیق سیوطیؒ کے اس کلام سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے اتقان میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے تخریج کی ہے ،

عن عمرؓ انہ قال من اخر ما نزل آیۃ الربا وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض قبل ان یفسرھا ۔ یعنی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ معاملات کے بارے میں سب سے آخر آیت ربوا نازل ہوئی ۔ ربوا کی توضیح و تفسیر کیا ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں معلوم نہ ہوسکی کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد اس کی تفسیر اور ربا کے متعلق کافی شافی بیان سے قبل ہی آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت و سورت جو آپ پر نازل ہوتی تھی اس کی تفسیر صحابہ کو بتلاتے اور سمجھا دیتے تھے ایک صرف یہ آیت ربا باقی رہ گئی جس کے نازل ہونے کے بعد جلد انتقال ہونے کی وجہ سے آپ بیان نہ فرما سکے

اگر حضرت عمرؓ کی اس روایت کے یہ معنی ، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی ہر آیت کی تفسیر بیان فرما دیتے تھے مراد نہ لئے جائیں جو کہ فحوائے کلام سے سمجھے جاتے اور بالکل صحیح ہیں اور ہمارے مدعا کی تصدیق کے لئے شاہد ہیں تو محض اس آیت ربا کی تخصیص (کہ اس کی تفسیر بیان کرنے سے قبل وفات پا گئے) کوئی معنے نہیں رکھتی ۔ لامحالہ کوئی نہ کوئی وجہ اس کی مخصص

ہو گی اور وہ وہی ہے جو ہم نے ما قبل میں ذکر کی۔

سیوطیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ اور دوسرے علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قرآن شریف یا اس کے اکثر اور غالب حصہ کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

علم وعمل کا حصول اور قرآن پاک کا ترجمہ، تفسیر، مطلب اور مفہوم | قرآن پاک کی سورتوں اور آیتوں کے
سیکھنے اور یاد کرنے کے بعد ان کے معنی مطلب اور مفہوم و مقصد کا جاننا اور سمجھنا از حد ضروری ہے
اگرچہ بتصریح حدیث قولی قرآن مجید کے پڑھنے میں صرف الفاظ پر بھی خواہ ان کے معانی سمجھے یا نہ
سمجھے مسلمانوں کو رب معبود کی طرف سے ہر حرف کے بدلہ میں کم از کم دس گنا ثواب واجر اور انعام
وصلہ عطا فرمایا جاتا ہے اور بیشتر کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ اور محض لفظوں کی تلاوت پر فلاح وخیر اور
برکت ورحمت وسکینت کا نزول ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خدا کی نازل کردہ رحمت و
برکت اور سکینت وطمانینت کو ہم محسوس نہیں کرتے اور ہم اس فلاح وخیر کی حلاوت نہیں پاتے بلکہ
کیونکہ ہمیں اتنی حس اور اتنا احساس وشعور ہی باقی نہیں رہا کہ اس کی حلاوت پائیں اور لذت
محسوس کریں اور اس نورانی کلام کی نورانیت سے اپنے ظاہر وباطن کو جلا دیں اور روشن کریں۔
تاہم قرآن پاک کی آیات سیکھنے کے بعد اس کے معانی کا سیکھنا۔ الحمد شریف اور اس کے
علاوہ کسی دوسری سورت کے حفظ یاد کرنے کے بعد ان کے مفہوم ومعنی کا جاننا واجب ہے تاکہ کم از
کم نماز اور عبادت میں دل لگنے اور حضور قلب کی لذت حاصل ہونے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی نمازوں کی پوری پیروی کر سکیں اور جملہ قرآنی احکام پر سمجھ بوجھ کر شوق ورغبت کے ساتھ
با آسانی عمل کر سکیں۔ اور عقاید واخلاق، عبادات ومعاملات اور حیات وموت کا ہر امر قرآن حکیم کے
حکموں اور حکمتوں کے مطابق انجام دے سکیں۔

عمل کے لئے علم وفہم کی ضرورت | اس کتاب الٰہی پر عمل پیرا ہونے اور اس سے موعظت گیری اور نصیحت پذیری
کے لئے عربی زبان کی معمولی قابلیت اور ایسی لیاقت پیدا کرنا ضروری ہے جو کہ سطحی طور پر فہم قرآن اور تدبر
قرآنی کے لئے ناگزیر ہے اور جس سے قرآن پاک کی اجمالی مراد سمجھی جا سکتی ہے۔

مفہوم قرآن کی کنہ رسی اور حقیقت شناسی | باقی رہا قرآن عظیم کی فصاحت و بلاغت، اس کی عربیت اور اس کے اعجاز و تاثیر کے سمجھنے، نیز اس کلام پاک سے احکام و مسائل اور حقائق و بصائر کے استنباط و استخراج کا معاملہ۔ اس میں ہائفہ ڈالنا سطحی معلومات اور عربی کی معمولی شدبد رکھنے والے کا کام نہیں۔ اور نہ عربی زبان کے علاوہ جرمنی، لاطینی یا انگریزی و ہندی زبان کے ماہرین و محققین کا کام ہے کہ وہ قرآن عزیز کے مفہوم و مراد اور اس کے مدلول و منطوق پر عربی کلام کو سمجھنے کی صلاحیت رکھے بغیر اور عربی ادب و بلاغت اور عرب کی لسانیات و محاضرات وغیرہ میں مہارت حاصل کئے بغیر اس پر کوئی کلام کریں اور اس سے استنباط مسائل و استخراج احکام کی جراءت کریں اور محض ترجموں یا دوسری کتابوں کی مدد سے اگرچہ وہ کتابیں کیسی ہی کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہوں قرآنی آیات کی تشریح و توضیح اور مراد الٰہی کی تفسیر بیان کرنے لگیں۔

قرآن پاک پر عمل و فکر کی دو راہیں | چونکہ فہم قرآنی کی دو صورتیں ہوتیں۔

ایک سطحی و معمولی جو سرسری طریق پر ہوتی ہے اور قرآنی احکام و تعلیمات پر عامل بننے اور عمل پیرا ہونے کے لئے اس قدر مقدار کا جاننا ضروری ہے۔ فانما یسرناہ بلسانك لعلهم يتذكرون (الدخان ع ۲۴)

دوسری واقعی اور تحقیقی جو نظر غائر اور مہارت و کمال کی طالب ہے اور استنباط مسائل و حقائق کے لئے ضروری ہے اور جس کا آیت لعلمه الذين يستنبطونه منهم " میں ذکر ہے،

اس لئے اس حقیقی اور تحقیقی فہم قرآن اور تدبر فی القرآن کے لئے یہ صورت ناگزیر ہے کہ قرآن کو قرآن کی زبان میں سمجھنے کی صحیح استعداد و قابلیت، عربی کا کامل مذاق، اور عربیت میں پوری مہارت و ذوق پیدا کریں۔ اس کے تمام مبادی و ضروریات و اسباب اور متعلقہ علوم کو پورے طور پر سیکھیں۔

قرآن پاک میں صحیح تدبر کا آسان معیار | اور اس کے بعد ذرا ایک یہ تجربہ کر دیکھیں کہ آیا ہم قرآن پاک کے علاوہ عربی کے کسی نثر یا نظمیہ کلام کو لے کر اس کو اسی عربی اسلوب بیان اور عربیت کے مخصوص انداز تقریر

(تحریر پر لکھ پڑھ سکنے اور بولنے سمجھنے پر بھی قادر ہیں یا نہیں۔

اگر ایسی قدرت (مہارت حاصل نہیں ہوئی تو اپنے آپ کو معذور سمجھیں اور قرآن عظیم کو اپنی مشق بحث ونظر کے لئے بازیچہ اطفال اور ہدف مذاق نہ بنائیں۔ اور اس میں وہ مجتہدانہ غور وخوض اور محققانہ بحث ومذاکرہ ترک کردیں جو کسی زبان کے باکمال اور ماہرین کے لئے موزوں اور لائق حال ہوتا ہے۔ اور "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا" (النساء ۵) کے حکم کے مطابق قرآن کی امانت کو اس کے اہل سے طلب کریں اور "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون" کے ارشاد کے بموجب"

سلف صالحین اور سابقین اولین کا نمونۂ فکر وعمل

اس سلسلہ میں ان ماہرین اور علمائے راسخین کی تحقیقات ومعلومات اور ان کے افادات واستنباطات کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں جنہوں نے اس کتاب مبین کے نور حقیقت کو اپنی چشم بصیرت کا کحل الجواہر بنانے کے لئے عقلِ سلیم، علمِ صحیح، عمل صالح اور فراست ایمانی لیے ہوئے دنوں کو راتوں سے ملا دیا اور فہم وتدبر قرآنی کے صعب سے صعب منازل طے کرکے ہمارے لئے اس کے دقائق وحقائق، عجائب وغرائب، لطائف ونکات، اسرار وحکم، رموز ومعارف، اور معانی ومفاہیم کی دشوار گذار راہیں مفتوح کردیں۔ اور پھر ہمیں اس کا منزل آشنا اور اس کی طرف جادہ پیما ہونے کی دعوت دی اور باوجود شبانہ روز کی اپنی ان لطیف کاوشوں اور پر مغز دقیقہ سنجیوں کے ہمیشہ اعتراف کرتے رہے کہ۔

عقل جزئی کے تواند گشت بر قرآں محیط
عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار

ان ماہرین قرآن اور واقفین علوم قرآن انسانوں میں جو درحقیقت قرآن ہی کے الفاظ میں آیاتِ قرآنی کے اولین مصادیق اور راسخین فی العلم میں سب سے پہلے وہ اہل بصیرت ونظر اور ارباب عمل وتقوے افراد ہیں جن کو قرآن مقدس نے اپنے لفظوں میں مہاجرین وانصار کے معزز ومحترم لقب سے یاد کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

اَبان کا ماحول اور شاعری

(از جناب ڈاکٹر منور رشید احمد صاحب فاروقی ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی علیگ)

یہ دوسری صدی ہجری کا ایک غیر مشہور شاعر ہے بہت سے لوگ تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں بہت کم ایسے ہیں جو اس کی شاعری سے واقف ہوں گے، اس کی وجہ اس کی اپنی کم مائیگی نہیں ہے بلکہ کچھ تو عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں تحقیق واکتشاف کے شوق کی کمی اس کا باعث ہے اور کچھ خود شاعر اور اس کی شاعری کا پردۂ خفا میں ہونا اس کا کسی قدر ذکر ادب کے اس گنجینہ میں ملتا ہے جس کا نام اغانی ہے چند لفظ اس کی بابت ابن الندیم (متوفی ۳۸۵ھ) کی فہرست اور خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تاریخ بغداد اور جاحظ (متوفی ۲۵۶ھ) کی کتاب الحیوان میں موجود ہیں لیکن یہ اتنے ناکافی ہیں کہ ان سے شاعر کی شاعری اور اس کی شخصیت کا کوئی واضح تصور قائم کرنا مشکل ہے اس مشکل کو ابوبکر صولی (متوفی ۳۳۵ھ) کی کتاب الاوراق نے بڑی حد تک دور کر دیا ہے، یہ کتاب آج سے چودہ سال پہلے اپنی تصنیف کے تقریباً ہزار سال بعد پہلی بار انگلستان کے ایک علم دوست انگریز نے پروفیسر گب کی ترغیب سے مصر میں چھاپی اور اس سے اَبان اور اَبان کی شاعری اس کے ماحول اور افتادِ طبع پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، اس کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں جو دقتیں تھیں دور ہوگئی ہیں اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو اغانی، تاریخ بغداد اور کتاب الحیوان میں اس شاعر کے بارے میں درج ہے اس کے علاوہ متعدد نئے معلومات اور کلام کے بہت سے نمونے ایسے ہیں جو کسی دوسری مطبوعہ کتاب میں نہیں ملتے۔

اَبان ایک قابل قدر شاعر ہے جو ادب اور تاریخ شعر میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس کی

شاعری شاہراہ ادب پر نشان میں کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن یہ اہمیت اور حیثیت اس کی شاعری کی تفصیلات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ ادب میں جلوہ نہ دکھا سکی ہم یہاں اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

ابان بصرہ کا باشندہ تھا، پہلی اور دوسری صدی ہجری میں بصرہ اور کوفہ علوم کے مرکز تھے اس کے اجداد یہودی تھے اور صوبہ فارس کے شہر فسا میں رہتے تھے اس کا دادا لاحق بصرہ کا ایک محدث تھا۔ ہمیں اس کے خاندان کے زیادہ حالات نہیں معلوم اور شاید اس کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کو جاننے کی زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے البتہ اس کا ماحول ہم کو معلوم ہے جس سے اس کی ذہنیت مناہج فکر اور نفسیاتی رجحانات کی تعمیر ہوئی ہوگی اور جن کا پرتو اس کی شاعری میں موجود ہے۔

یہ دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوا پلا بڑھا اور غالباً مرا بھی۔ اس کی پیدائش و وفات کی تاریخیں نہیں معلوم، اس کو برمکی وزیروں یحییٰ، فضل اور جعفر کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا وہ اس کے مربی تھے اور اس کی شاعری ان کی سرپرستی کے چقماق پر چمکی تھی۔

یہ شاہی استبداد کا زمانہ تھا جس کی گود میں ایک غیر متوازی نظام اجتماعی اور اقتصادی پل بڑھ رہے تھے۔ حکومت کی دولت ہر طرف سے سمٹ کر محلوں میں آ جمع ہوتی یا ممتاز خاندان بنو ہاشم و بنو امیہ وغیرہ میں بٹ جاتی اور پھر نفس پرستی کے کام آتی۔ اس نفس پرستی کی بہت سی شکلیں تھیں یہ نفس پرستی نقاب پوش تھی اس کا ظاہر شگفتہ اور صالح تھا اس کے نیچے شیطان کے جلوے تھے اس کو خدا اور رسول کی طرف سے جائز قرار دیا جاتا تھا حالانکہ خدا اور رسول اس سے بری تھے اس کی تفصیلات سے تاریخ و ادب کی کتابیں پر ہیں، بہترین کنیزیں، بہترین بہترین مکان، بہترین کھانے، بہترین لباس اور بہترین اقتدار و رسوخ، رقص و سرود، رند و مستی اور ان کے لئے اندھا دھند جد و جہد خوف خدا اور راستبازی سے بالکل بے نیاز۔ اس نفس پرستی کے سب سے بہترین خدوخال تھے خلفاء اور ان کے قریبی رشتہ داروں کے محل

[ج]ہاں دولت اُمنڈتی تھی اس نفس پرستی سے بھرپور تھے جہاں دولت کا دریا اتنی طغیانی سے نہ [ب]ہتا وہاں اس کو مکمل بنانے کی سرگرمیاں تھیں جو لوگ دولت سے محروم یا محرومم ہونے کی برابر [ت]ھے اور اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ تھے وہ مایوس ہو کر یا تو زہد و قناعت کا مصنوعی لبادہ پہن کر ان کا [پ]چار اور دولت و امارت کی مذمت اپنا شعار بنا لیتے اور ایسے بہت کم تھے، یا نفس پرستی کا سودا [س]ر میں بھر کر جرائم کرنے لگتے یا اپنی قابلیتوں کو بیچنے لگتے اور امیروں کی مدح سرائی کو اپنا پیشہ بنا لیتے اور ان کے انعام و اکرام سے نفس پرستی کے محبوب کو حاصل کرتے۔

یہ زمانہ شاہی استبداد اور اقتصادی عدم توازن کے ساتھ ساتھ جنسی عدمِ توازن کا بھی [تھ]ا، جب جنسی خواہشات اور ان کے حصول کے ذریعے بالکل بے قید تھے، کیونکہ جس کے پاس [رو]پیہ ہوتا جنسی خواہش کے ہر جذبہ کو ہر حد تک پورا کر سکتا تھا، خوبصورت کنیزیں ہر جگہ دستیاب [ت]ھیں ایسے ادارے ہر بڑے شہر میں تھے جہاں ان کو ادب، شوخی و شنگی اور گانے کی تعلیم دے کر [ب]یچا جاتا تھا، ایسے ادارے بھی تھے سرمایہ دار کنیزوں کے رقص و سرود اور جسموں کی تجارت [ک]رتے تھے؛ جہاں شعراء، رند مزاج، رنگیلے اور گانے کے عاشق خاص طور پر آتے جاتے تھے یہی نہیں [خو]بصورت امرد غلاموں سے عشق و محبت اور غیر فطری حظ کوشی بھی ہوتی تھی اور بہت سے بڑے [گھ]روں میں کنیزوں کے ساتھ ساتھ ان کے طائفے بھی آباد تھے۔ یہ زمانہ شراب، رقص اور گانے بجانے [س]ے بڑھی ہوئی دلچسپی کا زمانہ تھا جب ہارون الرشید جیسے نماز گذار خلیفہ نے سازندوں کا پورا ایک [سل]سلہ قائم کیا تھا اور لاکھوں درہم ان پر صرف ہوتے تھے۔[۱۵] نفس پرستی کا بھاری بوجھ انھیں دبا [ک]ر ساکت کر دیتا یہ اگر کسی کے لب تک آتیں تو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہوتیں۔

مالدار لوگوں میں ایک دوسرے قسم کی نفس پرستی بھی تھی۔ وہ تعریف سے خوش ہوتے تھے [او]ر اس کو خریدنے کے لئے خوب دولت صرف کرتے، جس طرح بڑے بڑے محلوں، عمدہ عمدہ سامانوں، [پُرتکلف] [لذیذ تر]ین کھانوں، لباسوں، کنیزوں اور باغوں سے ان کے نفس کے بتوں کو خوشی ہوتی اسی طرح اپنی [تعر]یف سے ان کی انانیت کے بت کو جو اس زمانہ میں نہایت طاقتور تھا خوب حظ آتا، بادشاہوں،

خلیفوں اور امیروں کی ایک معتدبہ دولت شعراء نوازی اور تعریف خریدنے یا غیر مطمئن شعراء کی ہجو سے بچنے پر صرف ہوتی، چونکہ شعر گوئی ایک فائدہ مند تجارت تھی اس لئے بہت سے ایسے لوگ جن کو قسمت نے ممتاز گھرانوں میں پیدا نہ کیا تھا یا جو بہتر ذرائع سے امیر نہ ہو سکے تھے شاعر بن گئے تھے اور امیروں کی انانیت کو اپنی پُر مبالغہ تعریفوں سے موٹا کرنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور اس پیشہ میں گو کہ ضمیر فروشی، دروغ گوئی اور اجتماعی فساد کے عناصر بھرے ہوئے تھے یہ ہر حیثیت سے فائدہ مند ہی تھی کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس سے بڑے لوگوں کی صحبت حاصل ہوتی اور وہ صحبت کتنی رنگین اور کتنی مسرت انگیز تھی بلکہ ہر شخص جس کی تعریف کی جاتی یا تو اپنے ہم چشموں سے بڑھنے کی خاطر زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کرتا یا کم دے کر شاعر کو ناراض کر کے اس کی خوفناک ہجو سے بچنے کے لئے خوب ہاتھ کھول کر دیتا۔

یہ تھا مختصراً ابان کا ماحول، قدرت نے ابان کو شکیل، خوش ادا اور طباع بنایا تھا اور ان تینوں کی اُن کے ماحول میں بڑی قیمت تھی، بچپن میں اس نے قرآن حفظ کیا، فقہ کی تعلیم پائی، حساب اور مضمون نویسی میں قابلیت پیدا کی اور ادب میں خوب مہارت بہم پہنچائی یہ معلومات ہم کو خود اسکے اپنے اشعار سے اور حفظ قرآن کے متعلق صولی کی تصریح سے حاصل ہوئے ہیں ان شعروں کا ترجمہ عنقریب پیش کیا جائے گا۔

جوانی میں ابان بصرہ سے بغداد آیا، رشید کی خلافت تھی اور اس کے برمکی وزیروں یحییٰ، فضل اور جعفر کی نہایت مسرفانہ فیاضی کی شہرت ہر طرف پھیل رہی تھی یہ کسروی شان و شوکت اور عظمت کی دل کھول کر داد دے رہے تھے حتیٰ کہ رشید کی مسرفانہ فیاضی ان کے سامنے گرد تھی۔ ان کے دروازہ پر شاعروں اور ملاقاتیوں کی بھیڑ رہتی اور ان میں سے کوئی محروم نہ لوٹتا روپیہ خرچ کرنا ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا شعراء، ادباء اور مصنف ان کی سرپرستی میں تھے اور ساری حکومت کی آمدنی انکے ہاتھوں میں تھی

ابان برمکی وزیروں کے ہاں قسمت آزمائی کرنے بصرہ سے بغداد آیا اور ان کے محل کے باہر حاضر امیدواروں کے زمرہ میں شامل ہو گیا۔ صولی[1] نے اس اہم ملاقات کا تذکرہ کیا ہے ان کا راوی عتابی ہے

---

[1] یہ ایک پُر مغز مضمون نگار اور شاعر تھا۔ برامکہ کی سرپرستی اور خدمت میں رہتا تھا اسکی ایک کتاب مسمیٰ بکتاب المنطق فہرست ۱۱۵ پر مذکور ہے۔

وہ کہتا ہے:۔ "میں چار ہزار شاعروں اور ملاقاتیوں کے ساتھ فضل بن یحییٰ برمکی کے دروازہ پر امیدواری کر رہا تھا، ہمارے درمیان ایک جوان تھا جس کے پاس جاکر ہم اس کی باتیں سنتے تھے، وہ ایک دن بیٹھا تھا کہ اس کے پاس ایک نہایت خوبصورت لڑکا آیا اور بولا میرے آقا آپ مجھے میرے ماں باپ سے چھینا کرکے آئے آپ کا دعویٰ تھا کہ آپ کا بادشاہوں سے تعلق ہے، ہماری حالت تو بہت خراب ہوگئی ہے اگر آپ ماں باپ کے پاس جانے کی مجھے اجازت دیں تو میں چلا جاؤں۔ یہ سن کر جوان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بولا، دوات اور کاغذ لاؤ، لڑکا لایا اور جوان نے ذرا بیٹھ کر ایک رقعہ لکھا اور اپنی جگہ واپس آکر لڑکے سے بولا "جب میں لوٹوں تو مجھ سے ملنا" تھوڑی دیر بعد ایک شخص فضل سے ملنے آیا اور اجازت منگوائی جوان اٹھ کر اس کے پاس گیا اور بولا مہربانی کرکے میرا یہ رقعہ وزیر کو دیدیجئے" اس نے پوچھا: تمہارے رقعہ میں کیا ہے؟" جوان میں نے اپنی تعریف کی ہے اور وزیر کو اپنی قبولیت کی ترغیب دی ہے" اس شخص نے رقعہ لینے سے عذر کیا، جوان اپنی جگہ لوٹ آیا داروغہ در نکلا تو وہ اس کے پاس گیا اور وہی الفاظ اس سے کہے جو پہلے شخص سے کہے تھے، داروغہ کو اس کی بات دلچسپ معلوم ہوئی اور بولا، یقیناً وہ شخص عجیب ہوگا جو فضل جیسے انسان سے اس کی تعریف سے نہیں بلکہ اپنی تعریف سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے" اس نے رقعہ لے لیا اور اندر جاکر تختی پر لگا کر فضل کے سامنے پیش کیا، فضل نے لیٹے لیٹے اس کی دو سطریں پڑھیں پھر سیدھا ہو کر بیٹھا اور رقعہ ہاتھ میں لے کر پڑھا، پڑھنے کے بعد اس نے داروغہ در سے کہا "کہاں ہے رقعہ دینے والا؟" داروغہ در: "خدا امیر کو عزت دے دروازہ پر اتنی بھیڑ ہے کہ میں اس کو نہیں پہچان سکتا" فضل: میں بھی اس کو تمہارے واسطے نکالے لیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے آواز دی: "لڑکے محل کی چھت پر جاکر پکارو: اپنی تعریف کرنے والا کہاں ہے؟" لڑکے نے جاکر پکارا جوان ہمارے پاس سے (ستابی راوی ہے) اٹھا نہ جوتا پیر میں نہ جسم پر چادر، جب فضل کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے پوچھا "جو کچھ رقعہ میں ہے تم نے کہا ہے؟" جوان: جی ہاں" فضل مجھے سناؤ" جوان نے یہ شعر پڑھے:۔

میں ان میں سے ہوں جنکی امیر کو مانگ ہے　　　میں امیر کے گہنائے گرانمایہ میں سے ہوں

۲۔ کاتب ہوں، حاسب ہوں، بلیغ اور ادیب ہوں۔ خیر خواہ ہوں ہر خیر خواہ سے زیادہ
۳۔ غیر معمولی شاعر ہوں اپنے شعور کی نزاکت کے لحاظ سے ہلکے سے ہلکے پر سے زیادہ ہلکا
۴۔ اس کے علاوہ مجھے ابن ہرمہ کے اشعار خوب یاد ہیں اور ان کی بڑی فاضلانہ تشریح کرتا ہوں
۵۔ اس کے علاوہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کی حدیثیں اور علمی نکات خوب صاف صاف بیان کرتا ہوں۔
۶۔ نحو میں بڑا تیز ہوں اور اس علم میں میرا پایہ بہت بلند ہے۔
۷۔ اگر امیر خدا ان کو تندرست رکھے مجھے نیزے پر ماریں تو اتنا تیز ہوں کہ اس کی دھار توڑ دوں
۸۔ نہ تو کمزور ہوں، نہ اپنے فیاض آقا کے سوا کسی اور کی بات سننے والا۔
۹۔ اے امیر میں نہ موٹا ہوں، نہ بدھو، نہ چھوٹے گٹھیلے جسم کا۔
۱۰۔ میری ڈاڑھی کم گھنی ہے، میرا چہرہ حسین ہے۔ چراغ کے شعلہ کی طرح چمکیلا۔
۱۱۔ میرے پاس بے شمار ایسے قصے کہانیاں ہیں جو بادشاہوں کے لئے سیب کی طرح دلکش ہیں
۱۲۔ مجھ جیسوں سے بادشاہ اپنی خلوت میں تفریح کرتے ہیں اور سخت مشکلات میں مشورہ
۱۳۔ شکار کے دن پرندہ کی پرواز میرے لئے سب سے زیادہ نیک شگون ہوتی ہے جاہے میں صبح کو نکلوں یا شام کو (عرب شکار یا سفر وغیرہ سے پہلے شگون لینے کے لئے پرندوں کو کنکریوں سے اڑاتے تھے اگر شگون لینے والے کے سیدھی طرف سے پرند اڑتا تو نیک شگون ہوتا ورنہ بد)
۱۴۔ مجھے ہر شخص سے زیادہ شکاری پرندوں، گھوڑوں اور حسین لونڈیوں کی پرکھ ہے
۱۵۔ یہ سب صفات مجھ میں ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میں ظریف بھی ہوں۔
۱۶۔ نہ تو میں ایسا عبادت گذار ہوں جو ہر وقت اپنے کپڑے اٹھائے رہتا ہے (کہ کہیں نجاست نہ لگ جائے)، نہ بے حیا رند مشرب ہوں۔

فضل نے اس کا یہ شعر با آواز پڑھا: کاتب ہوں، حاسب ہوں، ادیب ہوں، خیر خواہ ہر خیر خواہ

---

[1] عقد الفرید ۳۴۲/۳ کی روایت میں لفظ کثّۃ ہے جس کے معنی گھنے کے ہیں اور یہ لفظ یہاں زیادہ مناسب ہے۔

سے زیادہ جوان: "جی ہاں خدا امیر کو تندرست رکھے" فضل "لڑکے فارس سے جو خطوط آئے ہوں لاؤ، خط لائے گئے، فضل نے جوان سے کہا ان خطوط کو پڑھ کر ان کے جواب لکھو" (فضل کاتب یعنی سکریٹری شپ کی لیاقت جانچنا چاہتا ہے) جوان فضل کے سامنے بیٹھ کر لکھنے لگا: داروغہ در نے اس سے کہا "ایک طرف بیٹھ کر لکھو تاکہ دماغ حاضر رہے" جوان اس جگہ سے زیادہ دماغ کہاں حاضر ہوگا جہاں رُعب اور رغبت دونوں جمع ہیں" جواب لکھ کر جب اس نے فضل کے سامنے پیش کئے تو اس کے دل میں کھب گئے پھر اس نے آواز دی: "لڑکے تھیلی، تھیلی، تھیلی (ایک تھیلی میں دس ہزار درہم یا دینار ہوتے تھے یعنی تقریباً پانچ ہزار یا پچاس ہزار روپئے) جوان: خدا امیر کا مرتبہ بڑھائے دینار کی یا درہم کی"، فضل: "لڑکے دینار کی" جب تھیلی لاکر رکھی گئی تو فضل نے کہا جاؤ اس کو اٹھا لے جاؤ خدا تمہیں برکت دے" جوان: خدا کی قسم امیر میں نہ قُلّی ہوں نہ قلی گری کے لئے پیدا ہوا ہوں، میں ممنون ہوں گا اگر آپ کسی غلام کو لے جانے کا حکم دیں اور غلام مجھے دے دیں اور جس طرح درہم و دینار کی تھیلیوں میں انتخاب کا مجھے موقع دیا ہے اسی طرح غلام منتخب کرنے کا موقع بھی عنایت کریں فضل نے اس کی بات مان لی اور جوان نے سب سے خوبصورت غلام پسند کرکے اس کو تھیلی لے جانے کا حکم دیا چلتے وقت جوان رونے لگا فضل کو بہت برا لگا۔ تیرا برا ہو کیا یہ کم ہے؟" جوان: نہیں خدا آپ کی مدد کرے آپ نے بہت دیا ہے، میں اس غم سے روتا ہوں کہ زمین آپ جیسی ہستی کو چھپالے گی"، فضل یہ بات پہلے سے زیادہ مستحق سخاوت ہے، لڑکے: اس کو ایک خلعت اور بار برداری کا جانور دو[۱]

اس کے بعد اَبان فضل کی سرپرستی میں آگیا اور بڑی قربت حاصل کی، عتابی کا کہنا ہے (بتصریح صولی صـ۶) کہ "جب فضل باہر نکلتا تو اس کے گھوڑے کے پیچھے ابان کا گھوڑا ہوتا" اور یحییٰ فضل کا باپ اس کی ادبی قابلیت اور شعری بصیرت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کو شعراء کی نگرانی اور ان کے کلام کا انعامی رتبہ متعین کرنے کا کام سونپ دیا سارے شعراء جو وزیروں کی تعریف میں قصیدے لاتے پہلے ابان سے منظوری لیتے ابان چھان بین کرکے ان کے پہلے شعر رہنے دیتا

[۱] عقد الفرید ۲/۳۲ کے راوی نے انعام کی مقدار دس لاکھ درہم بتائی ہے [۲] صولی ۳ تا ۶ [۳] تاریخ بغداد خطیب ۷/۴۴ تا ۴۹

باقی کاٹ ڈالتا۔ یحییٰ نے ابن المقفع (مقتول ۱۴۲یا ۱۴۳ھ) کی پہلوی سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتاب کلیلہ و دمنہ کو جو جانوروں کی زبان سے تدبیر و سیاست کے عملی اصول پیش کرتی ہے جب حفظ کرنا چاہا تو اس کو دقت پیش آئی اور کتاب حکمت عملی اور سوجھ بوجھ کی باتوں کے لحاظ سے اس قابل تھی کہ اس کا ہر حکمراں کے دل میں ہونا ضروری تھا۔ اَبان نے اس مشکل کے پیش نظر کتاب کو مثنوی نظم میں منتقل کر دیا، وزیر کو کتاب حفظ کرنے کا شوق اس بلا کا تھا کہ اس نے اَبان کو ایک مکان میں نظربند کر دیا اور حکم دیا کہ جب تک نظم نہ کر لے باہر نہ آئے، تین ماہ کی کوشش کے بعد کتاب چودہ ہزار اشعار میں نظم ہوئی اور یہ کام اس پایہ کا تھا کہ کسی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: جو کلام نثر سے نظم ہو اس میں فصاحت نثر ہی کے ساتھ رہتی ہے البتہ کلیلہ و دمنہ نظم ہو کر نثر سے زیادہ فصیح ہے[1] نظم دیکھ کر یحییٰ باغ باغ ہو گیا اور دس ہزار دینار انعام میں دئے جو تقریباً پچاس ہزار روپیہ کے مساوی ہیں اور اس کے لڑکے فضل نے پانچ ہزار دینار دیئے دوسرے لڑکے جعفر بن یحییٰ کو نظم اتنی پسند آئی کہ وہ اَبان کا رادیہ بن گیا یعنی اَبان کی شاگردی میں اس کو حفظ کر لیا، اَبان اس اعزاز سے اتنا خوش ہوا کہ انعام کا ایک تہائی حصہ یعنی پانچ ہزار دینار خیرات کر دئے[2]۔

کلیلہ دمنہ کی نظم سے دو بڑے فائدے ہوئے ایک تو خود اَبان کو اور وہ یہ کہ اس کی قدر و منزلت برمکی وزیروں کی نظر میں بہت بڑھ گئی اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ یحییٰ نے اس کو صدر الشعراء اور نقاد الشعراء کا مرتبہ عطا کیا، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اَبان کی شعری صلاحیتوں کو رائج الوقت شعر گوئی (قصیدہ، غزل ہجو وغیرہ) کے پٹتے ہوئے جادہ سے الگ ایک نئے جادہ بنانے کا طاقتور محرک ملا، یہ جادہ تھا نثری مواد کو نظم میں منتقل کرنے کا اس زمانہ میں جبکہ لکھے ہوئے علوم و فنون کی جگہ یاد کیے ہوئے اور زبانی اخذ کیے ہوئے علوم کی زیادہ عزت تھی (صرف زبانی اور سلسلۂ شیوخ سے اخذ کیا ہوا علم مستند سمجھا جاتا کتابوں سے اخذ کرنے والے کی قدر نہ تھی اور اس کو صحفی کا لقب دیا جاتا تھا، یہ ایک نہایت اہم اور مفید خدمت تھی چنانچہ اَبان نے متعدد دوسری بڑی نظمیں لکھیں جن کے ماخذ اور نام یہ ہیں:۔

---

[1] صولی ص ۴۳، [2] صولی ص ۲ و خطیب ۴۴/۳ [3] صولی ص ۲ و خطیب ۴۴-۴۵/۳

(باقی آئندہ)

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ

اور

جنگ پانی پت

(۴)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

درانی کی آمد | شاہ درانی مراسلہ نجیب الدولہ کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شکست
پنجاب پر مرہٹوں کے قبضہ سے پیچ وتاب کھاکر ہندوستان کی مہم کا ارادہ کرچکا تھا فوراً عازم ہند ہوا۔
دتا نے جب احمد شاہ کے حدود پنجاب میں داخل ہونے کا حال سنا تو اپنی جگہ گوبند رائے
ت کو نجیب الدولہ کے محاصرہ کے لئے چھوڑ کر خود غازی الدین اور جہنکوجی کے اشارہ کے
ف پنجاب کی طرف چلا دہلی سے تھوڑی دور آگے شاہ درانی اور دتا دونوں ٹکرائے چنانچہ دتاجی
آیا اور دو تہائی فوج دتاجی کے ہمراہ ماری گئی جہنکوجی بھی شریک جنگ تھا اس نے فرار ہوکر دکن
شاہ درانی کے آنے اور دتا کے مارے جانے کی خبر سنائی۔

سرداران مرہٹہ | سدا شیو راؤ بھاؤ۔ بشواس راؤ۔ پسر بالاجی راؤ بلونت سنگھ نام ور مرہٹے
ردار دکن سے روانہ ہوئے اور اس عزم اور داعیہ کے ساتھ چلے کہ ہندوستان سے خاندان
دریہ کا نام ونشان مٹاکر دلی کے تخت پر بشواس راؤ کو بٹھائیں گے۔ اور کل بر اعظم ہندوستان
مرہٹوں کی شہنشاہی باقاعدہ طور پر قائم کریں گے[1]

درانی کا حملہ | شاہ درانی دتا سے نبٹنے کے بعد انوپ شہر چلا گیا وہاں اقامت اختیار کرتے ہی اپنے

---

[1] رسالہ عبرت مئی سنہ ۲۶ء مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آباد

وزیر سردار شاہ خاں بہادر کے برادرزادہ سردار عطائی خاں بہادر کو سکھرتال کی طرف نجیب الدولہ کو محاصرہ سے نکالنے کے لئے روانہ کیا۔

نجیب الدولہ کو محاصرہ میں پورے چار مہینے گذر چکے تھے اس چار مہینے میں ایک گھانس کا تنکا اور اناج کا دانہ تک محاصرین نے اندر نہیں جانے دیا تھا بہت سے آدمی فاقوں سے مر چکے تھے سردار عطائی خاں معہ کئی ہزار سواروں کے ایک رات میں ساٹھ کوس چل کر سکھرتال کے قریب پہنچا تھا کہ اول اس کو وہ سامان رسد ملا جو دہلی سے نواب غازی الدین نے پنڈت گوبند رائے کی فوج کے لئے روانہ کیا تھا اس سامان رسد میں کئی ہزار بیلوں پر چاول کی بوریاں اور گھی کے کپے لدے ہوئے تھے سردار عطائی خاں مرہٹوں کے محافظ دستہ کو قتل کرکے اس سامان کو قبضہ میں لائے اور گوبند پنڈت کی فوج جو بے خبر اور چین کی بانسری بجا رہی تھی ان پر ٹوٹ پڑے ہنگامہ کارزار کا شور سن کر نجیب الدولہ بھی اپنے قلعہ سے باہر نکل آئے اور اس طرح چشم زدن میں گوبند پنڈت کی بیس ہزار فوج میں سے کثیر التعداد لقمۂ اجل ہوئے باقیماندہ کو اپنی جان بچا کر راہ فرار اختیار کرنا پڑی گوبند پنڈت بھی مع الخیر فراریوں کی سرداری کرتے ہوئے میدان مصاف کو چھوڑ گئے۔

سردار عطائی خاں کی کارگذاری | سردار عطائی خاں نے نواب نجیب الدولہ کی خدمت میں حاضری دی اور ہر دو گلے ملے وہ مال غنیمت جو قبضہ میں آیا تھا پیش کیا اور فاقہ زدہ فوج میں بلاؤ کی دیگیں پک گئیں۔ نجیب الدولہ نے ایک دو روز محاصرہ سے آزاد ہو کر سکھرتال میں قیام کیا اور نجیب آباد چاندپور اور نگینہ کی چھاؤنیوں سے آدمی اور سامان ضروری کو بعجلت تمام فراہم کیا ادھر ادھر اور قرب وجوار کے جانباز ان کی فوج میں آ شامل ہوئے۔ علاقہ کا مناسب انتظام اور احکام جاری کرنے کے بعد عطائی خاں کے ہمراہ انوپ شہر کی طرف روانہ ہو گئے"۔

شاہ درانی کی خدمت میں نوابان روہیلکھنڈ کی باریابی | نواب حافظ رحمت خاں، نواب دوندے خاں نواب فیض اللہ خاں وغیرہ بھی بریلی، بسولی، رامپور سے چل کر شاہ درانی کی خدمت میں انوپ شہر

غازی الدین اور شجاع الدولہ | نواب نجیب الدولہ کا سکھرتال میں جب دتا مرہٹے نے محاصرہ کیا تھا تو غازی الدین نے شجاع الدولہ کو خط لکھا تھا کہ تم ہمارے شریک ہو جاؤ یہ بہترین موقعہ ہاتھ لگا ہے ہم تم سب مل کر نجیب الدولہ کا کام تمام کر دیں ہم سب کا یکساں دشمن ہے اور ہمارے تمہارے زنی اور اعزاز میں آڑے آتا رہتا ہے گو شجاع الدولہ نجیب الدولہ کا دوست نہ تھا اور وہ بھی ایسے موقعہ کی تلاش میں عرصہ سے لگا ہوا تھا مگر اس کو یہ بھی خبر تھی کہ شاہ درانی افغانستان سے قریبی زمانہ میں وارد ہوا چاہتا ہے اس کے علاوہ نواب حافظ رحمت خاں اور دوسرے نواب دوندے خاں سرداران روہیلہ نجیب الدولہ کے معین ومددگار ہیں تو وہ متامل ہوا۔

حدود پنجاب میں شاہ درانی کے آنے کی خبر اور مرہٹوں کی ہمت کا حال سنا تو وہ ادھر سے بادل ناخواستہ نجیب الدولہ کی معاونت کیلئے چلا اور ہلدور تک آکر پھر اس کی راتے پلٹی واپس چلا گیا۔

شجاع الدولہ کے اس عاجلانہ ایاب و ذہاب کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ نجیب الدولہ کے علاقہ میں جو مرہٹوں کے بعض گروہ فساد مچاتے پھر رہے تھے وہ چندروز کے لئے گنگا کے دوسری طرف چلے گئے۔

عالمگیر ثانی کا قتل | شجاع الدولہ تو غازی الدین کے ہاتھ نہ لگا مگر اس کو زیادہ بھروسہ مرہٹے سرداروں پر تھا اور سمجھ رہا تھا کہ نجیب الدولہ اور دیگر سرداران روہیلکھنڈ کا خاتمہ مرہٹے کر دیں گے مگر یکایک خبر لگی کہ شاہ درانی آگیا اور مرہٹوں کی کثیر التعداد فوج اور بہادر سردار مرہٹے چار مہینے تک ایڑی چوٹی کا تمام زور لگا کر نجیب الدولہ اور اس کی مٹھی بھر فوج کو زیر نہ کر سکے تو وہ مایوس ہوا اور اپنے ماموں انتظام الدولہ کو جو قید میں پڑا ہوا تھا اس جرم میں قتل کیا کہ اس کی شاہ درانی سے خفیہ خط وکتابت ہے اسی جرم میں بادشاہ عالمگیر ثانی کو قتل کرایا اور اس کی لاش کو جمنا کی ریتی پر پھینک دیا گیا اب اس کے لئے ان حرکات کے بعد یہی صورت تھی کہ وہ دلی سے رفو چکر ہو جاتے چنانچہ کہیں اس کے لئے پناہ نہ تھی سورج مل جاٹ کے پاس چلا گیا اور منتظر رہا کہ بھاؤ کو دلی پر قبضہ کرنے کی دعوت

دی ہے وہ معہ افواج قاہرہ کے اس طرف سے گذرے گا چنانچہ جب یہ فوج آگئی اس کا رہبر بن کر دہلی لوٹا۔

شاہ درانی کو جب عالمگیر ثانی کے قتل اور غازی الدین خاں کے بھاگ جانے کی خبر لگی تو اس نے سردار یعقوب علیخاں شاہجہاں پوری کو جو نواب حافظ الملک حافظ رحمت خان کا وکیل مطلق تھا دہلی کا فوجدار بنا کر بھیجدیا۔ اور یعقوب علیخاں نے آکر دہلی پر قبضہ جما لیا۔

دہلی پر مرہٹوں کا حملہ | سداشیو راؤ بھاؤ۔ بشواس راؤ۔ بلونت سنگھ۔ شمشیر بہادر۔ راجہ سورجمل جاٹ۔ نواب غازی الدین خاں۔ مہاراجہ گائیکواڑ۔ ملہار راؤ ہلکر۔ مہاجی سیندھیا۔ ابراہیم خاں گاردی۔ فتح خاں گاردی۔ جھنکوجی۔ دوسرے سرداران راجپوتانہ وغیرہ سب ملکر مغلیہ حکومت کو مٹانے کے لئے دہلی پر حملہ آور ہوئے۔ یعقوب علی خاں پر عرصۂ روزگار تنگ ہو گیا۔ شاہ درانی کو خبر ہوئی اس نے یعقوب علیخاں کو لکھ بھیجا کہ تم قلعۂ دہلی افواج مرہٹہ کے لئے چھوڑ کر چلے آؤ اور دہلی پر مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے یعقوب علی خاں نے حکم کی تعمیل کی۔

سرداران مرہٹہ کا قبضہ دہلی | بھاؤ نے بڑھ کر دہلی پر تصرف کیا —— غازی الدین یہ مرہٹوں کی چیرہ دستی دیکھ رہا تھا کہ وہ مساجد منہدم کر رہے تھے مقابر توڑ رہے تھے رعایا پر ہر قسم کا ظلم کیا جا رہا تھا۔ اور لوٹ کھسوٹ جاری تھی تمام خزانہ پر قبضہ کیا امراء سے جواہرات ظلم کر کے حاصل کئے غرضکہ بدتمیزی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا

دہلی کے تخت نشینی کا خواب | بھاؤ نے تمام ساتھی امراء سے مشورہ کیا کہ پیشوا کے بیٹے بشواس راؤ کو دہلی کے تخت پر بٹھایا جائے اور وزیر اعظم شجاع الدولہ کو کیا جائے لیکن پھر سب کے مشورہ سے بشواس راؤ کی تخت نشینی کی رسم کو چند روز کے لئے ملتوی کر دیا کہ پہلے احمد شاہ درانی سے نبٹ لیا جائے۔

مرہٹوں اور شجاع الدولہ میں سازباز تھا وہ اسے اپنا طرفدار اور ہوا خواہ سمجھتے تھے اس لئے اس کی غیر موجودگی میں اس کے لئے بھاؤ نے عہدۂ وزارت تجویز کیا تھا۔

صنم اکبر اور جامع مسجد | بھاؤ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا پتھر کا بت بنوا کر لایا تھا اور کہتا تھا کہ جس روز لشواس راؤ دہلی کے تخت پر بیٹھے گا اس روز یہ بت دہلی کی جامع مسجد میں نصب کیا جائیگا اور اس مسجد کو ہندوؤں کا معبد بنایا جائے گا؛

مصنف تاریخ احمد لکھتا ہے۔

از غرور و نخوت بر زبان بھاؤ و دیگر سرداران مرہٹہ گزشت کہ بعد از فتح جنگ بادشاہ و قتل سرداران افاغنہ و انہدام بنیان مسلمانان وشواس راؤ را بادشاہ ہندوستان خواہیم ساخت و ایں بت سنگین کلاں را کہ ہمراہ ماست در جامع مسجد گذشتہ معبد قوم ہنود خواہیم گردانید و بجائے بانگ نماز آواز ناقوس بلند خواہیم نمود[1]

میدان پانی پت | بھاؤ نے اپنے تمام لشکر کو ہمراہ لے کر دہلی سے سرہند کی طرف کوچ کیا اس وقت مرہٹوں کی جمعیت کاشی رائے کے بیان سے پانچ لاکھ تھی اور بعض مورخین دس لاکھ لکھتے ہیں اور درانی فوج ۴۰ ہزار[2]

، رجمادی الاول کو کنج پورہ پہنچا وہاں عبدالصمد خاں محمد زئی اور میاں قطب شاہ وغیرہ سرداران شاہ درانی فراہمی سامان رسد کے لئے مقیم تھے بھاؤ نے ان پر حملہ کیا سب سردار قتل ہو گئے یہ خبر شاہ درانی کو پہنچی تو وہ فوراً نجیب الدولہ و حافظ رحمت خاں و فیض اللہ خاں سرداران روہیلکھنڈ کو ہمراہ لے کر مرہٹوں کی تادیب کے لئے روانہ ہوا جس وقت باغپت کے گھاٹ پر پہنچے تو دریائے جمنا طغیانی پر تھا فوج کا پار اترنا سخت دشوار تھا شاہ درانی دریا کے کنارے کھڑا ہوا اور قرآن کریم کا کوئی حصہ پڑھ کر ایک تیر پر دم کیا اور تیر دریا میں ڈال کر کہا کہ یہ تیر رہبری کرے گا اس کے پیچھے بسم اللہ کہہ کر گھوڑے ڈال دو چنانچہ تمام لشکر دریا کے پار اتر گیا گھوڑوں کے زین تک پانی نہ پہنچا۔ دریا کے پار ہو کر لشکر کی درستی اور سامان کے ٹھیک کرنے کی غرض سے ایک دو روز نہایت آہستگی کے ساتھ کوچ کیا سنبھالکہ کی سرائے کے متصل قیام کیا گیا

(باقی آئندہ)

---

[1] تاریخ احمد ص ۱۲ [2] تاریخ نواب ص ۳۲۸

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل (۸)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

الحاق

نئے سر سے ہوں پھر اسلام کے آثار گم پیدا
مسیحا تم ہو نغروں میں ہو تا ثیر قُم پیدا

کر د معنی نص اِنّما اموالکم پیدا
جہادِ نفس کرنے کو ہوتے دنیا میں تم پیدا

محبت مال سے رکھو گے اے پیر و جواں کب تک

ہیں جتنے مست جام عیش کے رنگیں خیالوں سے
سوال ایک اور سائل کا ہے سب آسودہ حالوں سے

اشارہ صاف ہے یہ قومی قرضہ دینے والوں سے
وطن کے نوجوانوں سے چمن کے نونہالوں سے

رکھو گے جیب میں چاندی کے گنوں کو نہاں کب تک [1]

ذریعۂ اصلاح اور ادبی مسلک | فرماتے تھے استاد کو لازم ہے کہ شاگرد کی قابلیت اور صلاحیت و رجحانِ طبع کے مطابق اصلاح دے نیز یہ کہ جہاں تک ہو سکے شاگرد کے کلام میں کم سے کم تنسیخ کرے

راقم الحروف نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ مجھے داغ کی روش سے اختلاف ہے۔ نیز یہ کہ زبان اور لغات و محاورات اور قوافی وغیرہ کے متعلق انھوں نے جو قیود عائد کی ہیں ان کی اگر پابندی کی جائے تو اردو ادب کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ "بیشک استاد داغ کی مقرر کی ہوئی حدود کا میں بھی پابند نہیں ہوں۔"

استاد داغ نے لفظ "اور" کو بر وزن "جب" نا جائز قرار دیا ہے اور بر وزن "غور" جائز رکھا ہے۔ سائل نے دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل کا مطلع ہے:

---

[1] سلک مروارید ص۱۳

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی	(سائل دہلوی)

شروع سے آخر تک غزل کی ردیف میں لفظ "اور" ایک سبب خفیف کی صورت میں استعمال ہوا ہے، داغ نے لفظ "میں" (ضمیر متکلم) کو باظہار یا دنون غنّہ ایک سبب خفیف قرار دیا ہے۔ اور صرف میم متحرک باسقاط یا دنون کو جائز رکھا ہے مگر سائل نے دونوں طریقوں سے جائز رکھا ہے

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اسکے معانی کہو تو	(سائل دہلوی)

نظام دکن میر عثمان علی خاں ۱۹۲۷ء میں جب دہلی تشریف لائے تھے تو ادبی دنیا میں بڑی دھوم دھام ہوئی تھی۔ شعراء نے قصیدے اور تہنیت نامے لکھے۔ راقم الحروف نے بھی ایک مسدس لکھا تھا جس اخبار میں وہ شائع ہوا تھا وہ اخبار لے کر استاد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی اخبار میں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کا مسدس بھی تھا اس کا ایک ہی مصرع اس وقت مجھے یاد ہے۔ شاعر نے دہلی کو خطاب کر کے کہا ہے ؎	سر اٹھا تیری انگوٹھی کا نگینہ مل گیا

استاد مرحوم نے میری طرف اخبار بڑھا کر فرمایا کہ بتاؤ اس شعر میں کیا سقم ہے میں نے کچھ تامل کیا مگر سمجھ میں نہ آیا فرمایا "تاج ودولت بر سرت" والا قصہ یاد ہے؟ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ "سر اٹھانے" کے معنی "بغاوت" کے بھی ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ چونکہ اس لفظ میں دوسرے معنی کا ایہام بھی ہوتا ہے جو آداب شاہی کے خلاف ہیں اس لئے شاعر کو اس لفظ سے احتراز چاہئے تھا۔

بالعموم شاگردوں کو اور خاصکر مجھے اصلاح دینے کا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد دیر ہی غور کرنے اور اپنی اصلاح آپ کرنے کی ذمہ داری ڈالتے تھے۔ فرماتے تھے کہ تم خود غور وفکر کی عادت ڈالو میں نے اگر تمہاری غلطی کو بغیر تمہارے سمجھے ہوئے درست کر دیا تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا۔

کبھی شاگرد کے رجحان طبع کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر محض فنی اور لسانی

اغلاط کو درست کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں ہندستان کے چند ادبی رسائل میں جن میں رسالہ "شاعر" آگرہ پیش پیش تھا ایک ادبی بحث لفظ شروعات کے متعلق چھڑی۔ ایک صاحب نے اپنے کلام میں لفظ شروعات کو استعمال کیا اس پر رسالہ "شاعر" نے اعتراض کیا۔ یہ بحث کافی دلچسپ تھی دورانِ بحث میں کچھ تلخ طرزِ تحریر بھی اختیار کر لیا گیا تھا اور یہ چیز ادبی اور علمی ذوق کے لئے نامناسب تھی "شروعات" لفظ شروع کی جمع بنالی گئی ہے گو عربی میں اس طریقے سے مستعمل نہ ہو مگر ایسے بے انتہا الفاظ ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے کچھ اور صورت رکھتے ہیں اور ہماری زبان میں آکر کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں اور فصحائے ان کو اپنی ادبی تحریروں اور تقریروں میں جگہ دی ہے۔ مثلاً لفظ متلاشی (ذوق نے بھی استعمال کیا ہے) ترکی لفظ تلاش سے عربی باب تفاعل کا اسم فاعل بنایا ہے' نزاکت فارسی لفظ نازک سے عربی قاعدے سے تائے مصدری بڑھا کر مصدر بنایا ہے۔ رہائش یعنی سکونت اردو لفظ رہن یا رہنا سے بقاعدہ فارسی شین مصدری بڑھا کر مصدر بنایا ہے اس قسم کے الفاظ کے متعلق کہا جائے گا کہ ہماری زبان میں آکر کچھ تصرف کے بعد ہند ہو گئے ہیں۔ لفظ شروع عربی ہے اور اُردو میں اصل معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے اس کی جمع بھی عربی کے قاعدہ سے ہے گو عربی میں یہ جمع مستعمل نہ ہو مگر ہماری زبان کا تصرف اس کو ہند کر کے استعمال کرے تو اس کو رائج کرنا ادب کی وسعت کی دلیل ہے۔ جب متلاشی جیسے بے شمار الفاظ ہماری زبان میں جگہ پا سکتے ہیں تو شروعات کے جگہ نہ پانے پر تعجب ہے اس کے متعلق استاد مرحوم سے بھی استفسار کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس لفظ کو جائز قرار دیا۔ حضرت نوح ناروی فرماتے ہیں کہ ابتداء میں اس لفظ کو میں نے تسلیم نہیں کیا مگر جب مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی دہلوی (استاد حضرت سائل دہلوی) کے کلام میں دیکھا تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی اور ماننا پڑا کہ اس کو ہماری زبان میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس اثنا میں ایک صاحب نے علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب سے بھی استفسار کیا تھا وہ بجنسہ مع جواب کے درج ذیل کرتا ہوں۔

مخدومی و محترمی سلام مسنون۔ علمی حلقوں میں چند ماہ سے لفظ شروعات کے متعلق بحث

جاری ہے۔ ایک طبقے کے چند افراد کہتے ہیں کہ یہ لفظ فصیح اور صحیح ہے۔ دوسرا طبقہ جس کے مؤیدین زیادہ ہیں اس لفظ کو غلط، غیر فصیح اور عوام کی زبان کا بتاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ نیاز فتحپوری۔ مولوی عبدالمالک آروی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ علامہ شادان بلگرامی۔ جناب سیماب اکبرآبادی۔ حضرت آرزو لکھنوی۔ حضرت صفی لکھنوی۔ حضرت ثاقب لکھنوی۔ مولانا حسرت موہانی۔ حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت دل شاہجہانپوری۔ حضرت وحشت کلکتوی۔ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل دکن۔ حضرت شفق عمادپوری۔ نوح ناروی۔ آسی لکھنوی۔ حضرت ناطق گلاوٹھی۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ جیسے مستند اساتذہ اور ادباء نے بھی شروعات کو شروع کی بے قاعدہ جمع غیر فصیح اور عوام کی زبان کا لفظ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ محتاط ادبا شعراء اور ثقات اسے استعمال نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں دوسری جماعت نے چند عامی ادباء اور شعراء کی رائیں پیش کر کے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ شروعات ہر طرح قابل استعمال اور فصیح ہے میں چاہتا ہوں کہ شروعات کے متعلق ہندوستان کے تمام مشاہیر مستند اور ثقات شعرا ادباء علماء اور فضلا سے رائیں حاصل کروں تاکہ اردو زبان کا پایہ نہ گرنے پائے اور ناعاقبت اندیش غلط رو حضرات اپنی حرکات سے باز رہیں۔ اسی لئے آپ کو بھی تکلیف دے رہا ہوں از راہ کرم اپنی اولین فرصت میں اس لفظ کے جواز و عدم جواز کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمایئے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایئے کہ آپ نے کبھی اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے یا نہیں یہ لفظ غلط العام فصیح میں ہے یا غلط العوام قبیح میں۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ ۲۰ر اگست ۱۹۴۳ء

نیاز مند خاک رسید دل محمد شاہ منشی فاضل مولوی فاضل صدر السنہ مشرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول رخصتی مقام لاہڈرہ ڈاکخانہ بہرام۔ سررشتہ جالندھر

جواب از حضرت مفتی صاحب مدظلہم العالی

لفظ شروع عربی لفظ ہے اور مصدر ہے۔ اس میں الف تا بڑھا کر شروعات جمع کا صیغہ لیا گیا ہے مصدر سے اگر مصدری معنی مراد لئے جائیں تو اس کی جمع بنانا خلاف اصل ہے کیونکہ

المصدر لا یثنی ولا یجمع" مسلمہ قاعدہ ہے لیکن جب کہ لفظ مصدر سے مصدری معنی مراد نہ ہوں بلکہ حاصل بالمصدر کے معنی مراد ہوں یا مصدر سے اسم مفعول کے معنی مراد ہوں یا مصدر کے انواع بتانے مقصود ہوں تو مصدر کی جمع بنائی جاتی ہے جیسے رکعتہ۔ رکعات۔ سجدہ۔ سجدات قول۔ اقوال۔ طہارۃ۔ طہارات۔ اجارۃ۔ اجارات۔ امانتہ۔ امانات۔ دیانتہ۔ دیانات وغیرہ۔ شروع کے مصدری معنی آغاز کردن ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے جمع بنانا تو خلاف اصل ہے لیکن حاصل بالمصدر یعنی آغاز و ابتدا کے معنی لے کر جمع بنائی جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ فعول کی جمع الف تا کے ساتھ فعولات آتی بھی ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ فعول کے وہ مصادر جو ذوات التاء ہیں ان کی جمع تو الف تا کے ساتھ مطرد ہے۔ جیسے نبوۃ۔ نبوات۔ خصومتہ۔ خصومات حکومتہ حکومات۔ وسومتہ وسومات اور جو مصدر غیر ذوات التاء ہیں۔ جیسے شروع رکوع سجود نزول ہبوط صعود سکون قعود جلوس وجود ان کی جمع فعولات پر اگرچہ مطرد نہیں لیکن ان میں سے بعض مصادر کی جمع فعولات پر بنائی اور استعمال کی گئی ہے (یہ یاد رہے کہ یہ جمع مصدری معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسم مصدر یا حاصل بالمصدر کے معنی کے لحاظ سے ہے مگر لفظ مصدر کی جمع ہے) اسی طرح شروع کو حاصل بالمصدر کے معنی (آغاز) میں لے کر اس کی جمع شروعات بمعنی آغاز یا ابتدا ہا بن سکتی ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ شروعات کو شروع کی جمع قرار دینا اس وقت ممکن تھا کہ اس کو جمع کے معنی میں استعمال کیا جاتا لیکن اس کو صحیح سمجھنے اور استعمال کرنے والے مفرد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسے "قبا جسم کی تنگ سے تر ہوئی۔ حیا کی یہاں سے شروعات ہے سائل دہلوی" تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ کے صحیح ہونے کے بعد یہ خیال لائق اعتنا نہیں ہے۔ کیونکہ عربی جمع کے متعدد الفاظ اردو میں مفرد کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لفظ اصول۔ اخبار۔ احوال۔ واہیات۔ خرافات۔ اسباب وغیرہ ان تمام باتوں کے باوجود اکثر ادبا شروعات کا لفظ استعمال نہیں کرتے اس لیے میں بھی اس کے استعمال کو پسندیدگی کی نظر سے تو نہیں دیکھتا۔ مگر استعمال کرنے والوں کو بھی مستحق طعن و تشنیع نہیں سمجھتا۔ والسلام

تصانیف | جہاں تک مجھے معلوم ہے استاد مرحوم کے چار دیوان مکمل ہیں اور ایک مثنوی نامکمل ہے۔ مگر یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ ہے۔ اور اب تک ان کا کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔

ایک چھوٹا سا سہروں کا مجموعہ سائل مرحوم نے ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء میں چھپوایا تھا جس میں خود ان کے بھی متعدد سہرے ہیں اور کچھ تاباں صاحب کے اور کچھ دیگر حضرات کے سہرے ہیں اور ایک بارہ غزلوں کا چھوٹا سا رسالہ راقم الحروف نے ۱۹۴۲ء میں "بارۂ کچکول" کے نام سے شائع کیا تھا یہ نام خود مرحوم نے ہی تجویز فرمایا تھا اور اس کی ابتداء میں بعنوان "عرض سائل" مندرجہ ذیل عبارت لکھوائی تھی؛ غور فرمائیے عبارت کیا ہے موتیوں کی مالا ہے۔

"حقیقت اس پیشکش حقیر موسوم بہ" پارۂ کچکول" کی یہ ہے کہ میرے وطنی اور بیرونجات کے احباب کے تقاضوں نے مجھے ایسی حالت میں اپنا کلام طبع کرانے کے لئے تنگ کر دیا کہ میں آنکھوں میں پانی آنے کی وجہ سے نہ خود لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں کاغذ کی گرانی اور کمیابی نے سخت تر مجبور کر دیا۔ جس عزیز سے اس بارہ میں مشورہ کیا، نہ اس نے میری معذوری پر نظر ڈالی نہ میری کم مائیگی پر۔ یہی کہا کہ جس طرح ممکن ہو اپنی زندگی میں ہی طبع کراؤ میں اپنے معاصرین میں درجۂ امتیاز نہیں رکھتا کہ پاس ہوس ناموری کرتے ہوئے ان کے ارشاد پر فوری کاربند ہو جاؤں۔ میرے ذوق ادب نے میرے اس شغل کو جاری رکھا جس سے جلب منفعت یا ہوائے شہرت کا کچھ تعلق نہیں میرا کلام ایسے محاسن سے معری ہے جو شاعری میں ہونے چاہئیں اپنے شوق کو میں نے اپنے وطن اور مادری زبان تک محدود رکھا ہے میرے کلام میں وہ خوبیاں نہیں جو میرے ہم عصروں کو خدا نے عطا فرمائی ہیں نہ میں نے ان کی تحصیل میں جد وجہد کی نہ فصیح و بلیغ ہونے کا مجھے دعویٰ! دلی کی بولی بولتا ہوں اور بس!

جن حضرات نے میری زبان پر نکتہ چینی کی ان کی صورت دیکھ کر میں نے صبر کیا۔ جن اصحاب نے مجھے اس حیثیت سے بلند پایہ سمجھا اخلاقاً ان کا شکریہ ادا کیا اور دل میں شرمسار رہا۔ کبھی ذہن میرا اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ میرا شمار زمرۂ اہل کمال میں ہے جو حضرات میری اس التماس کو میرا انکسار سمجھیں گے وہ مجھے جھوٹا سمجھیں گے میری اس

گذارش کو جذبۂ فردتنی سے کوئی تعلق نہیں یہ حقیقت تھی جو میں نے عرض کر دی اور صاحبزادہ مولوی حفیظ الرحمان

جو مفتی اعظم ہند کے جگر گوشہ اور میرے عزیز ترین رفقا میں سے ہیں اس معاملہ کو ان کے سپرد کر دیا۔

ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی۔ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

تلامذہ استاد مرحوم کے شاگرد بے شمار ہیں۔ مگر افسوس کہ میری معلومات محدود ہیں مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں اپنے تمام بھائیوں سے واقف نہیں ہوں جو حضرات مجھے معلوم ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مولانا مولوی قیام الدین صاحب نادرؔ شاہجہاں پوری۔
۲۔ جناب عبد الخالق صاحب نہالؔ سیوہاردی۔
۳۔ مولانا مولوی محمد حسن صاحب اخترؔ دہلوی۔
۴۔ جناب سبط حسن صاحب غافلؔ امروہوی۔
۵۔ جناب محشرؔ امروہوی
۶۔ جناب شاکرؔ دہلوی۔
۷۔ جناب شیخ محمد اسحٰق صاحب نادرؔ دہلوی۔
۸۔ مولانا مولوی سعید الدین صاحب وفاؔ دہلوی۔
۹۔ جناب حافظؔ دہلوی۔
۱۰۔ جناب عبد الستار صاحب نعیمؔ دہلوی۔
۱۱۔ جناب حافظ عبد الغفار صاحب مفتونؔ دہلوی۔
۱۲۔ احقر واصفؔ دہلوی۔

(شیخ محمد اسحٰق صاحب نادرؔ دہلوی یہ وہ صاحب ہیں جن کے نانا مولوی قاسم علی صاحب مرحوم جناب سائلؔ مرحوم کے اتالیق اور استاد تھے۔)

(باقی آیندہ)

مولانا گیلانی کا ایک مکتوبِ گرامی

برہان اور اس کے مضامین سے متعلق دفتر میں اور مجھ کو یہاں آئے دن خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں لیکن کبھی کوئی خط شائع نہیں کیا جاتا۔ البتہ گذشتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے برہان میں نظرات کے زیر عنوان جس موضوع پر گفتگو کی گئی تھی اسے ملاحظہ فرما کر ہمارے مخدوم جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے جو والانامہ ارسال فرمایا ہے وہ کئی وجوہ سے بہت اہم ہے علی الخصوص اس وجہ سے کہ اس میں ایک خاص سوسائٹی کی تشکیل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ہمارے خیال میں نہایت ضروری ہے اس بناء پر ذیل میں یہ مکتوب گرامی بعینہٖ شائع کیا جاتا ہے

(ایڈیٹر)

۲۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفیع القدر، حبی الحبیب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔

سلمکم اللہ تعالےٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کل دسمبر کا برہان ملا۔ نظرات کی ہر ہر سطر میرے لئے مسرت وابتہاج کی مستقل موج بن گئی۔ مہاتما بدھیا کا ذکر تو آپ نے ایسے لفظوں میں فرمایا ہے کہ ان سے ملنے کی تمنا میری چند مستقل تمناؤں میں شریک ہو گئی آپ نے اسلام کی برحق ترجمانی کا حق ادا فرما دیا یہ نقطۂ نظر فقیر کی زندگی کا محوری مضمون ہے افسوس دنیا نے اسلام کو اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ دکھلانے والوں نے دکھایا کہ اسلام کی کتاب فطری دستور العمل کا صرف آخری اڈیشن ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں تو دوسری دنیا کی تیاریوں میں مصروف ہونے کی زندگی میں قدم رکھ چکا ہوں آپ لوگ ابھی جوان ہیں کام کی صلاحیت رکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ اسی اساسی مسئلہ کو موضوع بنا کر خاص سوسائٹی اگر قائم کی جائے اور مذاہب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا اور کرایا جائے تو بہت سی تلخیوں کا بھی سدباب ہو سکتا ہے اور گم شدہ فردوس شاید آدم کی اولاد کو تلاش کی اس راہ میں مل جائے آخر میں پھر تبریک وتہنیت کی عزت حاصل کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں حضرت شارح مسلم کی وفات ایک بڑے دیدہ ور عمیق النظر عالم کی وفات ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغفرلہ وارحمہ فقط مناظر احسن گیلانی

علامۃ العصر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کی یاد میں

ازجناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

ہمارے فاضل رفیق مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نہ صرف یہ کہ حضرت علامہ مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں بلکہ سالہا سال تک انہیں مرحوم کی معیت و رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے، اِن دنوں آپ ہی مرحوم کی جگہ جامعہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ہیں۔ (مدیر)

یا عین جُودی بعقد الدمع کالدرر — جودی بدمع فلا تبق ولا تذر
جودی بدمعٍ غزیرها مرھطلٍ — یزری بمزن ھمی من صیب المطر
جودی بدمعٍ شجیٍ ھائمٍ قلقٍ — جودی بفتح شئون غیر مدّخر
أحری العیون بأن تذری مدامعها — عین بکت خطبها من غیر مصطبر
أنعی الیک اماما عالما فطِنا — شیخا کبیرا جلیل القدر والفخر
أنعی الیک وحید الدھر عالمه — بحرا محیطا ملیئی القعر بالدرر
شَبیر احمد شیخ القوم قدوتھم — دعاہ ربّ کریم واسع القُدر
لبّا الاھا کریما اذ دعاہ ضحیً — ضیفا نزیلا غریبا راح فی سفر
محدّثٌ بارعٌ مفسّرٌ مدرّسٌ — حبرٌ کبیرٌ دقیق البحث والفِکَر
علامةٌ ذکنٌ فھّامةٌ لَسِنٌ — روض انیق جمیل النَوْر والزَهَر
محقّق العصر فی علم وفی حِکَمٍ — محدّث الدھر فی صَعْبٍ وفی حصر
فی قلبه علم قرآن وحکمته — یُبدی معارفه فی کل محتضَر
کم من مشاکل علم غاص لجّتها — وحلّها بدقیق الفکر غیر مقتصر

كم من دقائق بحث قام يكشفها ... كم من حقائق أبدت دقة النظر

إذا ارتقى فى أعالى الرأى لاح له ... ما فى الغيوب هنا من كل مستتر

تزيك نور الذكا سيماء غرته ... إذا تبلج فى مُستصعب الخبر

مفكر طالما أشجت بدائعه ... اولى النُهى ببديع الرأى كالزهَر

مُدبر طالما أذهت محاسنه ... فى كل معترك من كل مستعر

حلم وقار أناءة تُزيينه ... خِطابة منطق كاللؤلؤ النثِر

غور وفكر فراسة وحِليته ... خطابه فى الندى عقد من الدرر

أضحت لخطبته الألباب حائرة ... ترى سُكارى رحيق النطق من سكَر

يموج موجا كموج البحر ملتطما ... اذ قام حبرا خطيبًا ناشر الحِبَر

أضحت عبارته من حُسن عارضة ... تجلو الغياهب والاوهام كالقمر

بالفضل متّسم بالنُبل مُرتسم ... بالصدق معتصم فى كل مشتجر

بالعلم مدّثر بالفهم متزّر ... بالحزم مشتمل فى كل مغتمر

جلا الظلام بنور راق منظره ... بفتية ملهمة فى خدمة الأثر

فاحت بلاد بعرف من فوائده ... جاءت كدرّ يتيم غالى الدرر

تجلو غياهب ذى ذيغ إذا قرأت ... بحسن فكر وطبع صافى الكدر

حاز المفاخر والعلياء مرتديا ... بثوب عز رفيع طيّب عَطِر

له المفاخر فى الأعيان ناطقة ... له المآثر فى ذهو وفى نضر

له البدائع فى الافكار بادية ... له الروائع تترى عند ذى النظر

سل أرض هند فسند من مفاخره ... جاءتك ناطقة من كل مفتخر

سل دولة فى بسيط السند قائمة ... تنبيك دستوره بالدين فاعتبر

هو المشمّر فى تائيد مقصده ... حتى تأكد منه العقد بالبصر

خطب ألم علی الاسلام حین قضی — نحبا و أمر الوری لم یقض من وطر
فالقلب فی غمد والروح فی کمد — والنفس فی کبد والعین فی همر
ھذا الذی ملأ الآفاق سمعتہ — درسا و تألیف کتب خیر مدخر
ترثیہ جامعۃ تبکیہ عاصمۃ — جلیدۃ کمدا فی صیّب العبر
ترثیہ اقلام علم ثم محبرۃ — مدارس کتب مکاتب الزبر
یرثیہ منبرھم یبکیہ جامعہم — ترثیہ حفلتہم فی البدو والحضر
یا قلب مہ ھذہ دنیا و نعمتہا — تفنی سریعا وقد جاءتك بالعبر
یبقی الالہ ولا یبقی برتیتہ — فاصبر بصبر جمیل و ارض بالقدر
فکل حیّ من الدنیا مفارقہا — وکل جاء غریب جاء للسفر
یا رب انزل علیہ صوب غادیۃ — وطفا تسقی ثراہ فائض الدرر
وارفعہ عندك فی الفردوس منزلۃ — یأوی الی کنف فی غایۃ الحضر
وطفاء دیمتك المدرار فائضۃ — ترجی لمحلٍ من الغبراء مفتقر
ثم الصلاۃ علی خیر الوری أبدا — من جاء بالنور فی الظلماء للبشر

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

از جناب اسد ملتانی

حادثہ ایسا ہے مولانائے عثمانی کی موت — دل کو جس پر صبر آسانی سے آسکتا نہیں
جس کی تقریروں سے ہل جاتے تھے دنیا بھر کے دل — سامنے حکمِ قضا کے لب ہلا سکتا نہیں
وہ خطیبِ زندہ دل وہ عالمِ صاحب نظر — جس کا ثانی عالمِ اسلام پا سکتا نہیں
ایسا دل، ایسی نظر، ایسی زباں، ایسا دماغ — اتنا جوہر ایک پیکر میں سما سکتا نہیں
آسماں نے جسمِ خاکی کو ملایا خاک میں — لیکن اسکے نقشِ عظمت کو مٹا سکتا نہیں

سنہ۳۹ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول
لغت قرآن پر بے مثل کتاب طبع دوم قیمت للعہ، مجلد صہ
سرمایہ ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ
رفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن ۔ قیمت عہ
اسلام کا نظام حکومت ۔ اسلام کے ضابطۂ
حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث زیر طبع
خلافت بنی امیہ ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت ۲ہ
مجلد ۲ہ، مضبوط اور عمدہ جلد للعہ
سنہ۴۰ء: ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم
و تربیت ۔ جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید
کتاب قیمت للعہ، مجلد صہ
نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق تفصیل
کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت
سے اب تک ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و
تربیت کیا رہا ہے ۔ قیمت للعہ، مجلد صہ
قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ، مجلد سے
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی
قیمت للعہ، مجلد صہ
سنہ۴۱ء: قرآن اور تصوف ۔ حقیقی اسلامی تصوف
اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت
عا، مجلد سے

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات
کا بیان ——— زیر طبع
انقلاب روس ۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی
کتاب قیمت سے
سنہ۴۲ء: ترجمان السنہ ۔ ارشادات نبوی کا جامع
اور مستند ذخیرہ صفحات ۴۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹/۸ جلد اول
قیمت ۶ مجلد ۷
تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید و تحقیق
از مترجم و نقشہائے سفر قیمت سے
جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔ یوگوسلاویہ
کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز دلچسپ کتاب قیمت ۲ہ
سنہ۴۳ء مسلمانوں کا نظم مملکت ۔ مصر کے مشہور مصنف
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب
النظم الاسلامیہ کا ترجمہ قیمت ٹہ، مجلد شہ
مسلمانوں کا عروج و زوال طبع دوم قیمت ٹہ مجلد صہ
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم
قیمت للعہ، مجلد شہ
حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی ۔ قیمت ۶ر
مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے جس سے
آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی ۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

REGISTERED No. D 148

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت [illegible] ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت [illegible] در مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبا:۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں اُن کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید ایڈیشن جس میں نظرِ ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ے مجلد ۔

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیر طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم — زیر طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

سنہ ۱۹۴۰ء نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول۔ جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ قیمت ۸ مجلد ۱۲

فہم قرآن - جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو ازسرنو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ۳ مجلد ۳

غلامانِ اسلام - اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن قیمت ۸ مجلد ۸

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔ زیر طبع۔

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - جدید ایڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک۔ قیمت ۸ مجلد ۸

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیر طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت ۸

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن (زیر طبع)

سنہ ۱۹۴۲ء : قصص القرآن جلد دوم - حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا ایڈیشن ۔ مجلد ۔

اسلام کا اقتصادی نظام : وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا ایڈیشن ۸ مجلد ۸

مسلمانوں کا عروج و زوال : صفحات ۵۰۰ جدید ایڈیشن قیمت ۔ مجلد ۔

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید ایڈیشن قیمت ۸ مجلد ۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد قیمت ۔

بُرہان

جلد بست و چہارم — شمارہ (۲)

فروری ۱۹۵۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہمارا ملک ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ بن گیا اور نیا دستور جو خود ہندوستان نے اپنی
صوابدید اور اپنے رجحانات وافکار کے مطابق تیار کیا ہے نافذ ہو گیا اور اس طرح اس ملک کی تا
میں آئینی حیثیت سے ایک ایسے باب کا اضافہ ہوا جو بالکل نیا اور وقت کے تقاضوں سے بہم
ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس عالمِ کون وفساد کا یہ فطری قانون و دستور ہے کہ ہر خوشی اپنے کم
اور نوعیت کے اعتبار سے نئی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی لے کر آتی ہے۔ دو نوجوان زندگیاں ایک ر
ازدواج سے منسلک ہوتی ہیں تو انھیں مبارکباد پیش کی جاتی ہے رشتہ داروں اور دوستوں
مسرت کے شادیانے بجتے ہیں لیکن ان مسرتوں کا دوام و قرار اس پر موقوف ہوتا ہے کہ دو
ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو امانت و دیانت کے ساتھ انجام دیں۔ پھر دونوں ماں باپ
ہیں بچہ بڑا ہوتا ہے اس کی آمین بسم اللہ ہوتی ہے امتحان پاس کرتا ہے۔ ملازم ہوتا ہے ان میں
ہر مرحلہ ایک خوشی کا پیغام لاتا ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہر خوشی کے ساتھ ذمہ داریوں کی زنجیر
ایک نئے حلقہ کا بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔ وہ آزادی حاصل کرتی ہیں ایک قوم دوسری قوم
غلبہ پاتی اور اسے فتح کرتی ہے اور اسی کی تقریب میں جشن مسرت کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں
لیکن ان ہنگاموں کا شور و غل اور مسرت کے شادیانوں کی آواز جس قدر شدید اور تیز ہوتی
ہے وقت کا تقاضی اسی قدر چوکنا ہو کر اس قوم کی تقدیر مستقبل کا فیصلہ لکھنے کے لئے اپنا
سنبھال لیتا ہے جس طرح انفرادی زندگی میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر نئی ذمہ داری
مرحلے پر نئی قسم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک ہی طرح کی

ہیت ہر مرحلہ پر کام نہیں دیتی اسی طرح قومی زندگی میں ملک گیری سے لے کر ملک داری تک
ل اور منزل کے ہر موڑ پر ایک نئی قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اپنی عہدہ برآئی کے
قوم کی نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بہادر جرنیل جو میدان
ر میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے وہ صرف بہادر ہونے کی وجہ سے کامیاب حکمران نہیں ہو سکتا
شعلہ بیان مقرر محض اپنی شعلہ بیانی کے صدقہ میں میدانِ کارزار کا حریف نہیں بن سکتا ایک
مادیات کا ماہر اپنی علمی اور فنی قابلیت کے باتوں سے ملک کی معاشی واقتصادی زبوں حالی
ہیں کر سکتا۔ ایک حکمت وفلسفہ کا امام محض اپنی حقائق شناسی کے ذریعہ سوسائٹی کی گندگیوں
بوں کاریوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ٹھیک اسی طرح کوئی قوم محض آزاد و خود مختار ہو جانے کے
ت اس وقت تک اپنی آزادی وخود مختاری کو برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک کہ اس میں حکمرانی
ب داری کے اوصاف وکمالات موجود نہ ہوں۔

جمہوریت میں چونکہ حکومت کسی ایک خاص شخص یا کسی ایک گروہ یا طبقہ کی نہیں ہوتی بلکہ
ہ اہلِ ملک کی ہوتی ہے اس بنا پر اس کو کامیاب بنانے کے لئے اولین ضرورت اس کی ہے کہ
کا ہر فرد اپنے آپ کو شریک حکومت سمجھ کر اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کرے
ایک حکمران کے اندر ہونا ضروری ہے اور جن کے بغیر کوئی حکمران حکمران نہیں ہو سکتا یہ اوصاف
ں؟ اگر ان کو ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے تو صرف "انصاف" ایک ایسا لفظ ہے جو ان
اوصاف کو محیط اور ان کا جامع ہے جس طرح اس کی ضد ظلم اپنے ساتھ بھی ہوتا ہے اور غیر کے ساتھ
سی طرح انصاف خود اپنے نفس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے اور غیر کے ساتھ بھی! یہ اپنے اور غیر
ق محض اعتباری ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ تمام انسان ایک جسم کی مانند ہیں اس لئے قانونِ
ت ومکافات کے ماتحت اگر ایک شخص خودکشی کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے تو اس نے صرف
نفس پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے بال بچوں پر۔ اپنے عزیزوں قریبوں پر یہاں تک کہ پوری سوسائٹی

پر ظلم کیا ہے علیٰ ہذا القیاس اگر ایک شخص نے کسی کو قتل کر کے غیر پر ظلم کیا ہے تو صرف غیر
نہیں بلکہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے بس بعینہٖ یہی حال انصاف کا ہے. فلسفہ کے نقطۂ نظر سے ا
پر بحث کرنا کہ اچھائی یا برائی وصف داخلی ہے یا خارجی محض تضییع وقت ہے جو اچھا ہے وہ
کے لئے اچھا ہے اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی اسی طرح جو برا ہے وہ غیروں کے لئے برا
ہے اور خود اپنے واسطے بھی! اس بناء پر جب ہم کسی سے یہ کہتے ہیں کہ دوسروں پر ظلم نہ کرو ان
ساتھ انصاف کرو تو اس میں خود غرضی کا ذرا شائبہ نہیں ہوتا بلکہ اس کہنے کا دراصل مطلب یہ ہوتا
کہ تم اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور اپنے ساتھ انصاف کرو۔ بطور جملہ معترضہ کے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن
انداز خطاب یہی ہے چنانچہ اس نے جگہ جگہ اہل کتاب کو مخاطب بنا کر ان سے کہا ہے کہ تم اگر قرآن
ایمان نہیں لاتے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم توراۃ اور انجیل پر ایمان نہیں رکھتے ورنہ یہ سب
ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں. پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ایک کو مانو اور دوسرے کو نہ مانو. پس
تم پیغمبر اسلام کی تکذیب کرتے ہو تو یہ صرف ان کی تکذیب نہیں بلکہ تم خود اپنے پیغمبر اور اپنی کتاب کو بھی جھٹلا

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی جمہوریہ اسی وقت صحیح معنی میں کامیاب اور مثالی جمہوریہ ہو سک
جب کہ اس کے عوام وخواص میں مکمل احساس یگانگت ہو، ہر شخص دوسرے کے دکھ درد کو اپنا
درد اور دوسرے کی خوشی اور آرام کو اپنی خوشی اور اپنا آرام سمجھے اور حضرت شیخ سعدی کے مشہو
آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند کے مطابق غیر کے لئے کسی ایسی بات کو گوارا نہ کرے جو وہ خو
لئے گوارا نہیں کر سکتا تھا. حکومت کی استواری انصاف پر موقوف ہے اور انصاف اسی وقت
ہے جب کہ من و تو کے احساس بیگانگت کو ختم کر کے مساوات و برابری کا احساس و شعور پید
جائے. ہندوستان کو جمہوریت صد مبارک لیکن مستقبل بتائیگا کہ اس ملک کے باشندوں نے جمہو
کے واجبات و مطالبات کو پورا کر کے کس حد تک اس نعمت غیر مترقبہ کی قدر کی اور اپنے آپ کو اس
واقعی اہل ثابت کیا ہے!!

تدوین حدیث

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

"اس محاضرے میں جن معلومات کا تازہ کرنا اور پڑھنے والوں کے دماغ میں جن کو حاضر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے دین اسلامی کے اس حصہ میں جو البینات کہلاتے ہیں اور وہ حصہ جو البینات کی حیثیت نہیں رکھتا دونوں کے مطالبت میں جو فرق مسلمانوں کے نزدیک پیدا ہو گیا ہے یہ کسی اتفاقی واقعہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے قصداً وارادۃً ایسی تدبیریں عہد نبوت وخلافت میں اختیار کی گئیں جن کا یہ قدرتی اور منطقی نتیجہ ہے عہد نبوت میں حدیثوں کا قلم بند ہونا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو سارے مکتوبہ مجموعوں کو آپ نے نذر آتش کرادیا اور حدیثوں کی کتابت کی عام ممانعت کردی گئی، مگر بعض خاص وجوہ سے انفرادی طور پر ایک دو صحابیوں کو اجازت مرحمت ہوئی

آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں خود ایک مجموعہ حدیثوں کا قلم بند فرمایا جس کی ضخامت امام مالک کے موطاء کے برابر تھی، مگر انھوں نے بھی اس نسخہ کو جلا دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حدیثوں کے قلم بند کرانے کا ارادہ کیا، مگر اس ارادہ سے بالآخر دست بردار ہو گئے اور ان کے زمانے تک جن جن لوگوں نے حدیثوں کو قلم بند کیا تھا، سب کو منگوا کر جلوا دیا یوں تحریق یعنی حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا تین دفعہ یہ واقعہ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ دین کے غیر بینا تی حصہ کے متعلقہ اختلافات میں رواداری کے جذبات کی پرورش اس کے متعلق عہد نبوت اور عہد خلافت میں جو کچھ کیا گیا اس کی تفصیل، عہد عثمانی میں سبائی فتنے کا ظہور، جعلی حدیثوں کا رواج، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا اس فتنے کی طرف توجہ، صحیح و غیر صحیح حدیثوں کی تمیز کے لئے حضرت علی کی طرف سے درایت کا معیار مسلمانوں کو عطا کیا گیا مگر یہ معیار بھی

کافی نہ ہوا تب "اسماء الرجال" کے فن کی ترتیب کا الہام مسلمانوں کو ہوا اور اسی کی بدولت روایت کا نیا معیار پیدا ہوا جس نے ہمیشہ کے لئے اس سوراخ کو "الدین الخاتم" میں بند کر دیا جس کی راہ سے گذشتہ مذاہب میں ہمیشہ متھالوجی (خرافات) وغیرہ چیزیں داخل ہوتی رہتی تھیں۔" (مناظر احسن گیلانی)

جیسا کہ مسلسل عرض کر چکا ہوں کہ اُمت کو اپنے پیغمبر سے جو دین ملا ہے اس کا ایک حصہ تعامل و توارث کی قوت کی پشت پناہی میں نسلاً بعد نسل بغیر کسی انقطاع کے اگلی نسلوں سے پچھلی نسلوں میں تواتر و توارث کے قانون کے تحت اس طریقہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس کے متعلق اس قسم کا شبہ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہنچایا ہوا ہے یا نہیں، اسی قسم کا شبہ ہے کہ کسی کو خود پیغمبر ہی کے متعلق یہ مالیخولیا ہو جائے کہ واقع میں اس نام کے کوئی آدمی تھے بھی یا نہیں یا تھے تو رسالت کا انھوں نے دعویٰ بھی کیا تھا یا نہیں، ظاہر ہے کہ جنونی اختلال سے پہلے اس قسم کے شکوک کی کسی صحیح دماغ میں قطعاً گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی، قرآن اور قرآن کے عملی مطالبات کے تشکیلات اور اس نوعیت کی چیزوں کا یہی حال ہے، یا بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق اس قسم کی ناقابل تزلزل یقین و قطعیت کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے متعلق شک اندازی بھی آسان نہیں ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسح خفین یعنی موزے پر وضو میں مسح کے متعلق اس قسم کے الفاظ جو منقول ہیں۔

اخاف الکفر علی منکر المسح علی الخفین — خفین (یعنی موزے) پر مسح کے انکار کرنے والوں پر مجھے کفر کا اندیشہ ہے۔

یا امام صاحب ہی نے اسی کے متعلق ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ

لم اقل بالمسح علی الخفین حتی جاء نی مثل ضوء الصبح — خفین (موزے) پر مسح کرنے کا فتویٰ اس وقت دیا جب صبح کی روشنی کی شکل میں یہ مسئلہ میرے سامنے آگیا۔

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ گو قرآن میں ارجل یعنی پانی کے دھونے کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کا بظاہر مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ براہ راست وضو میں پاؤں کو دھونا چاہئے، ظاہر ہے کہ بجائے دھونے کے خود پاؤں نہیں بلکہ اس کپڑے کو تر ہاتھ سے چھو لینا یعنی مسح خفین کو کافی قرار دینا قرآنی مطالبہ میں گویا

ایک طرح سے ترمیم کی شکل پیدا ہوجاتی ہے اور قرآنی مطالبہ میں ہلکی سی ترمیم بھی کسی ایسی ہی چیز سے ممکن ہوسکتی ہے جو قطعیت اور یقین آفرینی میں اس کے مساوی ہو۔ امام صاحب کی پریشانی کا منشا اس مسئلہ میں واقعہ کی یہی صورت تھی، لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ

قد ثبت عن سبعین صحابیا   (مسح خفین) ستر صحابیوں (کی روایتوں) سے

من شئتی وغیرہ منشئ   ثابت ہوئی۔

تب امام کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

بہرحال دین کے ان بیّنات یا بیّنات کے قریب جو چیزیں ہیں، ان کے سوا دین ہی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے گو منسوب کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن شروع میں پیغمبر کی طرف منسوب کرکے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے حتیٰ کہ بسا اوقات صحابہ کے طبقہ میں یا ان کے بعد بھی ایک دو آدمی سے زیادہ اور کسی سے وہ نہیں سنی گئی ہیں، اصطلاحاً ان ہی چیزوں کا نام خبر آحاد رکھ دیا گیا ہے سوال یہی ہے کہ جب ان کا بھی دین ہی سے تعلق تھا وہ بھی پیغمبر ہی کی عطا کی ہوئی چیزیں تھیں یعنی قرآنی حکم

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم   رسول نے جو کچھ تمہیں دیا اُسے لے لیا کرو، اور جس

عنہ فانتھوا   سے روکا اس سے رک جاؤ۔

کے ذیل سے ان کو خارج نہیں کیا جاسکتا ہے، تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ چند محدود افراد ہی تک ان کی روایت محدود ہوگئی؟

علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر میں اس سوال کو اٹھایا ہے اور خود ہی پھر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہی بات یعنی چند خاص افراد ہی تک ان روایتوں کا محدود رہنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق تبلیغ عام کی کوشش نہیں کی، وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کی اشاعت عمومی رنگ میں فرمائی ہو، لیکن بیان کرنے والے اس کے ایک دو آدمی ہوں انھوں نے اس موقعہ پر رویتِ ہلال (چاند دیکھنے) کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ اپنے مطلب کو اسی مثال سے واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک بڑا مجمع چاند کو ڈھونڈ رہا ہو، اور آسمان میں کسی قسم کی علت (یعنی گرد و غبار وغیرہ) بھی نہ ہو اور چاند کے ڈھونڈنے والوں میں ہر ایک چاہ رہا ہے کہ چاند پر اس کی نظر پڑ جاتے، ہر ایک کو اسی کی لو لگی ہوئی ہے۔ مگر باوجود اس کے صرف چند آدمی اکّے دکّے تو چاند کو دیکھ پائیں لیکن دوسرے لوگ جن کی آنکھیں صاف ستھری بھلی چنگی تھیں ان کی نظر چاند پر نہ پڑے (ایسا نہیں ہو سکتا، ج ۱ ص ۲۸۲) ایسی صورت میں جصاص کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا پڑے گا:"

"یہ چند اکّے دکّے جنہوں نے چاند دیکھنے کا دعویٰ (اس مجمع کے بیچ میں) ان عام نہ دیکھنے والے کے مقابلہ میں جو کیا ہے، قطعاً کسی نہ کسی غلطی کے شکار ہیں، یا یہ ہوا ہے کہ خیالی چاند کو انھوں نے چاند سمجھ لیا ہے یا اگر یہ نہیں ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

علامہ کا مقصد یہ ہے کہ جیسے رویتِ ہلال کے مسئلہ میں یہی فیصلہ عقل کا ایک فطری فیصلہ ہو گا، بجنسہ اسی طرح ایسی بات جس کی عام اشاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لوگوں میں کی گئی ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی عام پھیلائی ہوئی خبر کو صرف ایک دو آدمی ہی بیان کریں، وہ لکھتے ہیں کہ

غیر جائز علیہا ترک النقل والاقتصار علی ما ینقلہ الواحد بعد الواحد

اس قسم کی خبر کے متعلق یہ جائز نہ ہو گا کہ عام لوگوں نے اس کی اشاعت و نقل ترک کر دی ہو، اور ایک سے ایک اس کو روایت کرے۔

پس معلوم ہوا کہ خبر الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو چیزیں امت تک منتقل ہوئی ہیں، درحقیقت پیغمبر ہی ان کی عام تبلیغ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ عوام سے عمومی طور پر ان کا مطالبہ ہی مقصود نہ تھا۔ اگر ان کی تبلیغ میں بھی عمومیت کا رنگ پیدا کر دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ جو کیفیت اس وقت ان میں پائی جاتی ہے یہ باقی نہ رہتی بلکہ عمومی تبلیغ کی وجہ سے بجائے ایک دو کے ان کے بیان کرنے والوں کی تعداد ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کے برابر ہو جاتی جن کی تعمیل کا مطالبہ ہر مسلمان سے کیا گیا ہے جو قطعاً خلاف مقصود بات ہوتی۔

اس باب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ تراویح

کی نماز دو تین دن پڑھنے کے بعد آپ نے ترک فرمادی، اور وجہ ترک کی بھی بیان فرمائی کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں فرضیت کی شکل یہ نماز نہ اختیار کرلے۔ یہ حج کے متعلق پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا ہر سال مسلمانوں پر حج فرض کیا گیا ہے؟ آں حضرت اس سوال پر خاموش ہوگئے۔ لیکن پوچھنے والے صاحب نے دوسری دفعہ تیسری دفعہ جب سوال کو دُہرایا تب آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ ہر سال فرض نہیں ہے آگے اسی طریقۂ تبلیغ کی خصوصیتوں کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ

"جن باتوں کو میں چھوڑ دیا کروں تم لوگ بھی اُن کو چھوڑ دو"

بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"میں اگر ہاں کہہ دیتا تو پھر ہر سال حج مسلمانوں پر فرض ہوجاتا اور وہ تمہارے بس کی بات نہ تھی دیکھو! تم سے پہلے قومیں اسی کثرتِ سوال اور پوچھ گچھ کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔

خود قرآن ہی میں مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا کہ ایسی باتیں نہ پوچھا کریں جو اگر بتادی جائیں تو تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی، اور آخر میں اعلان کردیا گیا قرآن میں اعلان کرایا گیا کہ

عفا اللہ عنہا ان اللہ غفور رحلیم (مائدہ) معاف کرچکا ہے اللہ ان باتوں کو قطعاً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان دشواری میں نہ مبتلا ہوجائیں، اسی لئے بہت سی باتوں سے قصداً خاموشی اختیار کی گئی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں پائی جاتی ہے یعنی فرماتے کہ

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحد حدوداً فلا تعتدوھا وحرم اشیاء فلا تقربوھا وترک اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوھا (جمع الفوائد بحوالہ رزین)

بیح مح اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں تو انھیں کھوؤ مت اور اسی نے کچھ حدود مقرر کئے ہیں، ان کو پھلانگنا مت، اسی نے کچھ چیزیں تم پر حرام کی ہیں تو ان کے نزدیک نہ پھٹکنا اور اسی اللہ نے کچھ چیزیں چھوڑ بھی دی ہیں یعنی ان کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے) اور ایسا بھول کر نہیں کیا ہے تو ان کو کریدنا مت۔

اور بعض باتوں کا اس سلسلہ میں ذکر بھی فرماتے تو خاص خاص لوگوں سے فرماتے، ابوہریرہ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح کی باتیں یاد کی ہیں جنہیں لوگوں میں میں نے پھیلا دی ہیں وہ صرف ایک قسم کی چیز ہے، عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہا کرتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ساری باتوں کو میں لوگوں سے اس لئے نہیں بیان کرتا کہ جو نہیں جانتے ہیں وہ خواہ مخواہ میری مخالفت کریں گے (جمع الفوائد ص۲۲)

حذیفہ بن یمان تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی تھے جن سے آپ نے بہت سی باتیں فرمائی تھیں جو دوسروں کو معلوم نہ تھیں، خصوصاً آئندہ پیش آنے والے حوادث و واقعات کا خصوصی علم حذیفہ کے پاس تھا، بکثرت حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کسی صحابی سے آپ نے حدیث بیان کی اس نے اجازت چاہی کہ لوگوں میں اس کی اشاعت کروں آپ نے منع کر دیا حضرت معاذ بن جبل ابوہریرہ اور بھی دوسرے صحابیوں سے اس قسم کی روایتیں نقل کی گئی ہیں اور عام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، بلکہ متعدد اصحاب مثلاً زبیر بن العوام، سعد بن وقاص، زید بن ارقم وغیرہ سے ایسی روایتیں کتابوں میں جو پائی جاتی ہیں کہ لوگوں نے ان بزرگوں سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے تو فرماتے کہ حدیثیں تو ہم نے بھی سنی ہیں، ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں سالہا سال تک رہتے لیکن خوف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے جس کی سزا سخت ہے، صحابہ کے ان اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان معلومات کی نام اشاعت کے مشغلہ میں مصروف ہو کر خواہ مخواہ اس خطرے کو کیوں خریدیں جس سے بڑا ایمانی خطرہ مشکل ہی سے کوئی ہو سکتا ہے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کا انتساب کا جرم صرف خود ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس قسم کی حدیثوں کی عام اشاعت سے صحابہ اپنے زمانہ میں منع کیا کرتے تھے، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح مسلم میں یہ روایت منقول ہے کہ لوگوں کو اس کی تاکید کیا کرتے تھے کہ عام لوگوں کی سمجھ سے جو باتیں باہر ہوں ان کا ان سے ذکر نہ کرنا چاہئے، ورنہ بعضوں کو فتنہ میں یہی باتیں مبتلا کر دیں گی (مسلم) حضرت علی کا تو یہ قول مشہور ہی ہے، یعنی

حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ (بخاری وغیرہ)
عام لوگوں سے دینی باتیں بیان کیا کرو جنہیں وہ جانتے پہچانتے ہوں کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کو جھٹلا دیا جائے۔

رمی نے حضرت علی کے خطبہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے جس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ

ان الفقیہ حق الفقیہ من لم یقنط الناس من رحمۃ اللہ
سب سے بڑا سمجھ والا آدمی وہی ہے جو عام لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے۔

ر بخاری وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تاکیدی لہجہ میں صحابہ کو حکم دیا کرتے تھے
یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا (بخاری ومسلم)
آسانی اختیار کیا کرو، دشواری میں لوگوں کو مبتلا نہ کرنا خوش خبریاں سنایا کرو، (ایسی باتیں نہ کیا کرو) جن سے لوگوں میں نفرت پیدا ہو اور وہ بھاگ جائیں۔

سہل بن حنیف صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کر کے ان الفاظ کو بیان کرتے تھے عام لوگوں کو خطاب کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے،

"لوگو اپنے اوپر سختی نہ کیا کرو، تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں اسی لئے تباہ ہوئیں . . . .
کہ اپنے اوپر انھوں نے سختیاں کیں، ان لوگوں کی بچی کھچی یادگاریں اب بھی تم لوگوں کو کلیساؤں اور دیارات (عیسائیوں کی خانقاہوں) میں مل سکتی ہیں۔ جمع الفوائد ج ۱ ص ۲ بحوالہ طبرانی فی الکبیر والاوسط

بہرحال علامہ ابوبکر جصاص نے نکتہ کی بات جو سمجھی ہے یعنی ایسی ساری روایتیں جن کے بیان کرنے والے اسلام کے ابتدائی دور (عہد صحابہ وتابعین) میں گنتی کے چند آدمی بلکہ بسا اوقات ایک ہی آدمی ہیں، اصطلاحاً جن روایات کا نام خبر آحاد ہے یا جصاص نے "خبر الواحد بعد الواحد" کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی ہے، اپنی کتاب "الرسالہ" میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علم الخاصہ من خبر الخاصہ (الرسالہ) یا "خبر الواحد عن الواحد حتی ینتہی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یعنی ایک نے ایک سے سنا تا اینکہ اسی طرح یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہو) وغیرہ الفاظ سے

ان کو موسوم کیا ہے، یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا وہی حصہ ہے جس کی عام اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے ان کا ذکر بھی عام لوگوں سے نہیں بلکہ خاص خاص صحابیوں سے فرمایا گیا۔

بہر حال دین کے بنیادی وغیر بنیادی حصوں میں مطالبہ اور گرفت کی قوت وضعف کے لحاظ سے مدارج ومراتب کے جس فرق کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرنا چاہتے تھے، اس کی یہی تدبیر تھی جو اختیار کی گئی تھی، یعنی بنیادی حصہ کی تو عام اشاعت کا انتظام کیا گیا اور اسی کے مقابلہ میں غیر بنیادی چیزوں کے متعلق اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان میں عمومیت کا وہ رنگ نہ پیدا ہو، جو ان کو بنیادی عناصر واجزاء کے ساتھ مشتبہ کر دے۔

لیکن مراتب کے اس فرق کو پیدا کرنے میں نبوت کی اور نبوت کے بعد نبوت کے کاموں کی تکمیل کرنے والے بزرگوں یعنی خلفاء راشدین کی نگرانیاں کیا اسی حد تک محدود تھیں، واقعات سب ہی کو معلوم ہیں، لیکن ان کے اسباب کیا تھے، تفصیل کے ساتھ لوگوں نے اس کے سمجھنے کی کوشش جیسی کہ چاہیے شاید نہیں کی۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے والوں کی طرف سے پہلی بات جو پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیثیں لکھی نہیں گئیں، بلکہ لکھنے کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کر دی تھی، میرا اشارہ صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث کی طرف ہے یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

من کتب عنی غیر القرآن شیئاً فلیمحہ (۲) جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے تو چاہئے کہ اس کو مٹا دے

مگر میں کہتا ہوں کہ دوسری کوئی روایت اگر نہ بھی ہوتی صرف یہی ایک حدیث اور اس حدیث کے یہی الفاظ بھی ہوتے تو اسی کو عہد نبوت میں کتابت حدیث کا وثیقہ بنایا جا سکتا ہے، یعنی اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو آنحضرت کی زندگی ہی میں آپ ہی کے

زمانہ میں صحابہ قلمبند کرنے لگے تھے آخر خود غور کیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ من کتب عنی غیر القرآن (جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے) کیا اپنے الفاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اطلاع نہیں دے رہے ہیں کہ بعض لوگوں نے قرآن کے سوا بھی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے عہد نبوت میں حدیث کے عدم کتابت کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں یہ تو الگ بات ہے مگر حدیث عہد نبوت میں بھی لکھی جا چکی تھی اس کی شہادت تو بہرحال اس سے فراہم ہوتی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ عدم کتابت کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے صرف حدیث کے اتنے الفاظ کافی نہیں ہیں بلکہ دعوی کرنے والوں پر اس کا بار ثبوت ہے کہ پیغمبر کے اس حکم کی صحابہ نے تعمیل بھی کی میں یہ نہیں کہتا کہ پیغمبر کے حکم کی صحابہ تعمیل نہ کرتے تو اور کون کرتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس حدیث کو آپ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرما رہے ہیں اس میں تو اس کا ذکر نہیں ہے، یعنی اس میں یہ نہیں ہے کہ حضور کے اس ارشاد کے بعد لوگ لکھنے سے رک گئے، اور جن کے پاس حدیثوں کا جو لکھا ہوا سرمایہ تھا اسے انھوں نے مٹا دیا یا ضائع کر دیا، البتہ صحابہ کے عام حالات کی بنیاد پر یہ استنباطی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کو جب حکم دیا گیا تھا تو اس حکم کی تعمیل چوں کہ انھوں نے ضرور کی ہوگی اس لئے ماننا چاہئے کہ اس حکم کے بعد حدیثوں کی کتابت کا سلسلہ بھی رک گیا، اور جو کچھ لکھا گیا تھا اُسے ضائع کر دیا گیا۔ پس اصل حدیث کے ساتھ جب تک اس بیرونی اضافے کو نہ جوڑا جائے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس خارجی اضافے کے بعد بھی جو کچھ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کا اثبات مشکل ہے آخر زیادہ سے زیادہ کہنے والے یہی تو کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ کی تعمیلی جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا چاہئے کہ لکھنے کے بعد جن جن لوگوں کو اپنی مکتوبہ حدیثوں کے مٹانے یا ضائع کرنے کا موقعہ ملا انھوں نے ضائع کر دیا ہوگا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ہر ایک کو اس کا موقعہ ضرور ہی ملا ہوگا۔ آخر ان ہی لکھنے والوں میں جن کی وفات ہو چکی ہوگی، اگر کوئی مسودہ ان کے گھر میں پڑا رہ گیا ہو یا وفات ہی نہیں تبدیلی مقام مثلاً مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ بعضوں کی رسائی

اپنے لکھے ہوئے مسودات تک آسان نہ ہو، اسی قسم کے دوسرے موانع بھی پیش آ سکتے ہیں اور
یہ ساری باتیں اس وقت ہیں جب یہ مان لیا جائے کہ جن لوگوں کو یہ حکم دیا گیا تھا ان میں ہر ایک
تک نبوت کا یہ ارشاد پہنچ بھی گیا اور جن تک پہنچا انھوں نے یہ یقین بھی کر لیا ہو کہ اس حکم کی تعمیل
واجب ہے حالانکہ اس کا ثابت کرنا بھی آسان نہیں ہے[1]۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا حکم کیوں دیا گیا تھا، جہاں تک میں جانتا ہوں عموماً اس کے
تفصیلات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے کہ عہد نبوت
جو جاہلیت سے بالکل متصل عہد تھا، اس میں نوشت و خواند، کتابت کے ساز و سامان کی بھی عرب
میں بہت کمی تھی، اور ایسے لوگ جو لکھنا جانتے ہوں صحابہ میں محض گنتی کے چند آدمی تھے، ان
ہی عام سطحی معلومات سے متاثر طبائع نے سمجھ لیا کہ عہد نبوت میں حدیثیں اگر کچھ لکھی بھی گئی ہونگی
تو ان کے لکھنے والے گنے چنے چند صحابی ہی ہوں گے حالانکہ جہاں تک واقعات اور روایات

---

[1] آخر لکھے ہوئے الفاظ کے مٹانے ہی کا تو وہ قصہ ہے جس کا صلح حدیبیہ کے صلحنامہ کے سلسلہ میں ذکر کیا جاتا ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے الفاظ حضرت علی لکھ لیتے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت علی
کو حکم دیتے ہیں کہ ان الفاظ کو مٹا دو، مگر حضرت علی تعمیل سے قطعی طور پر اپنے آپ کو معذور بتاتے ہیں اور ان مکتوبہ الفاظ کے
مٹانے کی حکم کی حضرت علی تعمیل نہیں کرتے ہیں، ظاہر ہے حضرت علی کا تعمیل حکم سے گریز یا انکار کسی سرکشی اور بغاوت
پر مبنی نہ تھا بلکہ اس انکار میں تعمیل کا ایسا عمیق جذبہ پوشیدہ تھا جس پر ہزاروں تعمیلی جذبات قربان کر دیے جا سکتے ہیں
یہ تو موقعہ اور محل کی بات ہوتی ہے بسا اوقات انکار ہزار ہا اقرار پر بھاری ہو جاتا ہے حکم دینے والے اور جنہیں حکم دیا
گیا جس حال میں دیا گیا اور جس چیز کا حکم دیا گیا ہو ان ساری خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے موقعہ پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے
کون کہہ سکتا ہے کہ بعض صحابہ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اشاعت عام کا رنگ ان حدیثوں میں نہ پیدا ہو، اس لئے مکتوبہ حدیثوں
کے مٹانے کا حضور نے حکم دیا ہے۔ چونکہ میری مکتوبہ حدیثوں سے اشاعت عام کی کیفیت پیدا نہ ہو گی اس لئے
میں نہ مٹاؤں تو کیا حرج ہے۔ بہر حال سب سے بڑی دلیل جو مخالفین حدیث کی طرف سے حدیثوں کی بنیاد کو متزلزل
کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنے گوناگوں احتمالات سے وہ بھری ہوئی ہے ۱۲

کا تعلق ہے، واقعہ کی صورتِ حال اس سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔

نوشت وخواند اور اس کے جاننے والوں کے قحط وقلت کی غلط فہمیوں کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا، اس کتاب میں بھی اور دوسری کتابوں میں بھی ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں اسی کتاب میں کسی جگہ اس کی بحث آچکی ہے۔ غالباً ناظرین کے دماغ میں ابھی وہ معلومات تازہ ہوں گے اس لئے اس سے قطع نظر کرتے ہوتے میں آپ کے سامنے بعض نئی روایتیں اسی سلسلہ کی پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ یہ جو اس موقعہ پر عموماً سمجھ لیا گیا ہے یا اب بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت کا تعلق محض معدودے چند محدود افراد سے ہوگا معلومات سے کتنی ناواقفیت پر یہ خیال مبنی ہے۔ سنئے مجمع الزوائد میں ہیثمی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے معمولی لوگ نہیں ہیں بلکہ "رجالہ رجال الصحیح" (اس روایت کے بیان کرنے والے سب صحیح بخاری کے راوی ہیں) یہ ہیثمی کے بجنسہ الفاظ اس روایت کے راویوں کے متعلق ہیں بہر حال عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کی یہ روایت ہے، میں بجنسہ ان کے الفاظ ہی نقل کردیتا ہوں۔

قال کان عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناس من اصحابہ وانا معھم وانا اصغر القوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کذب علیّ متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار، فلما خرج القوم قلت کیف تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد سمعتم ما قال وانتم تنھمکون فی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضحکوا وقالوا یا ابن اخینا ان کل ما سمعنا منہ عندنا	عبداللہ بن عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آپ کے صحابیوں میں سے کچھ حضرات تھے میں بھی ان ہی میں تھا، اور ان سب سے عمر میں چھوٹا میں ہی تھا، (اسی مجلس میں)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان بوجھ کر جو میری طرف جھوٹ کو منسوب کرکے بیان کرتا ہے اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے (عبداللہ کہتے ہیں) کہ مجلس مبارک سے لوگ جب باہر نکل آئے تو میں نے کہا کہ آپ لوگ

نی کتاب

رواہ الطبرانی (مجمع الزوائد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے باتیں بیان کرتے ہیں ایسا کیوں کرتے ہیں جب رسول اللہ سے سن چکے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا فرمایا حالانکہ آپ لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کرکرکے باتیں بکثرت بیان کرتے ہیں (عبد اللہ کہتے ہیں) کہ میری بات سن کر (سننے والے صحابہ) ہنسنے لگے اور بولے کہ میرے بھائی کے بیٹے! ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا ہے وہ سب کتاب میں ہے یعنی نوشتہ اور لکھا ہوا ہے،

مذکورہ بالا روایت کے الفاظ ہی میں نے پیش کر دیے ہیں، کیا اس سے حسب ذیل نتائج نہیں

۱۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب عبد اللہ بن عمرو بن العاص کمسن تھے۔[1]

۲۔ عبد اللہ بن عمرو کی کمسنی کے زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو صحابہ لکھ لیا کرتے تھے۔ کل ما سمعنا منہ عندنا فی کتاب" کل کا لفظ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔

پس اگر یہ واقعہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سُنی ہوئی بات کو ایک دو آد نہیں، بلکہ عموماً سننے والے لکھ لیا کرتے تھے اور ان کے اس طریقہ کار کو اسی حال پر چھوڑ دیا تو مذہب کے ساتھ انسانی نفسیات کا جو تعلق ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہ بالآخر اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ غور کرنا چاہیئے کہ ان نتائج میں جو ان حدیثوں سے پیدا ہوتے ان میں ا صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ عام کی راہ سے مسلمانوں میں جن چیزوں کی اشاعت فرما رہے تھے ان دو سے پیدا ہونے والے نتائج میں کیا کوئی فرق باقی رہ سکتا تھا؟

---

[1] اگرچہ بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے کہ اپنے باپ عمرو بن العاص سے پہلے بیعت اسلام کے شرف سے مشرف ہوئے ان کو ملا لیکن پھر بھی ان کی عمر کا حساب کرنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد یہ مدینہ منورہ ہی پہنچ کر مسلمان ہوئے

قرآنِ حکیم کے لفظی و معنوی حقوق

(۲)
تلاوت، فہم، عمل

(جناب خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب اسحاقی رحمانی سہارن پوری)

قرآن مبین ان اصحاب کے سامنے نازل ہوا۔ ان کی زبان میں اور ان کے محاورات پر نازل ہوا۔ اور ان کے لئے نازل ہوا۔ اور پھر ان ہی کے ذریعہ اور واسطہ سے سلسلہ بہ سلسلہ ہر قرن اور صدی میں ایک سے دوسرے تک پہنچا۔ قرآن حکیم کی آیات، اس کے احکام، اوامر و نواہی اخلاقیات و معاملات، بصائر و عبر جملہ امور تنزیل کے اولین مخاطب یہی اہل لسان اور اہل عرب ہیں، اور دوسرے جو کوئی بھی ہوں، اور جب کبھی کبھی ہوں ان ہی کے واسطہ سے قرآن پاک کے مخاطب بنتے ہیں۔

گویا حضرات صحابہ جو قرآن و علوم و اعمال قرآنی کے اولین مخاطب اور آشنا ہیں، درمیانی ذریعہ اور واسطہ ہیں اور قرآنی سلسلہ کے اولین رابطہ ہیں۔

انھوں نے قرآن حکیم کو جس طرح سُنا، جانا، سیکھا، پڑھا، یاد کیا، محفوظ رکھا اور عمل ہوتے دیکھا، بلا نقص و زیادت اور بغیر تبدل و تغیر اسی طرح تلاوت کیا۔ پڑھ کر سُنایا، سکھایا یاد کرایا اور خود اس پر عمل کیا اور اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے نقل کیا اور اپنے بعد والوں کو پہنچایا اور عمل کر کے دکھلایا اور ختم رسالت کے منصب تبلیغ اور حق صحابیت کو کما حقہ دیانتداری و راستبازی کے ساتھ ادا کیا۔

صحابہ سے تابعین نے، اور تابعین سے تبع تابعین اور ان سے مابعد کے علمائے قرآن و تفسیر نے سلسلہ بہ سلسلہ کلام رب کے نظم و معانی اور آیات و مفاہیم کو تواتر کے ساتھ نقل

کیا اور الحمد للہ کہ اس سلسلہ کا علمی تواتر اور عملی توارث زمانہ کے ہر دور میں نزول قرآن کے ابتدائی زمانہ سے اسی طرح قایم و جاری رہا اور رہتی دُنیا تک ہمیشہ رہے گا تاوقتیکہ روئے زمین پر صدق دل سے اللہ اللہ کرنے والا کوئی متنفس باقی رہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است　　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

قرآنِ پاک کے نظم و معانی دونوں منجانب اللہ ہیں۔ اس کی حفاظت و صیانت اور تدوین و ترتیب اور بیان و تفہیم سب خدا ہی کے ذمہ ہے اور اسی کا کام ہے جس کا یہ کلام ہے۔ قرآن کریم شروع سے آخر تک "الحمد للہ" سے "من الجنۃ والناس" تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے آیتوں اور سورتوں کی اسی موجودہ ترتیب کے ساتھ آپ کے صحابہ کو پہنچا۔

قرآنِ حکیم کے نزول کی نسبت درمنثور میں دو روایتیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ ماہ رمضان میں تمام قرآن مجید لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر بیت العزت یا بیت المعمور میں رکھا گیا۔ پھر وہاں سے مدت نبوت یعنی ۲۳ سال میں نجماً نجماً حسب مواقع و حوادث نازل ہوا۔

دوسری روایت ابن جریجؒ کی ہے کہ جتنا حصہ قرآن مجید کا سال بھر میں نازل ہوتا وہ ایک بار ہی رمضان کی لیلۃ القدر میں آسمان دنیا پر اُتار دیا جاتا اور پھر وہاں سے نجماً نجماً سال بھر میں اُترتا رہتا تھا۔ ہر سال اسی طرح سے ہوتا تھا۔

جب وحی نازل ہوتی۔ اور جبریل علیہ السلام قرآن پاک کی آیتیں یا سورتیں لے کر آتے تو اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی بتلا دیتے کہ اس سورت کا موقع کیا ہے۔ اور یہ سورت کون سی سورت کے بعد یا قبل کی ہے۔ علیٰ ہذا یہ آیت کون سی سورت کی ہے اور کس آیت کے بعد یا کس آیت سے پہلے کی ہے۔

اور سالانہ دستور یہ تھا کہ رمضان شریف کے مہینہ میں حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے اور جس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ہے اس سال دو مرتبہ پورے قرآن شریف کا دور ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس قرآن پاک کی اسی موجودہ ترتیب پر جو ہمارے سامنے ہے تلاوت فرمایا کرتے تھے یہ ترتیب نزولی نہیں یعنی نزول قرآن کریم کے اعتبار سے نہیں بلکہ توقیفی ہے اور شارع علیہ السلام کی جانب سے ہے اور لوح محفوظ کی کتابت کے مطابق ہے۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔

اوس بن حذیفہ ثقفی کی مرفوع روایت ہے کہتے ہیں کہ میں اپنے قبیلہ ثقیف والوں کے اس وفد میں جو اسلام لانے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے موجود تھا۔ صحابہ نے ہمیں مغیرہ ثقفی کے پاس ٹھہرایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات میں ہمارے پاس آتے۔ عادت شریف یہ تھی کہ ہر شب عشاء کے بعد تشریف لاتے اور گفتگو فرماتے اور اکثر ان واقعات کا ذکر فرماتے جو آپ کے اور قریش کے درمیان پیش آتے ایک رات آپ ذرا دیر سے آئے میں نے عرض کیا کہ آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی آپ نے فرمایا کہ ہاں دیر اس لئے ہوئی کہ مجھے قرآن پاک کی منزل تلاوت کرنا تھا۔ منزل پورا کرنے سے پہلے میں نے پسند نہ کیا کہ باہر نکلوں اس پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگ کس طرح قرآن شریف کی منزلیں کرتے ہیں۔ صحابہ نے تبلایا کہ ہم قرآن کی منزلیں اس طرح کرتے ہیں اور یہی سات منزلیں جو موجودہ قرآن میں ہیں تبلائیں۔ اول تین سورتیں۔ پھر پانچ سورتیں۔ اس کے بعد سات سورتیں۔ پھر نو سورتیں پھر گیارہ سورتیں اور پھر تیرہ سورتیں اس کے بعد مفصل کی منزل یعنی سورۂ قٓ سے آخر قرآن تک۔ یہی سات منزلیں ہیں جو موجودہ قرآن میں پائی جاتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیتوں اور سورتوں کی طرح قرآن پاک کی منزلوں کی ترتیب بھی (تلاوت کے لئے) توقیفی یعنی شارع علیہ السلام کی جانب سے ہے۔

قرآن پاک کی جمع و ترتیب بذریعۂ وحی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک ہی میں فرمائی تھی۔ جبریل علیہ السلام قرآن پاک کی آیتوں اور سورتوں کے ساتھ ان کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلاتے تھے۔

اسی ترتیب پر اول سے آخر تک مکمل کتاب سارا قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے تلاوت کیا۔ اُن کو سُنایا۔ پڑھایا۔ لکھوایا۔ یاد کرایا۔ پڑھوا کر سُنا خود اس پر عمل کیا اور اپنا قرآنی نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے عمل کرایا صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی اسی موجودہ ترتیب و تالیف کے ساتھ جو وحی کے ذریعہ دی گئی تھی قرآن پاک کو اپنے سینوں اور دماغوں میں جگہ دی۔ حفظ اور بر زبان یاد کیا۔ اور لکڑی، پتھر، کاغذ وغیرہ متفرق چیزوں پر لکھا۔ ان متفرق اشیاء اور صحابہ کے یادداشت اور حافظہ سے حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ اول نے ایک صحیفہ میں لکھوا کر جمع کیا جس کو مصحف صدیقی کہا گیا اور پھر حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ثالث نے اس سے متعدد نقلیں کرا کر اقطار ارض میں شائع کیں جو بیاض عثمانی کہلائیں۔ اور یہ سب کام صحابہ کے اتفاق اور مشورے سے انجام پایا۔ اور تمام اُمت نے اس کو قبول کیا۔

قرآن کریم خود اس امر کا دعویدار ہے کہ اس کی جمع و ترتیب، تلاوت و قراءت، ذکر و بیان فہم و تفہیم جو کچھ ہے سب کچھ منجانب اللہ ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ
وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (نحل)

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن مجید کی تدوین و ترتیب، اس کی قرأت و تلاوت بیان و تفسیر اور حفاظت و نگہداشت خدا ہی کے ذمہ ہے اور اسی کا کام ہے جس کا یہ کلام ہے ان امور میں انسان اور اس کے دماغی رنج و کاوش اور کاہش و کوشش کو کچھ دخل نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان امور میں کوئی دخل نہیں اور نہ صحابۂ کرام اور ان کے بعد تابعین کا رضی اللہ عنہم اجمعین، بلکہ ان تمام امور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ پہلے اتباع کا ہے اور پھر تبلیغ کا۔ اور یہی منصب آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور پھر تابعین کو اور اس کے بعد ہر قرن اور ہر صدی

میں سلسلہ بہ سلسلہ آپ کی اُمت کو ملا اور یہی دور تا قیامت چلتا رہے گا۔

آیات قرآنی میں حسن ترتیب | قرآنِ عزیز کلام رحمٰن اور معجزۂ رسول ہے اُس کی ہر آیت سیاق و سباق اور ماقبل و مابعد کے لحاظ سے نہایت مرتب، مربوط اور مسلسل و منضبط ہے۔ گو بظاہر ایک غیر مرتب، منتشر اور متفرق و غیر مرتبط مضامین کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اگر قرآن کریم میں سورۂ فاتحہ سے سورۃ الناس تک آیتوں میں بھی اور سورتوں میں بھی جو نظم و ربط، اتساق و تسلسل، ترتیب و ترصیف اور تنسیق و اتصال ہے وہ ایک خاص موزونیت، تجاذب اور حسن تناسب و جاذبیت اپنے اندر رکھتا ہے جس کا اہل لسان اور زباندان اہل ذوق ہی ادراک کرتے اور کر سکتے ہیں۔

امام فخرالدین رازیؒ کا قول ہے کہ قرآنِ پاک کے لطائف و غرائب زیادہ تر آیتوں اور سورتوں کی ترتیب اور نظم و ربط میں مخفی و مستور ہیں۔

القران کلہ بعضہ متصل ببعض۔ تسلسل و اتصالِ لفظی کے ساتھ ربطِ مفاہیم اور ترتیبِ مضامین کے لئے کلیہ قاعدہ کے طور پر مسلمہ اصول کی صورت میں قرآن پاک پر صادق آتا ہے۔

آیات قرآنی کا تکرار اور اعادہ | اور جن معانی و مضامین کا بظاہر قرآن کریم میں بار بار اعادہ اور تکرار معلوم ہوتا ہے وہ درحقیقت تدریجی روابط و مناسبات اور معدات و محرکات ہیں جو تہیج ذوق اور استقرار فی الذہن کے لئے اور عملی و علمی قویٰ و مناشی کو حرکت میں لانے کے لئے خالقِ فطرت متکلمِ ازلی قدیم نے اپنے اس سرتاپا ہدایت نورانی پاک کلام میں ودیعت و مرکوز فرمائے ہیں۔

چونکہ قرآن کریم انسان کے دل و دماغ اور عقل و وجدان دونوں سے اپیل کرتا ہے اس لئے اس کا یہ طرز بیان فطرتِ انسانی کی سذاجت اور سادگی کے ابھارنے اور اُجاگر کرنے اور اُس کے نقش و نگار کی آرائش کرنے کے لئے قدرت کی حکمتِ بالغہ کا ایک نمونہ ہے وللہ المثل الاعلیٰ ولیس کمثلہ شئی۔

قرآن پاک کی قطعیت، معنیٰ خیزی اور اظہارِ مطالب میں کاملیت و عدم احتیاج قرآن کریم

ایک قطعی الثبوت چیز ہے۔ اپنے ثبوت میں کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں۔ نقلِ متواترہ کے ساتھ اپنے زمانۂ نزول سے آج تک منقول ہونا اس کے یقینی اور قطعی ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اس پر مزید ادلہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کی سورتوں کی مجموعی تعداد باتفاق و اجماع امت ایک سو چودہ اور اس میں مشہور قول کی بنا پر چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیتیں ہیں۔

یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ
تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ

قرآن کریم اپنے معانی و مطالب کے اظہار کے لئے خود ہی کافی ہے۔ هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ
وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں کوئی خبط بے ربط کلام نہیں ہوں۔ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ
اور کوئی اَن بوجھی چیستان یا معمّٰی نہیں ہوں۔

میں ہر شخص کو اس کے علم و عقل کے مطابق سمجھ میں آنے والا ہوں اور سمجھ میں آسکتا ہوں
میں غور و فکر کئے جانے کے قابل کتاب ہوں (اور میرے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے) اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ
وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

قرآن عزیز نے یہ بھی بتلایا ہے کہ میں مہمل یا لغو اور فضول و بیہودہ کلام نہیں ہوں۔ میرا فیصلہ اٹل، حکم غالب اور قول فیصل ہے۔ اِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ، وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔

میرے تمام معانی و مطالب واضح، جلی، بدیہی اور محکم و مستحکم ہیں۔
كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ
كِتَابٌ فُصِّلَتْ اٰيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

اور میرا مطلب بدون روایات کے ملائے سمجھ میں آتا اور آسکتا ہے۔ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ

میں اپنے معانی و مطالب کے فہم کے لئے کسی خارجی ضمیمہ کا محتاج ہے وہ روایات و قصص ہوں یا بداہت و عقل محتاج نہیں۔ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۴۳ میں ایک یقینی چیز ہوں۔ مری حجت واضح۔ دلیل قوی اور برہان یقینی ہے۔

مرے مضامین سطحی، مفاہیم سرسری اور مقاصد معمولی نہیں ہیں۔ مری عبارت، مرا کلام ور میرا بیان فصاحت و بلاغت میں اعجاز کی آخری حد اور انتہائی منزل پر ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن | جب قرآن مجید اپنے دعوے کے مطابق اپنے معانی و مطالب کے اظہار میں کسی خارجی ضمیمہ کا محتاج نہ ہوا۔ اور اس کے معنی و مفہوم بدون کسی دوسری چیز کے ملائے خود واضح و ظاہر ہیں۔ اس لئے قرآن کریم کے سمجھنے اور اس کی تشریح و ترجمہ اور تاویل و تفسیر کے لئے سب سے پہلے قرآن کریم ہی کو دیکھنا چاہئے۔

قرآن کے اجمال کی تفصیل خود قرآن ہی کے اندر موجود ہے۔ اگر ایک جگہ ایک بات قرآن پاک میں مجمل و مبہم اور غیر واضح ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل و تشریح موجود ہے۔ اور بسط و وضاحت سے بیان کردی گئی۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام) ۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (الانعام) ۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام) ۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (الانعام) ۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (الانعام) ۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (الانعام) ۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الاعراف) ۔ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (براءۃ) ۔ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (یونس) ۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَذَكَّرُوْنَ (یونس) ۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (الانعام) ۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (الانعام) ۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل)

لہذا قرآن مجید کی ایک آیت کے معنے کے لئے قرآن مجید کی تمام آیات کو ٹٹولا جائے. ایک آیت کے معنی کی تائید و تصدیق دوسری آیت سے ہو جائے اور خود قرآن مجید سے اس معنی کے شواہد و توابع مل جائیں تو وہ معنی اور تفسیر صحیح قابل قبول اور لائق استناد ہوگی. اور اسی پر عمل کرنا بھی واجب ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جمع الفوائد صفحہ ۳۶ ج ۱ میں روایت ہے

إن القرآن يصدق بعضه بعضاً فلا تكذبوا بعضه بعضا. حاصل مطلب یہ کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف ایک دوسرے کا مصدق و موید ہے ایسی صورت اختیار نہ کرو کہ جس سے قرآن کی تکذیب خود قرآن سے لازم آئے. اور یہ بات اسی وقت ہو سکتی کہ خود قرآن سے اس کی مراد پوچھیں اور آیت قرآنی کا بیان آیت قرآنی سے حاصل کریں باتفاق و اجماع امت تفسیر مستند اور صحیح تفسیر کا سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ قرآن کے سمجھنے اور اس کی تشریح و تاویل کے لئے سب سے پہلے قرآن مجید کا تتبع و تفحص کیا جائے اس کی ورق گردانی اور سطر شماری کی جائے اور خود خدا کے کلام سے کلام خدا کا مطلب سمجھنے کی سعی بلیغ کی جائے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء)

غرضکہ قرآن پاک کے اجمال کی تفصیل، ایجاز کا بسط، ابہام کی توضیح، اطلاق کی تقیید عموم کی تخصیص خود قرآن کی آیات و نصوص یعنی اس کی عبارت، اشارت، دلالت اور اقتضا سے طلب کرنی چاہئے۔

(باقی آئندہ)

اَبان کا ماحول اور شاعری

(۲)

(از جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ علیگ)

دہ صیام وزکوٰۃ | اس نظم میں روزے اور زکوٰۃ کی ان تفصیلات کو جو فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں
ں اسلوبی سے پیش کیا گیا تھا اور اختلافی مسائل میں ہمعصر فقہا (ابو یوسف چیف جسٹس کا طریقہ)
سلک کو واضح کیا گیا تھا، یہ قصیدہ کلیلہ ودمنہ کے بعد نظم ہوا اور قرائن سے
م ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی نظم نہیں لکھی گئی، باقی ساری نظمیں بعد کی ہیں، کسی
بان سے کہا تھا کہ کلیلہ ودمنہ کی نظم پر تم کو خوب روپیہ ملا اب ایک قصیدۃ زھد
تعلق لکھو تو اَبان نے مثنوی کی بحر میں روزہ اور زکوٰۃ پر ایک لمبی نظم لکھی جس کے ستائیس
صُولی نے دئے ہیں اس وقت زھد ایک غیر مادہ پرستانہ طریق فکر کا نام نہیں تھا بلکہ
سمانی ریاضتوں اور آسائشوں کی قربانی کا، موٹے جھوٹے کھانے پہننے، روزہ اور کثرت
ں وغیرہ کا۔

م کتاب المنطق | شاید یہ کتاب ارسطو کی مشہور تصنیف تھی، جس کا ابن المقفع نے فارسی سے
ں میں ترجمہ کیا تھا اور جو منطق کی پہلی کتاب تھی جس نے عربی کا لباس پہنا اس زمانہ میں یونانی
اور خاص طور پر منطق سے دلچسپی پیدا ہو رہی تھی اور سرکاری حلقوں اور دفتروں کے
ردں، سکریٹریوں اور متشککین مذہب میں اس کی مانگ بڑھی ہوئی تھی۔

م ادب ابن المقفع | شاید اس نظم میں ابن المقفع کی وہ کتابیں جو آج کل اَدب الصَّغیر اور
ب الکبیر کے نام سے مشہور ہیں سموئی گئی ہوں، صُولی نے اس نظم کے نمونے نہیں

پیش کئے، کتاب المنطق کی طرح یہ کتاب بھی یحییٰ برمکی کے ایما سے نظم کی گئی تھی۔

۴۔ نظم ذات الحلل | یہ نظم اس زمانہ میں بہت مشہور تھی، بعض لوگ ابوالعتاہیہ (متوفی ۲۱۱ھ) اس کا موجد قرار دیتے ہیں لیکن صُولی کی رائے میں یہ اَبان کی تصنیف تھی، یہ کسی خاص کتاب سے ماخوذ نہ تھی اس میں شاعر نے بہت سے حقایق پیش کئے تھے جن میں آفرینش عالم، (ا) کی ساخت اور منطق کے بعض مباحث خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (صُولی صفحہ ۱)

اِن پانچ نظموں کا صُولی نے ذکر کیا ہے اور ان میں سے صرف دو کے نمونے پیش، ہیں ایک کلیلہ و دمنہ اور دوسرے نظم روزہ و زکوٰۃ پہلی کی تعداد چودہ ہزار تھی اور (ا) کی بابت صُولی نے لکھا ہے کہ یہ بہت طویل تھی، جہاں تک مجھے معلوم ہے ان پانچ نظموں (م) سے ہم تک کوئی نہیں پہنچی۔

ابن الندیم کی کتاب فہرست میں جو عربی کتابوں کا سب سے بڑا کاغذی خزانہ ہے کھوج لگانے سے اَبان کی آٹھ مزید نظموں کا پتہ چلتا ہے ان نظموں کے نام یہ ہیں: (۱) کتاب اردشیر (۲) کتاب سیرت انوشروان (۳) کتاب بلوہر و برد انیہ (۴) کتاب رسائل (۵) کتاب علم الہند (۶) کتاب الزہر بوداسف (۷) کتاب سندباد (۸) کتاب مزدک۔ یہ کتابیں جیسا ان کے ناموں سے ظاہر ہے فارسی اور ہندی، سماجی، اخلاقی اور تاریخی موضوعات سے متع(لق) تھیں۔ پہلی دو ایران کے مشہور ساسانی بادشاہوں اردشیر اور انوشروان عادل کی سیرت او(ر) کارناموں کے تذکرے ہیں ان دونوں کی زندگی، پالیسی، سیرت اور فرمان اس وقت کے عا(م) دفاتر کے اہل کاروں اور سکریٹریوں میں بہت مقبول تھے جیسا کہ جاحظ متوفی ۲۵۶ھ) نے اپنے رسا(لہ) ذمّ اخلاق الکتّاب (کلرکوں اور سکریٹریوں کے اخلاق کی برائی) میں لکھا ہے اور سرکا(ری) فرائض کی انجام دہی کے لئے مشعل ہدایت سمجھی جاتی تھیں۔ تیسری کتاب کسی مشہور سکریٹر(ی) یا وزیر کے خطوط کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ساتویں کتاب مشہور سندبا(د) جہا(زی) کے سنسنی خیز بحری تجربات پر مشتمل تھی۔ آٹھویں ایران کے اشتراکی لیڈر مزدک کے حالا(ت)

ب کے بارے میں تھی، یہ لیڈر زمین، عورت اور روپیہ پیسہ کو دولت مشترکہ بنانا چاہتا تھا
ساکہ روس میں ان دنوں ہو رہا ہے۔ تیسری، پانچویں اور چھٹی کتابیں جن کا ماخذ یقینی سنسکرت
ہے غالباً شخصی، اجتماعی اور شاہی زندگی و سیرت کو منضبط و مہذب بنانے والے مضامین پر مشتمل
ں گی جیسا کہ کلیلہ و دمنہ ہے۔

ان میں سے دو (سیرت نوشیرواں اور کتاب مزدک) کے متعلق بہ تحقیق ہمیں معلوم ہے کہ
ن المقفع نے سپرد قلم کی تھیں (فہرست) اور بقیہ کے بارے میں گمان غالب ہے کہ اس
تصنیف ہوں گی ابن المقفع ایرانی نژاد تھا اور عراق کے اُموی گورنروں اور ابتدائی عباسی
رانوں کا سکریٹری رہا تھا فارسی و عربی لکھنے کی اس کو بڑی اچھی قدرت تھی، اس نے دونوں
روں میں ارباب اختیار کی شخصی و اجتماعی بے ضابطگیاں اپنی ذاتی خواہش پر حکومت و رعایا
مفاد اور خدا کے خوف کی بے دریغ قربانیوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کی حسن انصاف
راستبازی کو بڑا شدید دھکا لگا تھا اصلاح کے جذبہ سے اس نے متعدد ایسی فارسی و ہندی
ں کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جن سے افراد و بادشاہوں کی شخصی و سماجی زندگی درست ہو سکتی
۔ اس کی اکثر طبع زاد اور مترجم کتابوں کا موضوع یہی تھا۔

اس کی کتابیں کچھ تو اپنے ستھرے اور رواں اسلوب کی وجہ سے اور خاص طور پر
پنے مضامین کی بدولت سرکاری حلقوں میں جہاں فارسی نژاد لوگ حاوی تھے بہت مقبول
یں اور ان کا مطالعہ کلرکوں، سکریٹریوں اور وزیروں کی دماغی تربیت کے لئے ناگزیر خیال
جاتا تھا ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ یحییٰ کلیلہ و دمنہ کو حفظ کرنے کے لئے کیسا بے تاب
ا، وہ خود ایرانی تھا اور ایرانی کلچر و شاہی آئڈیل کا بڑا حامی تھا اس کی خواہش تھی کہ اس کلچر
ر آئڈیل کو عباسی ماحول میں رچا دے وہ اور اس کے لڑکے خلافت کے حقیقی منتظم تھے
س لئے ان کی خواہش حکومت کے سارے اخلاقی و مادی وسائل کی قوت کے ساتھ عملی
درت اختیار کرنے لگی تھی اس لئے ابن المقفع کے ترجمے اور کتابیں۔ اور ہمیں یاد رہے کہ

ابن المقفع اس راہ کے پیش رو دنیں سے ہے بچوں اور بڑوں کے ہاتھوں میں آگئیں ان تفصیلات کے پیش نظر یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ یہ آٹھ یا ان میں سے بعض کتابیں برامکہ کے ایما سے نظم ہوئی ہوں۔

اَبان کے مذہب کے بارے میں لوگوں کو اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو کافر وزندیق بتاتے ہیں بعض کہتے ہیں وہ سچا اور پکا مسلمان تھا اور خود صُولی کی رائے بھی یہی ہے جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں: "اَبان دل سے مسلمان تھا، حافظِ قرآن اور عالم فقہ تھا" (صولی ص۱) لسانیات کے مشہور عالم ابوزید انصاری (متوفی ۲۱۵ھ) کی مجلس میں اَبان کا ذکر آیا تو لوگوں نے اس کو کافر بتایا، ابوزید اس پر ناراض ہو کر بولا: "وہ میرا پڑوسی تھا اور کوئی رات ایسی نہیں گذری جب میں نے اس کو قرآن پڑھتے نہ سُنا ہو" ایک دوسرے ہمعصر نے کہا: "اَبان میرا پڑوسی تھا اور اس کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر تھا" (صولی ص۳) خود اَبان نے اپنی ذات کے متعلق مرتے وقت یہ الفاظ کہے: "میں خدا سے تمہاری توقع کرتا ہوں اور اس کے رحم کا طالب ہوں" میری زندگی میں کبھی کوئی رات ایسی نہیں گذری جب میں نے بہت سے نفل نہ پڑھے ہوں" (صولی ص۲) ایک تیسرے ہمعصر نے اس کے بارے میں یہ رائے دی: "اَبان برامکہ کے محلوں سے لوٹ کر اس قدر سوتا کہ نشہ اتر جائے پھر اٹھ کر صبح تک نماز پڑھتا تھا" (صولی ص۳)

اَبان کے ہمعصر ابونواس نے ایک نظم لکھی ہے جس میں اس کے بارے میں یہ خیالات ظاہر کئے ہیں:

۱۔ ایک دن میں اَبان کے ساتھ بیٹھا تھا خدا اس پر رحم نہ کرے۔

۲۔ ہم مقام نہروان میں امیر کی ڈیوڑھی میں تھے۔

۳۔ جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو ایک خوش بیان موذن نے اذان دی۔

۴۔ اذان کے ختم ہونے تک جو وہ کہتا ہم بھی کہتے جاتے۔

۵۔ اس پر اَبان بولا، بغیر دیکھے بھالے تم کیسے ان باتوں کی دکہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اس کا رسول ہے، گواہی دیتے ہو۔

۶۔ میں تو جب تک آنکھ سے نہ دیکھ لوں کبھی گواہی نہیں دے سکتا۔

۷۔ میں نے کہا سُبحَانَ رَبِّیْ۔ اس نے کہا: سُبحَانَ مَانِیْ (ایران کا ایک مدعی نبوت)

۸۔ میں نے کہا عیسیٰ اللہ کا پیغمبر ہے، وہ بولا شیطان کا۔

۹۔ میں نے کہا موسیٰ کلیم اللہ ہے وہ بولا تب تو تمہارے رب کی آنکھیں اور زبان ہوتیں۔

۱۰۔ اور کیا وہ خود پیدا ہوگیا؟ اگر نہیں تو اس کو کس نے پیدا کیا؟

۱۱۔ یہ سُن کر میں کھڑا ہوگیا اور خدا پر شبہ کرنے والے کافر کے پاس سے ہٹ گیا۔

۱۲۔ جس کا مقصد رندوں کی سی زندگی بسر کرنا ہے۔

۱۳۔ جیسے مجرد، عباد، دالبہ ابنِ ایاس، قاسم، مُطیع وغیرہ (ضولی)۔

جاحظ ابونواس کے ان الزامات پر یہ رائے زنی کرتا ہے: "تعجب ہے کہ ابونواس اَبان کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو مُجرد، مُطیع، ایاس، والبہ وغیرہ کی لامذہبیت و رندمزاجی کی زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اَبان کی عقل نشہ کی حالت میں اُن کی بغیر نشہ کی عقل سے بہتر ہے رہے اس کے عقاید تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے بارے میں کیا کہوں"۔ (صولی ص۱۲ کتاب الحیوان ۴۴۴)

جاحظ کے اس تبصرہ سے دو نتیجے نکلتے ہیں، ایک یہ کہ اَبان دوسرے ہمعصر شعراء کے مقابلہ میں جن کا نظم میں ذکر ہے شراب نوشی اور رند مشربی میں محتاط اور معتدل تھا دوسرے یہ کہ یا تو اس کے عقائد اتنے عمدہ تھے کہ اُن کی تعریف کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں یا عام لوگوں سے اتنے مختلف کہ ان کی تصریح مناسب نہیں۔

حقیقت حال کا علم تو صرف خدا کو ہے، البتہ ہمیں معلوم ہے کہ اَبان کا ماحول عملاً مادہ پرستانہ اخلاق پر مبنی تھا جس میں نفس پرستی اور بے قید جنسی تلذذ کی قدریں پروان چڑھ رہی تھیں اور خدا، رسالت و آخرت کی باز پرس کے تصورات مضمحل تھے اور مذہب عملی زندگی سے بے ربط ہو کر بعض رسومات کی ادائیگی اور بعض طریقوں کی پابندی کا نام تھا اور چونکہ ایک زندہ اور محرک آئیڈیولاجی کی جگہ بیجان

خارجی رسومات پر سارا زور تھا اس لئے بہت سے تیز طبیعت لوگ اُن کو مُہمل سمجھ کر ان سے آزاد
رہنا چاہتے تھے اور بہت سے ایرانی نسل کے سرکاری عہدہ دار ایران کے پرانے رہنماؤں مثلاً
زرتشت، مانی، مزدک وغیرہ کی عقیدت کا دم بھرتے تھے، جن کی پیروی میں وہ ایک آزاد مذہبی
رسومات سے پاک زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے جس میں نہ خدا ہو نہ خدا کا خوف، نہ آخرت کی بازپرس
کا اندیشہ، نہ حلال حرام کی پابندیاں؛ لیکن چونکہ حکومت اسلامی حکومت کے نام سے تھی اور اس
کے مورث ربانی مسلمان تھے اس لئے علی الاعلان اسلام سے بغاوت کر کے یا اس کے شعائرِ ظاہری
سے بے پرواہی برت کر اس قسم کے لوگوں کا حکومت کے عہدوں پر فائز رہنا یا حکومت کی تعزیر
سے بچنا مشکل تھا۔ یہ لوگ عملاً سب کچھ روحِ اسلام کے خلاف کرنے کے باوجود نہ تو اسلام سے
بغاوت کا اعلان کرتے تھے نہ اس کے ظاہری شعائر سے بے پرواہی کی جرأت، چنانچہ ہر قسم کی
بدعنوانیوں اور بدکرداریوں کے ساتھ ساتھ نماز وغیرہ باقاعدگی سے بہ جماعت انجام دیتے رہتے
اور اس لئے ان سے کوئی تعرض نہ کرتا البتہ ان ظاہری رسومات سے بے التفاتی یا ان کی پبلک
تحقیر حکومت اور عوام کی نظر میں ان کو مجرم ثابت کرتی اور ان کو کافر، زندیق اور ملحد کا لقب دیا جاتا
اور وہ حکومت کی طرف سے سزا پاتے۔ خلیفہ مہدی کے زمانہ میں (۱۵۸ تا ۱۶۹ھ) تو زندیقوں کا کھوج
لگانے اور سزا دینے کا ایک مستقل محکمہ وجود میں آگیا تھا، بشار ابن بُرد بصرہ کے اندھے شاعر کو
اسی محکمہ نے بہ جُرم زندقہ سزائے موت دی حالانکہ اس کا جُرم خلیفہ کے وزیر کو ناراض کرنا تھا
زندقہ صرف ایک بہانہ تھا۔

اس نفس پرستی کے ماحول میں جہاں اور اخلاقی و دینی مفاسد تھے، رقابتیں، باہمی حسد،
شخصی عداوتیں اور سازشیں بھی زور پکڑے ہوئے تھیں سرکاری اور درباری حلقوں سے
تعلق رکھنے والے شخصی اقتدار اور خوش حالی کے لئے ہر قسم کی بازیاں لگاتے تھے شاعروں کے
گروہ میں اگر کسی کو خلیفہ یا وزیر یا کسی دوسرے بڑے آدمی کی مقبولیت حاصل ہو جاتی تو دوسرے اس
کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگ جاتے اور ریشہ دوانیوں اور الزاموں سے اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے

اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک موثر آلہ اس زمانہ میں زندقہ کا الزام تھا۔ زندقہ کا مفہوم کافی وسیع تھا لیکن خاص طور پر اُس شخص کے گلے میں اس کا پھندا ڈالا جاتا جو امیران کے متعدد پیغمبر یا مانی، زرتشت، اشتراکی، مزدک سے عقیدت رکھتا یا معتقد بتایا جاتا اور اپنی سیرت اور طرزِ زندگی میں کھلے طور پر بے حیا، رند مزاج اور عیاش ہوتا اور نماز، روزے، حج، زکوٰۃ و جہاد کو انجام نہ دیتا یا ان کا احترام نہ کرتا۔ ابن المقفع نے مزدک اور بقول مسعودی (مصنف مروج الذہب) مانی و زرتشت وغیرہ کی کتابوں کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا اور بقول بعض کسی آتش کدہ کو دیکھ کر دو شعر پڑھے تھے جن سے آگ سے اس کی عقیدت ظاہر ہوتی تھی پھر ایک معاملہ میں خلیفہ منصور اس سے ناراض ہو گیا اس لئے اس پر زندقہ کا الزام لگا کر جلوا دیا گیا۔ اگرچہ ابن المقفع اپنی سیرت اور اخلاق کے لحاظ سے نیک اور خدا ترس آدمی تھا۔ یہ واقعہ ۱۴۲ھ اور بقول بعض ۱۴۵ھ کا ہے۔ بشار بن بُرد نے چند اشعار سے مہدی کے وزیر یعقوب بن داؤد کو ناراض کر دیا تھا اس لئے زندقہ کی فردِ جرم میں اس کو بھی ہلاک کر دیا گیا ۱۶۸ھ

ابو نُواس کی نظم کچھ اسی قبیل کی معلوم ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ابو نُواس کا کلام پڑھا ہے اُن کو معلوم ہے کہ اُس نے کیا کیا کُفر بکا ہے۔ یہ سارے الزامات جو وہ اَبان کے خلاف لگاتا ہے خود اس نے اپنے خیالات کے طور پر متعدد جگہ پیش کئے ہیں بلکہ وہ تو تشکک اور کفر کی باتوں کو خوب مزے لے لے کر اپنے خوبصورت کلام میں بیان کرتا ہے۔ مگر چونکہ وہ نماز با جماعت انجام دیتا ہے اور دربار میں اس کو اقتدار حاصل ہے کوئی اس پر زندقہ کی آڑ سے وار نہیں کرتا میرا خیال[1] ہے کہ برامکہ کے ساتھ اَبان کی قربت اور اس کی شاعرانہ دھاک نے ابو نُواس کے قلم سے یہ نظم لکھوائی، ورنہ

---

[1] یہ سطریں لکھنے کے بعد عقد الفرید میں ایک روایت ملی جس نے ابو نُواس کی نظم زیرِ بحث اور اَبان کے ساتھ اس کی دشمنی کا پس منظر بالکل صاف کر دیا ہے عقد کا راوی کہتا ہے: فضل نے اَبان کو شعرا میں ان کے مرتبۂ شعری کے لحاظ سے روپیہ تقسیم کرنے کو دیا تو اس نے ابو نواس کو یہ کہتے ہوئے ایک خراب درہم دیا۔ میں نے ہر شاعر کو اس کے مرتبہ شعری کے لحاظ سے انعام دیا ہے اور تم زیادہ سے زیادہ ایک درہم کے مستحق ہو۔ ابو نواس نے ناراض ہو کر اسکی ہجو کی۔"
عقد ۲/۱۴۳

ابو نواس کو خود ان عقائد سے کب محبت تھی جو ان کے فقدان پر اَبان سے مواخذہ کرتا صُولی نے اس کے کچھ اور شعر بھی دئیے ہیں جن میں اس نے اَبان کی صورت و سیرت کا خاکہ اڑایا ہے جو دراصل اَبان کی اس افتتاحیہ نظم کا ردِ عمل ہیں جس میں اس نے اپنی تعریف کر کے فضل کی قربت حاصل کی تھی۔ ان شعروں کا ترجمہ یہ ہے :

(۱) کم نصیبی کا مجھ سے زیادہ مستحق وہ ہے جس کا نام نغمہ سنج بلبل ہے (اَبان نے افتتاحیہ نظم میں اپنے واسطے یہ لفظ استعمال کیا تھا)

(۲) جب وہ بولتا ہے تو گرگرہ (مشک کی طرح) کرتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو بات کرنا نہیں آتی۔

(۳) تجھ میں وہ کوئی صفت نہیں جو تو نے بیان کی سوائے بے ہودہ اخلاق کے۔

(۴) تیری ڈاڑھی کچیا ہے، ناک چھوٹی، تو ٹیکی (خدا رسی سے منحرف ہے۔

میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اَبان پر کفر کا الزام لگایا ہے وہ یا تو اس سے کوئی شخصی کد، حسد یا رقابت رکھتے تھے یا اَبان کی ان رنگیلے شعراء کے ساتھ دوستی سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور تھے جو اپنے اشعار اور لذت پرستیوں کے لحاظ سے کھلے ہوئے بے حیا تھے۔ صُولی نے ایسے بارہ شاعروں کے نام دئیے ہیں جن میں تینوں حماد (حماد عجرد، حماد راویہ حماد بن زبرقان مشہور رِند) اور ابو نواس کا استاد والبہ (مشہور رند) بھی شامل ہیں جن سے اَبان کا میل تھا اور لکھا ہے کہ ان میں بڑی دوستی تھی گویا ایک جان ہوں (صولی صنا)

گو کہ اَبان کے عقائد اور مذہبیت پر شبہ کیا گیا ہے، گو کہ ابو نواس نے اس کو مانی کا معتقد قرار دیا ہے اور بعض ہم عصر اس کو کافر بتاتے ہیں گو کہ اس نے بلیغ ہجو کی ہے اور بعض لوگوں کا مذاق اڑایا ہے

؎ عقد کے راوی کا کہنا ہے کہ اشعار مذکور کا جب ابو نواس کو علم ہوا تو اس نے یہ شعر کہے۔ اَبان نے رسوائی سے ڈر کر ابو نواس سے کہلا بھیجا کہ دس لاکھ درہم لے لو (جو بقول راوی عقد فضل نے انعام میں دئے تھے) اور اشعار مذکورہ کو مشتہر نہ ہونے دو، لیکن ابو نواس نہ مانا اور بولا کہ اگر دس کروڑ درہم بھی دوگے تب بھی بغیر مشتہر کئے نہ مانوں گا اس کا اثر یہ ہوا کہ فضل نے اَبان کو علیحدہ کر دیا ... عقد ۳۴

بعض کنیزوں کی محبت کے ترانے گائے ہیں اور امرد لڑکوں کے عشق میں شعر کہے ہیں پھر بھی اس کے عام شاعرانہ رجحانات' اس کی زندگی کے حالات اور اس کی مذہبیت کے حق میں بھاری شہادتوں کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی سیرت اور کردار میں عام شعراء اور بے فکر خوش حال لوگوں سے کافی بلند تھا وقت کے سب سے غالب تین اصنافِ سخن یعنی قصیدہ غزل اور ہجو میں سے غزل تو نہ کہنے کے برابر اُس نے کہی اور یہ بڑی حیرت کا مقام ہے، قصیدے جن کی بنیاد خوشامدانہ تعریف اور فاسد ذہنیت پر تھی اس نے بہت کم کہے اور ہجو میں بھی اعتدال و ملاحت کا پہلو ملحوظ رکھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو مفید کتابیں نظم کرنے پر صرف کیا جبکہ اور کوئی اس خشک موضوع سے دلچسپی نہ لے سکا اس میں اتنی اخلاقی حس بھی تھی گو کہ یہ بہت جلد اپنے مربی کی تلقین پر دغا دے گئی کہ اس نے بنو عباس کے استحقاقِ خلافت کو حضرت علی کی اولاد کے مقابلہ میں سراہنا یا اس کا پرچار کرنا پسند نہ کیا اور رشید کے انعام سے محروم رہنا گوارا کیا' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن اس نے برامکہ سے اس بات کی شکایت کی کہ دوسرے شعراء رشید سے بڑے بڑے انعام لے کر خوب مالدار ہو گئے اور وہ ان کی سرپرستی اور اپنی خدمت کے باوجود غریب رہا۔ اس پر فضل بولا: "اگر تم مروان (جس نے بنو عباس کے استحقاق خلافت کا ایک قصیدہ میں) پروپیگنڈا کر کے رشید سے ایک لاکھ درہم کا انعام لیا تھا) کے راستہ پر چلو تو میں تمہارا کلام پیش کر دوں گا اور تمہاری مراد پوری کرا دوں گا۔" ابان نے کہا: خدا کی قسم میں اسے جائز نہیں سمجھتا"۔ فضل نے اس پر ذیل کی یہ رائے دی جو اس وقت کی اخلاقی دیانت کھوکھلے پن کی بہت اچھی مثال ہے: "ہم سب وہی کرتے ہیں جو جائز نہیں ہے اور تم کو ہمارے اور دوسرے لوگوں کے نقش قدم پر چلنا چاہئے"۔
(صولی ع۱۲) ابان نے اسی رائے پر عمل کیا:-

اس کی مذہبیت کے بارے میں اوپر شہادت گذری ہے کہ وہ حافظ تھا فقیہ تھا اور رات کو نفلی نمازیں پڑھتا تھا؛ یہ سب کچھ ہو گا لیکن اس کی نماز کے سلسلہ میں ایک عجیب بات اس کے لڑکے نے نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نماز بے روح قالب تھی۔ یہ کلیلہ و دمنہ کے زمانہ

نظم کی بات ہے؛ وہ کہتا ہے کہ میرا باپ جب نماز پڑھتا تو ایک تختی اُس کے سامنے رکھی رہتی تھی جب وہ سلام پھیرتا تو تختی اُٹھا کر اس میں وہ شعر لکھ دیتا جو دوران نماز میں اس نے بنائے ہوتے، اس کے بعد پھر نماز پڑھنے لگتا۔" (صولی ص)

اُبان کی شاعری اُبان کی شاعری کے بارے میں تیسری صدی ہجری کے مشہور مصنف اور ادیب جاحظ کی رائے یہ ہے: مولّدون شعراء (نئے جو عربوں کے گھر میں پیدا ہوئے لیکن ان کی مائیں غیر عرب تھیں) میں بشار، سید حمیری، ابوالعتاہیہ اور ابن عیینہ کو سب سے زیادہ شعر کا فطری سلیقہ حاصل تھا، اس زمرہ میں بعض لوگوں نے یحیٰی بن نوفل، سلم الخاسر اور خلف بن خلیفہ کو بھی شامل کر دیا ہے لیکن ان تینوں میں اُبان بن عبدالحمید، فطری سلیقہ شعری میں سب پر فائق تھا اور مذکورہ تمام شاعروں پر بشار (صولی ص البیان والتبیین ۱/۵۹) میرا خیال ہے کہ اس رائے میں کثرت کلام کو شعر کے فطری سلیقہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی جاحظ نے نئے شعراء میں ان شاعروں کا کلام مقدار میں سب سے زیادہ پایا اور اس فراوانی کو ان کی غیر معمولی شعری صلاحیت کا اثر تصور کر کے یہ رائے دی اور بشار کا کلام چونکہ مقدار میں ان سب سے زیادہ تھا۔ اس کو ان سب کا سرتاج قرار دیا۔ میرے اس خیال کی تصدیق اس بات سے ہوگی کہ بشار سید حمیری اور ابوالعتاہیہ کے کلام کے متعلق کتابوں میں تصریح کی گئی ہے کہ ابتداء میں وہ بہت تھا اور بعد میں اکثر ضائع ہو گیا۔ اور اغانی ۳/۷ کے مصنف نے صاف صاف لکھا ہے: جاہلیت اور اسلام میں سب سے زیادہ شعر بشار ابوالعتاہیہ اور سید حمیری نے کہے" اس کے علاوہ بشار کی طرف یہ دعوے منسوب کیا گیا ہے کہ "میں نے بارہ ہزار قصیدے کہے اور کیا ہر قصیدے میں ایک شعر بھی اعلیٰ درجہ کا نہ ہوگا" بر نے محسوس کیا ہے کہ اُس زمانہ کے ادیب عام طور پر اُن شعرا کو فحول یا صف اول کا شاعر قرار دیتے ہیں جن کا کلام مقدار میں بہت ہے جیسے امرء القیس، اعشیٰ، اور فرزدق لیکن میرے خیال کا یہ مطلب نہیں کہ شعر کی وجدانی و شعوری خوبیوں کو اس رائے میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

جاحظ کی رائے سے یہ بات مسلم ہے کہ اُبان کا کلام مقدار میں بہت تھا اور وہ ایک غیر معمولی

شعری صلاحیت کا مالک تھا۔ اس کی پانچ مثنویوں کا تو صُولی نے بھی ذکر کیا ہے اور صرف کلیلہ و دمنہ کے اشعار کی تعداد چودہ ہزار بتائی ہے باقی چار مثنویوں کی تخمینی تعداد شعر اگر ۲۰ ہزار اور فہرست کی مذکورہ مثنویوں کی علی الاقل تئیس ہزار اور ان کے علاوہ قصیدوں اور قطعات وغیرہ کی تعداد ۵ ہزار مان لی جائے تو کل تعداد ۷۰ ہزار کے لگ بھگ پہنچتی ہے۔

صُولی نے اَبان کے ساڑھے پانچسو شعر نقل کیے ہیں جنمیں ۴۷ نظم روزہ و زکوٰۃ اور ۷۶ کلیلہ و دمنہ سے متعلق ہیں، سوا سو سے اوپر ہجو اور مذاق پر مشتمل ہیں، باقی اشعار کی اکثریت مدحی قصائد جو رشید، یحییٰ، فضل و جعفر، اپنے آبائی وطن فسا کی تعریف اور مرثیوں پر مشتمل ہے، باقی اشعار مختلف روزمرہ کے واقعات کی بابت ہیں اور شاعر کا بہترین ترکہ یہی ہے، زہد حماسہ، خمریات، اور غزل پر جو قصیدہ کی طرح شعر کے مشہور اصناف ہیں، غالباً اَبان نے طبع آزمائی نہیں کی۔ صولی کے پیش کردہ اشعار میں ان کے نمونے نہیں ملتے اور یہ تعجب کی بات ہے اَبان کے ماحول میں قصیدہ، ہجو اور مرثیہ کے ساتھ، خمریات، غزل اور زہد شعراء کے نہایت پسندیدہ موضوعات تھے۔ اَبان کی غزل کے ایک، دو نمونے صُولی نے دیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس نے غزل بہت کم کہی ہے، جب اَبان سے کسی نے پوچھا کہ تم ابونُواس کی طرح غزل کیوں نہیں کہتے تو اس نے جواب دیا: "جس طرح میں نے کتابوں کو نظم کیا ہے۔ ابونُواس نے نہیں کیا، میں تو ایسے موضوع پر شعر کہتا ہوں جس سے مجھے فائدہ ہو" (صولی ص۳۹) غالباً خمریات اور زہد وغیرہ پر شعر نہ لکھنے کا بھی یہی سبب ہوگا:

اَبان کا اسلوب شستہ اور رواں ہے، اس کا کلام عراقی کی عباسی، ریشمی و مخملی تمدن سے پوری طرح متاثر ہے، اس میں خشکی و صلابت بالکل نہیں اور یہ دوسری صدی ہجری کے اکثر عراقی شعراء کی خصوصیت نظر آتی ہے جب وہ قصیدہ جیسی بے جان صنف کو چھوڑ کر روزمرہ کے واقعات یا وجدانی اُمور کو پیش کرتے ہیں۔

تاریخ ادب میں اَبان کی پوزیشن کافی بلند ہے گو کہ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے جہانتک

سبھی معلوم ہے وہ پہلا شاعر تھا جس نے نثری موضوعات کو نظم کیا اور تعلیم و حفظ کی آسانی کے لئے کتابوں کو شعر کا جامہ پہنانے کی رسم ڈالی، اور شعر سے جو اس وقت تک عشق و محبت کے افسانوں فرعون ساز تعریف اور ہجو گوئی کے لئے مخصوص تھا مفید خدمت لی اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک قابل تقلید اضافہ کیا۔ عربی شاعری کے نقادوں نے ہمیشہ اس بات کی شکایت کی ہے کہ دنیا کی دوسری ممتاز زبانوں کی طرح عربی میں قصصی شاعری یعنی (Epic) نہیں ہے اَبان کی نظمیں چاہے قصصی شاعری یا Epic کے مخصوص مفہوم سے کچھ مختلف ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کئی ایک Epic کی طرح لمبے اور اثر انگیز قصصی مواد پر مشتمل تھیں۔

اس کی تقلید زیادہ نہیں کی گئی، وجہ یہ تھی کہ نظم کرنے کا کام نہ تو اتنا دلچسپ تھا جتنا طبع زاد شاعری کا اور نہ اتنا پُر نفع، ایک معمولی سا قصیدہ لکھ کر شاعر اس سے زیادہ کما لیتا تھا جتنا کسی کتاب کو منظوم کرکے۔ پھر بھی دوسری و تیسری ہجری میں نثر کو نظم کرنے کی رسم کو خوب فروغ تھا مثال کے طور پر یہاں دو نام پیش کئے جاتے ہیں: بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) جس کو ہم فتوح البلدان و انساب الاشراف کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں بڑا زبردست ہجو گو شاعر بھی تھا اس نے کتاب سیرت اردشیر کو جو اس وقت نہایت مقبول تھی نظم کا جامہ پہنایا۔ (فہرست ص ۱۱۳) اور بشر بن معتمر نے بہت سے رسالے منظوم کئے جن میں سے چوبیس کا فہرست نے ذکر کیا ہے (فہرست ص ۲۳) بشر علم الکلام کا بڑا عالم تھا یہ ساری نظمیں مذہبی اور فرقہ وارانہ مجادلوں پر مشتمل تھیں جو قوت و اقتدار کے سایہ میں خوب پروان چڑھ رہے تھے۔

اَبان کی شاعری کی دوسری خصوصیت جو صولی کے اقتباسات میں جلوہ گر ہے یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پر شعر لکھتا ہے جن سے خود اس کی نفسیات، سیرت اور اجتماعی ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے: روزمرہ واقعات پر عربی کے بہت سے شاعروں نے شعر لکھے ہیں جو یا تو شعر کی معروف اصناف سے باہر ہونے کے سبب محفوظ نہ رکھے گئے یا تاریخ و ادب کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ایسے اشعار بہر حال دیوانوں اور مجموعوں میں

کم ہی نظر آتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ عربی شعر اور خاصکر اسلامی دور کا شعر شخصی و اجتماعی زندگی کے ان تاثرات سے بہرہ مند ہے جو شعر کی فرسودہ و بے جان اصطلاحی قسموں میں نہیں سما سکتی اور جن کی اجتماعی قدر و قیمت اُن اصطلاحی اقسام کی فنی قدر و قیمت سے بہت زیادہ ہے۔

ذیل میں ہم ابان کے کلام کے ایسے نمونوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن سے اس کی نفسیات سیرت اور اجتماعی ماحول کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے :۔

۱۔ اَبان کے پڑوس میں ایک شخص محمد نامی رہتا تھا جو اس کا دشمن تھا اس نے ایک بہت مالدار عورت سے جس کا نام عَمَارَہ تھا شادی کی۔ اَبان نے اس کی ہجو میں شعر لکھے اور اُس کی دلہن کو ایسا ڈرایا کہ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی اور محمد کو بڑا مالی نقصان اُٹھانا پڑا اِن اشعار سے اس وقت کی شادی بیاہ کی بعض رسموں کا بھی پتہ چلتا ہے :

۱۔ جب میں نے دیکھا کہ گلی ساز و سامان، زرق برق کپڑوں اور فرش فروش سے بھر گئی ہے

۲۔ اور کبھی اس گھر سے کبھی اُس گھر سے اُس میں اخروٹ اور شکر پھینکی جا رہی ہے!

۳۔ اور گانے والے بلائے گئے ہیں، طبلچیوں اور رنفیری بجانے والوں کی بھیڑ ہے!

۴۔ تو میں نے پوچھا: یہ کاہے کی تیاریاں ہیں؟ مجھے بتایا گیا: ایک عجیب بات ہونے والی ہے یعنی محمد کی عمارہ سے شادی ہے۔

۵۔ خدا نہ کرے کہ عمارہ اس کے گھر میں آباد ہو اور انتقام لیتا ہوا اس کو (محمد) نہ دیکھے۔

۶۔ عمارہ نے اس میں کیا دیکھا؟ اور کس بات کی اس سے توقع کی؟ وہ تو بڑی ممتاز عورت ہے،

۷۔ وہ سیخ کی طرح کالا ہے، ایسا کالا کہ کھجور کا بھاڑ اس کے سامنے ہیچ ہے، وہ تو کولتار ہلانے کی لکڑی کی طرح سیاہ فام ہے۔

۸۔ اس کے بچوں کو بَرہ کی طرح ہلکی پانچ روٹیاں ملتی ہیں اور اگر اس کے گھر والے کہیں زیادہ کھا لیتے ہیں تو اس کے ڈر سے بھاگتے پھرتے ہیں۔

۱۲۔ جب رات کو اس کی آنکھ لگ جائے تو تو اُٹھ کر نکل بھاگنا۔

۲۔ اَبان کا ایک پڑوسی تھا جس کا نام یزید تھا اس کی ایک گانے والی کنیز تھی اس لئے اس کے پاس اَبان اور کچھ دوسرے احباب آیا جایا کرتے تھے، کنیز کو ان میں سے ایک کے ساتھ محبت ہوگئی اور اس کا چرچا ہونے لگا۔ اَبان نے غالباً ازراہ خیر خواہی یہ شعر یزید کو لکھ کر بھیجے ا۔

۱۔ اے یزید تم سو رہے ہو، خبردار ہو، تم اپنی وجاہت کو خاک میں ملا رہے ہو، ہوش میں آؤ

۲۔ تم اس وقت تک نرمی سے پیش آؤ جب تک کہ تمہیں کمزور نہ سمجھا جائے، اور جب تمہارا دوست بدتمیزی کرنے لگے تو سختی سے پیش آؤ۔

۳۔ کبھی کوئی گدلی چیز نہ پیو اور اگر تمہارے پیالے میں تنکا نظر آتے تو نکال کر پھینکدو۔

۴۔ اور اپنے مخلص دوست کے مشورہ پر عمل کرو اور ایک نصیحت پذیر، برائی سے باز آنے والے کی سی طبیعت پیدا کرو۔

۵۔ یہ کیا بات ہے کہ تم عقلمندوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور خوبصورت شہوت انگیز لڑکیوں کی بات پر کان دھرتے ہو؟

۶۔ تمہارے پاس ایسا شخص آتا ہے کہ اگر تم کو کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے پر اشرفیوں کی تھیلی دی جائے تو تم نہ دیکھو۔

۱۱۔ اگر تم شریف ہوتے تو تلوار کا ایسا وار کرتے کہ اس کی جان نکل جاتی۔

(۳) مُعاذ بن مُعاذ جب بصرہ کا قاضی مقرر ہوا تو اَبان نے ذیل کے اشعار سے قاضی کو راستبازی کی تلقین کی:۔

۱۔ اے نیک معاذ بن معاذ اور اے پہلے عقل مند!

۲۔ خاندان لاحق کے لوگ اور قبیلہ بنو تمیم کے مختلف افراد اب تیار ہو گئے ہیں (یعنی تمہارے عہدہ سے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لئے)

۳۔ ہماری مسجد میں باوجود اس کے تنگ ہونے کے بری طرح بھر گئے ہیں (قاضی معاذ کی عدالت)

۴۔ وہ اپنی قمیصیں اُرس کر بیٹھ گئے ہیں اور سجدہ گاہ کو لہسن (غالباً گوز) سے خوب رگڑا ہے
۵۔ ان میں سے ہر ایک امید کرتا ہے کہ تم یتیم کا مال اس کے سپرد کردوگے (قاضی یتیم کے مال کا منتظم ہوتا تھا)
۶۔ لہٰذا خدا سے ڈرتے رہنا، تم پر بڑی بھاری ذمہ داری آگئی ہے۔

(۴) اَبَان کی غزل کا نمونہ :۔
۱۔ وصال کے بعد وہ تم سے جُدا ہو گئی میں اس کی لیت ولعل سے اُکتا گیا ہوں۔
۲۔ اس نے تیرِ نظر تم پر ایسے بے خطا چلائے کہ تمہارے دل کے پار ہو گئے۔
۳۔ جب اس نے میری شگفتگی دیکھی تو نظر امید بالکل ہٹالی۔
۵۔ اس کے ساتھ لطف گفتگو سے میری پیاس بجھ جائے گی۔
۶۔ دل اس کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے اور اس کی بے کلی رہتی ہے۔
۷۔ دن بھر اس کے فراق میں آنسو نہیں رُکتے۔
۸۔ رات بھر اس کی فرقت کے بھیانک غموں سے سرگوشیاں کرتے گذرتی ہے۔
۹۔ اور ہر وقت اس کی خیالی تصویر پر نظریں جمی رہتی ہیں۔
۱۰۔ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ بےفکری سے رات بسر کرتی ہے۔ میرا اس کے دل میں خیال تک نہیں آتا۔
۱۱۔ وہ اتنی حسین ہے کہ اگر اس کو اپنی صورت بنانے کا اختیار مل جائے تو وہ اپنی موجودہ صورت سے زیادہ دلکش نہیں بنا سکتی۔
۱۲۔ شباب کی رونق اس کے گالوں میں ہے اور خوبصورتی اس کے کپڑوں کے نیچے۔

(۵) بڑھاپے میں جوانی کی نشاط اندوزیوں کی یاد اس زمانہ میں بہت سے مالدار اور دربار سے تعلق رکھنے والے لوگ کوٹھیوں، باغوں اور دریا کے کناروں پر رقص و شراب نوشی کی محفلیں منعقد کر کے دادِ عیش دیتے تھے شعراء اور رند مزاجوں کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ اَبَان نے جو جذبات پیش

گئے ہیں وہ محلوں اور دربار سے تعلق رکھنے والوں کے جذبات کی آواز باز گشت ہیں ؛ جاہلیت کے اکثر شعراء کی زندگی کا آئیڈیل بھی یہی تھا طرفہ اور عبیدہ بن الأبرص نے بھی اَبان کی طرح تین لذتوں کو زندگی کی ساری لذتوں کا خلاصہ قرار دیا ہے اور اس کے اور اُن کی لذتوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے،

۱۔ اگر بڑھاپے نے میرے لہو ولعب کی باگ پکڑ لی ہے اور میں زیادہ مزے نہیں اڑا سکتا تو صبر کا موقع ہے۔

۲۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب بہت سی راتوں میں میں نے ایسے مزے لوٹے تھے کہ راتیں چھوٹی معلوم ہونے لگی تھیں۔

۳۔ اور بہت سے دنوں میں ایسے لطف اُٹھاتے تھے کہ وہ گریزپا نظر آتے تھے جن کو ایک نوخیز لڑکی کی صحبت جو روشن چاند کی طرح خوبصورت تھی چھوٹا کر دیتی تھی۔

۴۔ جب میں اس کے سامنے شان سے بیٹھتا اور اُس کی انگلیاں تار و نیہ حرکت کرنے لگتیں اور وہ گانا شروع کرتی : اَلَمْ تَرْبَعْ بمنزلة ودد۔

۵۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ گویا میرے سر پر تاج رکھا ہے اور میں تخت پر بیٹھا ہوں اور مجھے سلام کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ مجھے زندگی کا لطف بس تین چیزوں میں منحصر نظر آتا ہے۔

۷۔ (الف) دھوپ میں پکی ہوئی شراب جس پر آنچ نہ لگی ہو اور جس میں ہانڈی کے میل کچیل کی بو نہ آتی ہو۔

۸۔ (ب) دو کنیزیں (خوابصورت لڑکیاں) جن میں سے ایک ڈھول پر اور دوسری ستار پر عمدہ گاتی ہو۔ اور

۹۔ (ج) نوجوان، خوش اخلاق و خوش ادا دوست جو

۱۰۔ ایک دوسرے پر جام شراب کی گردش کے وقت جان نثار کرتے ہوں۔

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(۹)

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

عوارض اور وفات اگرچہ نواب صاحب مرحوم کو جوانی میں نقرس کی شکایت پیدا ہو گئی تھی اور اس کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ یہ خاندانی شکایت ہے پھر بھی مجموعی طور پر ان کی صحت قابل رشک تھی۔

۱۹۳۷ء میں اپنے چھوٹے صاحبزادے مرزا غلام نظام الدین کی سفارش کے لئے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ صاحبزادے انگریزی فوج میں سپاہی تھے نواب صاحب کا خیال تھا کہ حیدرآباد کی فوج میں تبادلہ کرادیں چنانچہ ان کو حیدرآباد کی فوج میں میجر کا عہدہ ملا۔ حیدرآباد میں سائل مرحوم نے نواب منظور یار جنگ بہادر کی کوٹھی مقابل عثمانیہ یونیورسٹی میں قیام کیا۔ ایک روز شب میں آرام کرسی پر مصروف مطالعہ تھے رات کے بارہ بجے کے قریب فارغ ہو کر استراحت کے ارادے سے پلنگ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پیر کے انگوٹھے میں تہمد کا کونہ الجھ گیا۔ ایک کولھے کا جوڑ اتر گیا ہڈی پچک گئی۔ گیارہ ہفتے تک ہسپتال میں رہے۔ اور ۱۹۳۸ء میں دہلی واپس آگئے۔ جب سے آخر تک ٹانگیں اور نیچے کا دھڑ بالکل بیکار رہا۔ بلکہ اکثر پیروں میں زخم بھی ہو جاتا تھا اور کافی عرصے تک رہتا تھا۔ پانچ چھ سال سے اختلاج بھی رہتا تھا۔ پانی اتر آنے کی وجہ سے آنکھیں تقریباً جاتی رہی تھیں صرف اندھیرے اجالے کا امتیاز باقی رہ گیا تھا اس طویل بیماری اور معذوری کے زمانے میں نواب افتخار علی خاں رئیس پاٹودی نے تبدیل آب وہوا کی غرض سے پاٹودی میں بلایا۔ نواب افتخار علی خاں بن نواب ابراہیم علی خاں مرحوم سائل صاحب کے نواسے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی بھانجی شہر بانو بیگم نواب افتخار علی خاں کی والدہ تھیں۔

کئی بار تبدیل آب و ہوا کی غرض سے پاٹودی تشریف لے جاکر قیام کیا آخری بار بھی اسی سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ مگر دوسرے تیسرے دن طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور جمعہ کی شام کو سخت تکلیف کی حالت میں دہلی واپس لایا گیا۔

بروز ہفتہ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۷ شوال ۱۳۶۴ھ بوقت صبح ۱/۲ ۱۰ بجے اس دار فانی سے عالم بقا کی طرف رخ کیا۔

راقم تذکرہ کے پاس گیارہ بجے خبر پہنچی۔ دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اس وقت دولت خانے پر مرحوم کے قریبی اعزہ میں سے کوئی نہ تھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ بڑی مشکل سے طبیعت پر قابو پایا۔ اس عبرتناک منظر کو دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔ آہ!

بیگم صاحبہ ریاست پاٹودی ہی میں تشریف فرما تھیں۔ اور صاحبزادے (مرزا قطب الدین محمد میاں) شہر دھرمسالہ میں تھے۔ شام کو بیگم صاحبہ ۵ بجے دہلی پہنچ گئیں۔

۸ شوال ۱۳۶۴ھ ۹ بجے صبح کو جنازہ لال دروازے سے اجمیری دروازے لے جایا گیا اور عربک کالج میں نماز جنازہ ہوئی۔ اس وقت زعماء و مشاہیر میں سے جناب خواجہ حسن نظامی اور داغ مرحوم کے شاگرد پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی مجسٹریٹ۔ لالہ دھرم پال گپتا ایڈیٹر اخبار تیج اور ان کے علاوہ ہر طبقے کے سینکڑوں ہندو مسلمان موجود تھے۔ نماز جنازہ کے بعد موٹروں کے ذریعہ جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں اندرون صندل خانہ اپنے چچا اور دادا کے قریب اس مکارم اخلاق اور علم و ادب کے آفتاب عالمتاب کو خاک میں چھپا دیا گیا۔

کس قدر حسرتناک تھا وہ دن جب سائل کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ یہ سائل دہلوی کا جنازہ نہ تھا مشرقی تہذیب، مشرقی تمکین و وقار کا جنازہ تھا۔ دلی مرحوم کے روایتی اخلاق و مکارم اور دلی کی گلیوں کی "ذوقی" جاذبیت کا جنازہ تھا جس کو ہم نے اپنے کندھوں پر لے جاکر اسی سرزمین میں دفن کر دیا جہاں سے یہ سرچشمہ پھوٹا تھا یعنی یادگار سطوت اسلام گہوارۂ عروج اقوام جوار مسجد قوۃ الاسلام

جب استاد مرحوم اور ان کی توجہات کا تصور آتا ہے، گلا گھٹنے لگتا ہے، وحشت ہونے لگتی ہے

میں اپنے آپ کو ایسے پروانے کی مانند سمجھتا ہوں جس کو محیط شش جہت تاریکی میں دور سے شمع کی روشنی نظر آجاتے اور وہ اپنے پورے جنونِ شوق کے ساتھ لپکے، ناگاہ شمع گل ہوجاتے اور وہ چار سو سر ٹکراتا پھرے۔ نہ اس کو موت آتی ہے کہ عذاب ہجر سے نجات ملے اور نہ جلوۂ محبوب میسر آتا ہے کہ اس کے دل کی چنگاری شعلۂ حسن سے متصل ہوکر حیاتِ ابدی حاصل کرے۔

بہرحال شہر میں متعدد تعزیتی جلسے ہوئے مرثیے پڑھے گئے۔ مضامین شائع ہوتے۔ ایک قابل ذکر وہ تعزیتی اجتماع ہے جو مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو جناب نوح ناروی کے اہتمام سے صاحب زادہ قطب الدین محمد میاں کی زیرِ صدارت مرحوم کے دولت خانے پر منعقد ہوا تھا جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے اکثر شعراء اور مشاہیر نے شرکت کی۔ اور بے شمار تعزیتی قطعات و رباعیات اور نظمیں پڑھی گئیں۔ مرحوم کے متعلق جو نظمیں کہی گئی ہیں ان میں سے بعض درج ذیل کرتا ہوں:۔

قطعہ

(از جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی)

مرنے کا زندگی میں نہ رنج و محن گیا ... بیخود کو داغ دے کے سرِ اہل وطن گیا

سائل نے مر کے بزمِ سخن کو مٹا دیا ... سائل کے ساتھ قبر میں لطفِ سخن گیا

نوحۂ وفات حسرت آیات عالی جناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

(از جناب پنڈت ترھبون ناتھ زتشی زار دہلوی ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

تھا کبھی جنت نشاں اُجڑا وطن ہندوستاں ... یہ جہاں آباد دہلی جس کی تھی روحِ رواں

وجہ عظمت اس کے تھے جو لٹ گئے وہ خانداں ... اب نہ باقی کارواں ہے اور نہ میرِ کارواں

شعلۂ بربادی و نکبت نے پھونکا آشیاں ... ہوگئے علم و ادب کے سب مُربّی لامکاں

کہنہ تہذیب و تمدن کی پریشاں ہے دکاں ... کاملانِ خطۂ دہلی ہوئے بے خانماں

صوفیا آنکھوں سے اوجھل اولیا ہیں سب نہاں ... شین و میں ان کے لئے کرتے ہیں اب کروبیاں

اب نہ خسرو ہیں نہ اُن کے عہد کے گوہر فشاں ... ہوگئے انگل پہیلی اور مکرنی چیستاں

میر، سودا، مصحفی اللہ کو پیارے ہوئے ذوق، مومن اور غالب کا مٹا نام و نشاں

اب ضمیر و بسمل و سرور و ولی باقی نہیں چل بسے مضطر نسیم و مصدر شعلہ زباں

یہ تو تھے متقدمیں، متاخریں کا ماجرا کیا بیاں کیجیے کہ ہیں چشمانِ گریاں خونچکاں

سالک و مجروح حالی و ظہیر نغمہ سنج انور و عارف ذکی آزاد دیکتائے زماں

تھے ادیب و ارشد و دیراں اسی گھر کے چراغ تھے یہیں داغِ فصیح الملک استادِ جہاں

شیفتہ و نیرِ رخشاں تھے ایسے تاجور دلی ان کے دم سے دلی تھی یہ تھے دلی کی جان

ثاقب و طالب فروغ و مہر اختر اور شمیم سالم و مشتاق و جوہر تھے یہیں طب اللساں

راسخ و ساقی و تاباں اور راحل خاں یہ سب ایک اک کر کے ہوئے رہ گیر ملکِ قدسیاں

دیکھتے ہی دیکھتے اس باغ میں پت جھڑ ہوئی اب نہ وہ غنچے نہ وہ گل ہیں نہ ہے وہ گلستاں

رہ گئے تھے چند خوش گو جو یہاں چھوٹے بڑے میٹ کر ان میں سے اکثر کو رہا یہ آسماں

ابتدا میں برق دہلی سے مرخص ہو گئے بعد میں رونق ہوئے راہی سوئے باغِ جناں

شاعرِ معجز سے پھر خالی ہوئی بزمِ سخن پھر ہوئے فردوس منزل ساحرِ جادو بیاں

یادگارِ راسخ مرحوم شیدا نکتہ رس چل دیئے سوئے ارم پا کر اسے دارالاماں

ہو گئی ویراں سرا یہ دہلی برباد و ریش جا بسے نواب سائل جب میانِ نوریاں

تھے سراج الدین احمد خان سائل دہلوی حامیِ اخلاق و آداب و رواجِ باستاں

شاعرِ نامور ادیب بذلہ سنج و خوش خصال تھے بہارِ باغِ داغِ بلبلِ ہندوستاں

وقف بہرِ دوستاں شفقت محبت گر رہی تھی مروت آپ کی مختص برائے دشمناں

چشم نم ہیں اُن کے ماتم سے سبھی برنا و پیر دل ہے میرا خوں چکاں آنکھیں ہیں خوں نابہ فشاں

نوحہ بھائی آئے ہیں جہلم میں ہو نیکو شریک شمع کشتہ کے ہیں یہ پروانۂ آتش بجاں

ہم ابھی دو زخم جب ہیں اور تم ہوتے سدا رنشیں ہائے اے نواب بھائی تم کہاں اور ہم کہاں

ہوں اگر ہیں نغز گو دہلی سے باہر سینکڑوں میں ہوں ارباب وطن کا اپنے لیکن نوحہ خواں

جب کہیں ہوتے غزلخواں بھائی سائل سنتو سب
روزمرہ چُست بندش ٹھیٹھ دلی کی زباں

دے خُدا اُستادزادی کو مری صبر جمیل
اور قطب الدیں کو عمر خضر عیش جاوداں

سال عیسٰی کے لئے مخرج بنی ہے یہ دُعا
سائلِ شیوا بیاں ہو جنتی خلد آشیاں ۱۹۴۵

سنہ ہجری ملہم غیبی نے یوں انشا کیا
نارد دہلی پر پڑا یہ جبر یہ قہر آسماں ۱۳۶۴

رودادِ وفاتِ حسرت آیات جناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی

از جناب نوح ناروی صاحب

آج دنیائے سخن کیوں موردِ آلام ہے
آج کیوں اربابِ فن میں ہر طرف کہرام ہے

آہ کاہش آہ کاوش آج دونی ہو گئی
آہ دلی آہ دلی آج سونی ہو گئی

قوتِ ضبط و تحمل سے رہا جاتا نہیں
منہ کو آتا ہے کلیجا کچھ کہا جاتا نہیں

دفعتاً تاریکیِ قسمت کا پھیرا ہو گیا
مٹ گئی ساری تجلی گھپ اندھیرا ہو گیا

دل تڑپنے سے کوئی لحظہ سکوں پاتا نہیں
دامنِ تسکیں کسی صورت سے ہاتھ آتا نہیں

زمزمہ پردازیاں رنگیں چمن کی لٹ گئے
معرکہ آرائیاں بزمِ سخن کی ہائے ہائے

آفتاب اسلاف کا زیرِ زمیں پوشیدہ ہے
کثرتِ گریہ سے جو دیدہ ہے وہ نم دیدہ ہے

حسن قاضی کی فضائیں خاک میں سب مل گئیں
لال دروازہ کی اینٹیں فرطِ غم سے ہل گئیں

ہر در و دیوار پر بے رونقی سی چھا گئی
وقت سے پہلے زمانے میں قیامت آگئی

کم نہیں انساں کے حق میں کسی انساں کا غم
قہر ہے مرزا سراج الدین احمد خاں کا غم

داغ دے کر حضرت سائل جہاں سے اٹھ گئے
داغ کی آغوش میں پہنچے یہاں سے اٹھ گئے

داغ ہی کا داغ دنیا کے لیے کچھ کم نہ تھا
کون سادہ دل تھا جو پُر داغ دشتِ غم نہ تھا

بھول کر بھی عرضِ حاجت کی طرف مائل نہ تھے
تھا تخلص صرف سائل ورنہ وہ سائل نہ تھے

جانتے تھے خاص وہ اپنا تمنائی مجھے | کس کو بھائی میں کہوں کون اب کہے بھائی مجھے
پاک فطرت پاک سیرت اور اُنسا کون تھا | نیک نیت نیک خصلت اور اُنسا کون تھا
خوش ادائی وضع داری جامہ زیبی ختم تھی | دل رُبائی دل ستانی دل فریبی ختم تھی
قول فیصل حسبِ موقع یاد کیا کیا آئیگا | جو پڑے گی بحث اسے کیونکر کوئی سلجھائیگا
کس کی تحقیقات پر فکرِ رسا اترائے گی | کس کی بولی مستند عالم میں مانی جائیگی
ہائے وہ ان کا تکلم وہ ادبِ دلی کی شان | ہائے وہ انکا ترنم وہ غزل خوانی کی شان
تھا جہاں آباد میں جس سے وقارِ شاعری | تخت گہ سے اُٹھ گیا وہ تاجدارِ شاعری
دن گذارے زندگی کے حشمت و شوکت کیساتھ | ملنے والا کوئی آیا تو ملے اُلفت کیساتھ
تھے ہزاروں نکتہ ہائے خوب تر ہر بات میں | جمع تھے لاکھوں فضائل اک گرامی ذات میں
جو غزل لکھی وہ معنی کا خزینہ بن گئی | بیت جو نکلی قلم سے وہ نگینہ بن گئی
حرف رکھنا سہل تھا کب نکتہ چیں کیواسطے | لفظ جیسا تھا جہاں بھی تھا وہیں کیواسطے
قدر دانوں سے کوئی پوچھے یہ کیسی موت ہے | درحقیقت شاعری کی موت ایسی موت ہے
جس قدر احباب تھے اس رسم پر مائل ہوئے | ابنِ سائل جانشینِ حضرتِ سائل ہوئے
جب نگاہِ حسرت آگیں جانبِ مدفن گئی | سُرمۂ چشمِ بصیرت خاکِ مرقد بن گئی

سب کہیں آمین سن کر اس دعائے نوح کو
دے جگہ فردوس میں اللہ اُن کی روح کو

نوحۂ وفات حسرت آیات عالی جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل

از جناب نہال سیوہاروی

ہے جوشِ غم ہمہ تن، بے قرار ہے دلی | کسی دُکھے ہوئے دل کی پکار ہے دلی
فغاں کا عالم شعر و سخن سے شور اُٹھا | گری چمن پہ وہ بجلی، چمن سے شور اُٹھا

رہینِ نوحہ گری ہر ادب شناس ہوا　　دیارِ غالب و مومن اُداس، اُداس ہوا

ظہورِ ظلمتِ غم بزمِ بے چراغ سے ہے　　بلند شورِ بکا سرزمینِ داغ سے ہے

دلِ جہاں پہ قیامت گذر گئی یارب　　ضیائے نیرِ رخشاں کدھر گئی یارب

جفائے خنجرِ دوراں سے دلفگار ہوں میں　　ندیم! جام اُٹھالے کہ سوگوار ہوں میں

نکاتِ فن کئے اک عمر جس نے حل نہ رہا　　دریغ ساقیِ میخانۂ غزل نہ رہا

زدیدہ موجۂ خوناب حاصل است مرا
چہ دشنہ در جگر از مرگِ سائل است مرا

بلند رتبہ و عالی مقام تھا سائل　　جہانِ شعر و ادب کا امام تھا سائل

سخنوری میں مسلّم وقار تھا اُس کا　　ہر ایک شخص عقیدت گذار تھا اُس کا

وہ کیف بارِ حیات آفریں غزل اُسکی　　بہارِ تازہ کی صورت حسیں غزل اُسکی

وہ مثنوی میں طبیعت کا رنگِ جولانی　　فرازِ کوہ سے بہتا ہو جس طرح پانی

جُدا زمانے سے انداز شعر خوانی کا　　ہر اک زباں پہ وہ ذکر اُس کی خوش بیانی کا

اسیرِ خوابِ اجل نغمہ خواں ہوا صد حیف
خموش طوطیِ ہندوستاں ہوا صد حیف

بیاں نہ ہو وہ مصیبت ہے رحلتِ سائل　　وداعِ خُلق و مروّت ہے رحلتِ سائل

ترے فراق میں خوں گشتہ ہر جگر ہے آج　　شبیہہ غالبِ مرحوم تو کدھر ہے آج

گُذر جہاں تھا وہ راہیں تلاش کرتی ہیں
ترے وطن کی نگاہیں تلاش کرتی ھیں

قطعۂ تاریخ وفات

(از سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی)

وفاتِ حضرت سائل سے ہو گیا تازہ
وفاتِ داغ فصیح الکلام کا صدما

زبان اُن کی وہی تھی جو داغ کی تھی زبان
وہی تھا رنگِ سخن اور وہی تھی طرزِ ادا

جنابِ ثاقب و نیر کی یادگار تھے وہ
انھیں کے دم سے تھا زندہ کمال غالب کا

انھیں کی ذات تھی دلی میں مایۂ نازش
وہی تھے اپنے زمانے کے افصح الشعرا

وہ خوش بیان و خوش الحان و ماہر فن تھے
وہ آپ خلق و مروت میں تھے جواب اپنا

پچاس سال سے ان سے تھی دوستی میری
پچاس سال سے تھے مجھ پہ وہ کرم فرما

نہ آج راسخ و شاعر نہ ساحر و سائل
زبان دہلی انھیں کے لئے ہے نوحہ سرا

سُنیں گے کس سے سنائینگے کسکو دلی میں
سخن ہے کوئی نہ اب ہے کوئی سخن آرا

ہزار صدمے ہیں اک جان ناتوان میری
ہزار داغ الم اک دل حزین میرا

سناؤں ورد بھری داستان غم کس کو
سُنے گا کون یہ میری شکست دل کی صدا

اس انجمن میں ہے کیفی جو ایک شمع سحر
سلامت اس کو مرے مرنے تک تو رکھے خدا

دُعا کا وقت ہے اطہر دعا خدا سے کر و
ملے بہشت میں سائل کو درجۂ اعلےٰ

سنین رحلت مرحوم حضرت سائل
لکھو کہ (شاعر شیریں بیاں جہاں سے گیا)
۱۳۶۴ھ

رُباعیات

سائل کی زبان تھی زبانِ دہلی
سائل کا بیان تھا بیانِ دہلی

دم ان کا غنیمت تھا بہت دہلی میں
تھی دم سے انھیں کے آج شانِ دہلی

شاعر نہیں وہ شعر کے استاد بھی تھے — ماہر نہیں وہ ماہر نقاد بھی تھے
دلی کے نہ صرف اہل زبان تھے سائل — وہ داغ سے استاد کے داماد بھی تھے

خوش فکر خوش اخلاق خوش آواز بھی تھے — بلبل کی طرح زمزمہ پرداز بھی تھے
اندازِ سخن سب سے جدا تھا ان کا — موجد بھی تھے وہ صاحب انداز بھی تھے

سائل کو بجا دعوائے یکتائی ہے — تحقیق میں ہم رتبۂ صہبائی ہے
استاد ہے وہ اور مکمل استاد — سائل کی مسلم سخن آرائی ہے

قولہ تعالیٰ:- وَلَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُوْنَهَا

۱۳ . ھ ۶۴

استاد مرحوم نواب سراج الدین احمد خاں سائل کی یاد میں

(از مولوی حفیظ الرحمان واصف)

کیوں یکایک اہل محفل پر اداسی چھا گئی؟ — ہمدمو! دل تھام لو واصف کی باری آگئی
آج سائل! آہ سائل! کیا ہوا؟ کس نے کہا؟ — کوچہ و بازار میں کیسا ہے محشر سا بپا؟
کیا سناؤں تم کو اپنے درد و غم کی داستاں — کیا دکھاؤں تم کو اپنے دل کی چوٹوں کے نشاں
ختم ہیں آنسو مگر دل کو قرار آتا نہیں — زخم بھر جاتے تو ہیں لیکن نشاں جاتا نہیں
حسرت آگیں ہے کہانی شاعر مظلوم کی — مٹ گئی خاص اک نشانی دہلی مرحوم کی
دل کہ جو ہے صد ہزار اسرار فطرت کا امیں — آج ہے لیکن ضبط غم کی تاب لا سکتا نہیں
ٹھیر جا دم بھر دلِ بیتاب! رو لینے دے مجھے — مرقدِ سائل پہ گوہر بار ہو لینے دے، مجھے
یادِ اجمل خاں تھی اب تک جاں گسل واحسرتا — آج صرفِ ماتمِ سائل ہے دل واحسرتا
اے کہ تجھ سے گلستانِ مکرمت شاداب تھا! — تو کتاب عظمت اسلاف کا اک باب تھا
اے کہ تھی تیری نگاہوں میں قیامت کی کشش — دل کی گہرائی سے ہوتی تھی محبت کی کشش

جادۂ انوارِ قدسی تھا ترا تارِ نگاہ
تھی وجاہت تیری اک تمثیلِ تخلیقِ الٰہ

تیرا خُلق و اعتنا تھا در خورِ صد احترام
دل کا تیری اک نگاہِ مہر سے ہوتا تھا کام

محرمِ اسرارِ الفت دیدۂ بینا ترا
روئے روشن کی طرح تھا منجلی سینہ ترا

رشکِ تمکینِ ابوۃ تیری شانِ حلم تھی
پرتوِ شانِ نبوۃ تیری شانِ حلم تھی

آشکارا تیرے چہرے پر وقارِ باستان
تیرے خط و خال میں مسطور گذری داستان

آستاں تیری سخا و مرحمت کی سجدہ گاہ
یادگارِ شوکتِ دیرینہ تیرا افسر و جاہ

شرحِ رازِ نیکی و احساں تکلم تھا ترا
جلوۂ صد صبح، فردوسی تبسم تھا ترا

تیرا ہر فرمودہ نکہت بار و لطف انگیز تھا
تیرا اک اک لفظ علم و فن کی دستاویز تھا

جسم ہے موجود اور معدوم جانِ شاعری
مٹ گیا تیرے نہ ہونے سے جہانِ شاعری

وہ سراج الدین تھے دلی کے شمعِ انجمن ق
ایک شاہِ ہند تھا اور اک شہنشاہِ سخن

ختم اُس پر آلِ بابر کی وجاہت ہو گئی
ختم تجھ پر ذوق و فردوسی کی عظمت ہو گئی

اک ظفر کیا لُٹ گیا مغلوں کی دولت لُٹ گئی
ایک سائل کیا اُٹھا دلی کی دولت لُٹ گئی

کون اب ہم کو نکاتِ فن بتانے آئے گا
کون اب سوئے "کتب خانہ" کرم فرمائے گا

محفلِ دلی نشیں کی جمعیت پریشاں ہو گئی
رونے والی شمع اک تھی وہ بھی اسکو رو گئی

کوچۂ رضواں میں جب سائل نے جا کر دی صدا
زمزمہ سنجانِ طوبیٰ نے پکارا، مرحبا!

مرحبا اے ہم صفیرِ مومن و داغ و حزیں
مرحبا اے میہمانِ جلوہ گاہِ حورِ عین

ہو مبارک تجھ کو فضل و رحمتِ پروردگار
ہو مبارک تجھ کو باغِ خلد و طرفِ جوئبار

خاکِ مہرولی کہ مہدِ نعمتِ اسلام ہے
اب وہیں پوشیدہ واصف آفتابِ شلم ہے

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ
اور
جنگ پانی پت
(۵)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

شاہ نادر کے مخبروں نے یہ خبر گوش گذار کی ملہار کی ماتحتی میں پچیس ہزار مرہٹے سوار راستہ کو روکنے کے لئے آ گئے ہیں شاہ درانی نے اپنی فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا اور شاہ پسند خاں جو حسین اور قوی الجثہ سردار افاغنہ تھا اس سے ارشاد فرمایا کہ اے شاہ پسند خاں آج مرہٹوں کی اس فوج کی تنبیہہ اور تادیب تمہارے ذمہ ہے یہ لوگ ہمارا راستہ روکنے کے لئے پڑے ہوتے ہیں۔

خان مذکور نے آداب بجالا کر اپنے تین ہزار سواروں کو لے کر کوچ کر دیا اور مرہٹوں پر جا پڑا بڑے زور شور کا مقابلہ ہوا۔ انجام کار مرہٹے بھاگنے پر مجبور ہوئے اور شاہ پسند خاں مظفر و منصور اسی طرح حاضر حضوری شاہ درانی ہوا اس کے ہر ایک سپاہی کے ہاتھ میں مرہٹوں کے دو دو تین تین سر تھے وہ شاہ کے سامنے لاکر ڈال دیئے بادشاہ شاہ پسند خاں سے بہت خوش ہوا اور ہر سپاہی کی ہمت افزائی کی اور ہمکلامی کا ہر ایک کو شرف بخشا۔

بھاؤ نے جب بادشاہ کے دریائے جمنا سے عبور کرنے اور مرہٹوں کی فوج کے شکست پانے کا حال سنا تو اس کے دل پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ سرہند جاتا جاتا الٹا پانی پت کی طرف لوٹا اور شہر کے جانب شمال توپوں کا حصار لشکر کے گرد باندھا اور خوب عمیق و عریض خندق کھود کر خاک خندق سے ایک قلعہ لشکر کے چاروں طرف بنا لیا۔

۱۹ رجمادی الاوّل کو بہاؤ پانی پت پہنچ کر حصار و خندق توپوں کے زنجیرہ سے فارغ ہو گیا تھا شاہ درانی سنبھالکہ کی سرائے سے چلا تو چند کوچ مغرب کی طرف گئے اور لشکر کے لاغر جانور اور بیکار سامان کو دانستہ پیچھے چھوڑتا گیا۔ مرہٹے یہ سمجھے کہ شاہ درانی ہماری افواج قاہرہ اور جمعیت کی کثرت دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ مقابلہ پر آنا نہیں چاہتا اور اسی طرح بھاگتا ہوا افغانستان چلا جائیگا انھوں نے پیچھے رہے ہوئے سامان کو لوٹنے کے لئے یورش کی سردار خاں جہان خاں کو لٹیرے مرہٹوں پر عقب سے حملہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا اس طرح بیس ہزار مرہٹے تہ تیغ ہو گئے بہاؤ کے پہونچنے کے تیسرے روز احمد شاہ درانی اور نواب نجیب الدولہ وغیرہ ۲۱ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ کو پانی پت پہونچگئے شجاع الدولہ بھی شرما شرمی مجبوری درجہ اپنی دس ہزار فوج سے پانی پت پہنچا اس کے ساتھ اودھ کے ٹھاکر تعلقہ دار گوسائیں بیراگی جن کے ہندو افسر امراؤ گر و ہمت گر و تھے۔

نواب احمد خاں بنگش کی نواب نجیب الدولہ سے کشیدگی تھی جب شجاع الدولہ اودھ سے شاہ درانی کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوا اور احمد خاں بنگش کو غازی الدین کی تباہی کا بھی یقین ہو گیا تو اس نے نجیب الدولہ سے آشتی کی طرح ڈالی اور شاہ درانی کی خدمت میں حاضر ہوا نجیب الدولہ بہت اونچے خیال کا فرد تھا قومی اغراض کے مقابلہ میں ذاتی غرض اور جذبات کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا چنانچہ احمد خاں بنگش نجیب الدولہ سے ملنے آئے تو وہ دور تک خود پیشوائی کو گئے اور شگفتہ چہرہ اور محبت سے لبریز دل لے کر بغل گیر ہوئے اور بھائی کہہ کر خطاب کیا غرضکہ احمد شاہ درانی کی ہمرکابی میں حضرت نجیب الدولہ، دوندے خاں، احمد خاں بنگش، شجاع الدولہ، حافظ رحمت خاں نواب محبت خاں، شاہ ولی خاں وزیر اعظم، جہان خاں، شاہ پسند خاں، نصیر خاں، برخوردار خاں وزیر اللہ خاں قزلباش، مراد خاں ایرانی نہ نظام الملک کا کوئی نمائندہ تھا نہ اور کسی مسلم صوبہ دار کا وکیل بقول شخصیکہ مٹھی بھر غیور مسلمان قوم افاغنہ جان کی بازی لگا کر دکنی قوت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوتے تھے یہ ضرور ہے کہ ۔ درانی سب نہایت جسیم اور زور آور تھے اور سواری میں کسی کے پاس ترکی گھوڑے کے سوا دوسری نسل کا گھوڑا نہ تھا یہ لوگ بڑے محنتی، مضبوط اور جنگ میں مشاق تلوار کے

---

۱ مطلع العلوم ۲؍ شعبان منشی سدا سکھ لال مطبوعہ نولکشور نمبرہ

دہتی روہیلہ ان کے بعد شجاعت اور مردانگی میں درجہ رکھتے تھے مگر شاہ درانی کے پاس سامانِ حرب بھی بہت ہی کم تھا صرف تیس توپیں تھیں جن میں پورے طور پر کام دینے والی صرف بیس ہی تھیں گولنداز بھی اچھے نہ تھے البتہ نواب نجیب الدولہ کے پاس جو بان انداز تھے وہ سب سے بہتر کام کرنے والے تھے جو اس لڑائی میں نہایت مفید چیز ثابت ہوئے۔[۱]

راجہ سورج مل | راجہ سورج مل جاٹ نے یہ رنگ جو دیکھا بھاؤ سے بلا کہے سنے اپنے ملک کو لوٹ گیا بھاؤ کے ساتھ غازی الدین، ابراہیم خاں گاردی، فتح محمد خاں گاردی، ملہار راؤ ہلکر، جھکو سندھیا، اباجی گائکوار، جسونت راؤ پنوار، شمشیر بہادر[۲]، بالاجی جادون، راجہ بتیل سہدیو، بلونت راؤ خسرپورہ، افسر بواس راؤ، انتاجی نیکسر، ہر ایک کے ساتھ ہزارہا سوار اور پیادے تھے اس کے سواپنداروں کے سردار، چرگوری اور ہول سوار اور رمیسان بھاتور اور کچھواہہ جو کھوانی شنکر کے سرکردگی دہلی کی حفاظت کے لئے چھوڑ آیا تھا۔

بھاؤ کے ہمراہ مرد میدان ابراہیم خاں گاردی تھا جو سب سے زیادہ بہادر اور خطرناک تھا فرانسیسی جرنیل بسی کا شاگرد تھا اس کی نو دس ہزار فوج بندوقوں سے آراستہ اور یورپ کے قاعدہ سے قواعد داں و شائستہ اور ہندوستان بھر میں بہترین فوج سمجھی جاتی تھی مرہٹوں کے پاس تین سو توپیں تھیں ان میں سو توپیں قلعہ شکن یہ تمام توپ خانہ نہایت آراستہ اور اس کے افسر نہایت عمدگی سے توپوں کو استعمال کرنے والے تھے[۳]

آغاز جنگ | ۲۶ اپریل ۱۷۶۱ء کو طرفین کے ہراولوں کا مقابلہ ہوا شام تک لڑائی رہی آخر مرہٹے پسپا ہوئے اور تخمیناً دو ہزار آدمی ان کی طرف کے مارے گئے۔

خزانہ شاہی پر قبضہ | ایک روز رات کے وقت دہلی سے بھاؤ کے لشکر میں بہت بڑا خزانہ آرہا تھا جس کو غازی الدین نے دہلی سے بھاؤ کی معاونت کے لئے بھیجا تھا مرہٹہ محافظ تھے مگر خزانہ غلطی سے نجیب الدولہ

۱؎ عبرت مضمون ذکر پانی پت کی لڑائی کا، صفحہ ۴۸ ۲؎ شمشیر بہادر پسر باجی راؤ کہ مادرش دختر دہم مسلمان بود، تاریخ احمد صفحہ ۱۲ ۳؎ عبرت مئی ۱۷ء صفحہ ۱۶۔

کے مورچہ میں اپنا لشکر سمجھ کر آ گیا مرہٹے نے مرہٹی زبان میں کچھ دریافت کیا پٹھان یہ سمجھ گئے یہ لوگ مرہٹے ہیں فوراً مستعد ہو کر دستہ کو تلوار کی گھاٹ اُتارا اور خزانہ کو فتوحات غیبی سمجھ کر اس پر قبضہ کر

انسداد رسد رسانی | احمد شاہ درانی مرہٹوں کے مغرب رُخ مقیم تھے نواب نجیب الدولہ کو یہ اہتمام سپرد ہوا کہ مرہٹوں کی رسد کو روکا جاتے چنانچہ نجیب الدولہ نے نہایت عمدگی سے مرہٹوں کا قافیہ تنگ کرنے کا بندوبست کیا۔

علاقہ سرہند کا زمیندار آلا جاٹ مرہٹوں کو برابر رسد بھجوا رہا تھا نجیب الدولہ نے ایک فوج دستہ بھیج کر آلا جاٹ کی خدمت رسد رسانی کا خاتمہ ہی کرا دیا۔

شاہ درانی کا انہاک جنگ | شاہ درانی رات دن گھوڑے پر سوار رہتا اور ہر حصہ فوج میں خود پہنچ کر تشفی و تسلی احمد شاہ درانی اور امرائے افاغنہ کو پانی پت میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گذر چکا تھا ہراول کی باہمی جھ کے بعد معمولی چھیڑ چھاڑ جانبین میں ہوتی رہی آخر ۲ جمادی الاول کو احمد شاہ درانی نے مرہٹوں حصار و زنجیرہ پر حملہ کرنا تجویز کیا نجیب الدولہ کو مقدمۃ الجیش بنایا اور جہان خاں و شاہ پسند خاں اُن کا کمکی مقرر کیا ان کے پیچھے حافظ رحمت خاں، نواب دوندے خاں، نواب فیض اللہ خاں کی فوج کو رکھا۔

شجاع الدولہ و احمد خاں بنگش کو ان کا کمکی مقرر کیا ان کی پشت پر خود بادشاہ اور اشرف الو شاہ ولی خاں رہے۔ نماز ظہر کے وقت حملہ کیا گیا۔

نماز ظہر کے وقت حملہ کیا گیا نجیب الدولہ بان اندازی کرتے ہوتے مرہٹوں کے سنگر تک پہنچ مرہٹوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا باقی افواج تو سنگر یعنی حصار کے باہر لڑتی رہیں لیکن نجیب الدولہ دس ہزار فوج مرہٹوں کے حصار میں گھس گئی اور مرہٹوں کو مارتی ہٹاتی ہوئی اُن کے کیمپ کے بازار میں جو کیمپ کے وسط میں واقع تھا پہنچ گئی وہاں مرہٹوں نے چاروں طرف سے اُن کو گھیر لیا شام تک خنجر و تلوار سے بازار کارزار گرم رہا خون کے ندی نالے بہ گئے مرہٹوں سے میدان جنگ پٹ گیا بھاؤ کا سالار بلونت سنگھ جو بیس ہزار مرہٹہ سواروں کا سردار تھا ایک روہیلے کے ہاتھ

مارا گیا۔ شام ہونے پر یہ فوج جو مرہٹوں کے حصار میں محصور تھی اور اس کو کوئی مدد بھی باہر سے پہنچ نہیں سکتی تھی خود تہور اور شجاعت کے کارنامے دکھاتی ہوئی اپنے قیام گاہ کی طرف واپس ہوئی اور اپنے ساتھ مرہٹوں کی توپ جو کیمپ کے عین وسط اور بازار لشکر میں رکھی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ گھسیٹ لائے روہیلہ دس ہزار میں سے چار ہزار بچے تھے مگر ہزار ہا مرہٹے اس جھڑپ میں کام آئے مال غنیمت لاتے تھے اس میں ایک "دف" بھی ہاتھ لگا تھا۔ روہیلہ فوج واپس اپنے کیمپ ہو رہی تھی پانچسو جوان حصار کے دروازہ پر رک گئے تھے تاکہ بقیہ روہیلے قرارگاہ کی طرف باطمینان پہنچ جائیں مگر افراتفری میں پانسو کو فوج بقیۃ السیف بھول گئی مگر انھوں نے بہادری کے جوہر ایسے دکھائے مرہٹے پسپا ہوتے اور یہ لوگ مع الخیر اپنے قیام پر دف بجاتے اور گاتے ہوئے شجاع الدولہ کے کیمپ کے قریب ہو کر گذرے شجاع الدولہ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

احمد شاہ درانی کا وقائع نگار لکھتا ہے کہ

"قریب پانصد پیادہ ملازم نواب نجیب الدولہ از زخمہائے شمشیر فواہائے خون از سر و تن شان رواں دف زناں و رقص کناں از لشکر (حصار) شان برآمد نواب شجاع الدولہ حال جراحت در رقص کردن افغانان دیدہ متعجب گشت و گفت کہ آفریں بر جرأت و بہادری ایں جواناں"۔

گوبند پنڈت | گوبند پنڈت بہادری اور دلاوری میں بے مثل گنا جاتا تھا سردار بہاؤ کو معلوم ہوا روہیلہ سردار اور شجاع الدولہ درانی کے علم کے نیچے جمع ہو چکے چنانچہ اس نے گوبند کو حکم دیا کہ افغانی سرداروں اور نواب شجاع الدولہ کے ملک و مال اور اہل و عیال کو برباد کرنے کی غرض سے پایہ تخت دہلی سے پچاس ہزار سپاہ کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔

نادر شاہ نے حاجی کریم داد خاں اور حاجی عطائی خاں کو جو قندھار سے حال ہی میں آکر فوج میں داخل ہوئے تھے حسن اتفاق سے اس وقت بادشاہ کے روبرو مودب کھڑے تھے ان کو اشارہ کیا کہ تم ابھی اپنے لشکر کو لے کر سوار ہو جاؤ اور گوبند پنڈت کو قرار واقعی سزا دو ایک پہر دن باقی تھا کہ یہ دونوں سردار چار ہزار جرار سپاہ لے کر نواب عنایت خاں کی رہبری سے روانہ شاہجہان آباد

ہوئے دریائے جمن سے پار ہوکر مصمم گوبند پنڈت کے کیمپ پر جا پڑے یہاں گوبند پنڈت خوب مزے آزار ہے تھے کہ افغانی افسر ایک انبوہ کثیر کے ساتھ بلا کی طرح ان کے سر پر موجود تھے گوبند پنڈت کی سپاہ نے بھی مسلح ہونا چاہا مگر ان کا بدن قابو میں نہ تھا تاہم ایک سخت جنگ ہوئی چار گھنٹے تک برابر وار ہوتے رہے آخر افغانیوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ مرہٹوں کو قتل کرنا شروع کیا یہاں تک گوبند پنڈت اپنے اٹھارہ ہزار ہمراہیوں کے ساتھ مارا گیا اور بہادروں میں نام روشن کر گیا دوسرے روز دوپہر کے بعد دن ڈھلے یہ دونوں افسر شاہی لشکر میں حاضر ہوتے شاہ کے سامنے مقتولوں کے سر خرجیوں اور فتراک سے نکال کر ڈال دیے بادشاہ بے حد خوش ہوا اور انعام سے نوازا۔

کریم داد خاں اور سردار عطائی خاں خداداد طاقت رکھتے تھے ان کی بہادری اور شجاعت کی دہاک ان کے وطن میں بھی تھی ان کو جہاد سے بڑا شوق تھا اسی خیال سے یہ وارد ہند ہوئے اور داد شجاعت دی اور موقعہ پڑا تو کارہائے نمایاں انجام دیے۔

شبخون[1] ابراہیم خاں گاردی کے بھائی فتح خاں گاردی نے ایک روز مسلمانوں کے لشکر پر شبخون مارنا چاہا لیکن مسلمانوں کے لشکر میں چوکی پہرہ کا انتظام نہایت معقول تھا شبخون ناکام رہا اور بہت سا نقصان اٹھا کر فتح خاں کو واپس جانا پڑا۔

سردار بہادر اور شاہ درانی کی ہر دو فوجیں پڑے پڑے اکتا گئی تھیں روزانہ کے معمولی معرکہ پریشانی کا سبب بن رہے تھے سرداران روہیلہ میں سے کچھ لوگ عاجز آ گئے اور کئی بار انھوں نے بادشاہ درانی سے عرض کیا کہ ایک مرتبہ فیصل شدہ جنگ ہو جانے دیجئے یا میدان ادھر ہے یا ادھر لیکن شاہ درانی نے یہ جواب دیا کہ یہ لڑائی کا معاملہ ہے اور تم لوگ واقف نہیں دوسرے کاموں کا تم کو اختیار ہے جو دل میں آئے کرو لیکن یہ امر میری رائے پر چھوڑ دو جنگ کے معاملہ میں جلدی نہ چاہئے دیکھتے رہو کہ یہ بازی کس طرح تمام ہوتی ہے انشاءاللہ درانیوں کی سپاہ شب و روز ہر طرف سے چست اور ہوشیار رہتی تھی نتیجہ یہ ہوا مرہٹہ فوج میں رسد کی قلت ہونے لگی نجیب الدولہ نے رسد

[1] حیرت

ے کے راستہ مسدود کر دیتے تھے۔

مرہٹہ فوج کے بیس[2] ہزار آدمی جنگل میں لکڑی لینے کو گئے ان کے مقابلہ میں پانچ ہزار
ار جو طلالہ گردی کرتے تھے وہ در آئے ان بیسوں ہزار کو لکڑی اور کھیرے کی طرح کاٹ کر رکھ
ان کے پاس جنگی ہتھیار نہ تھے صرف لکڑی کاٹنے کا سامان تھا کچھ لوگ محافظ مسلح ضرور
تھے مگر بے خبری میں رات کا وقت تھا یہ لوگ بے آئی کام آئے۔ صبح ہوتے ہوتے نعشوں کا
پُش دور دور تک نظر آتا تھا مرہٹوں کو خبر لگی فوج میں واویلا پڑا اور خود بھاؤ بھی اس ماجرے
سے بدحواس ہو کر مغلوب یاس ہوا۔

اد کی صلح جوئی | بھاؤ نے نواب شجاع الدولہ کے پاس پیام بھیجا کہ تم درمیان میں پڑ کے کسی طرح ہماری
صلح کرادو اور بادشاہ کو آمادہ کر دو ہم یہ احسان تا زیست کبھی نہ بھولیں گے اور اپنی پگڑی جو جواہرات
یش بہا سے جڑی ہوئی تھی بھیج کر مستدعی ہوا کہ تم بھی اپنی پگڑی میرے واسطے بھیجو اور مجھے اپنا
گڑی بدل بھائی آج سے سمجھو اور ایک مٹھی زعفران بھی دی کہ مرہٹوں میں ایفائے عہد کے اقرار کا
نشان ہوتا ہے نواب نے اس امر کی اطلاع وزیر اعظم شاہ ولی خاں کی وساطت سے بادشاہ
درانی کے حضور تک پہنچائی بادشاہ نے جواب دیا ہم سردار روہیلہ کے بلانے سے یہاں آئے
لہ اس کو اور سب مسلمانوں کو مرہٹوں اور غدار بھائیوں کی اطاعت سے نکالیں ہم کو صرف لڑائی
کے بند و بست میں اختیار ہے باقی رہی صلح سو اس کو تم سب سردار جانو جس طرح مناسب سمجھو
صلح کی گفتگو کرو[1]۔

شجاع الدولہ مرہٹوں سے سازباز رکھتے تھے انھوں کے کہنے سے ہندوستان کے
میروں کی مجلس کنگاش منعقد ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ، نواب احمد خاں بنگش، نواب
افظ رحمت خاں، نواب دوندے خاں، نواب نجیب اللہ خاں، نواب عنایت خاں وغیرہ سب
نے صلح ہو جانے کو غنیمت سمجھا کیونکہ اپنی قلت و کمزوری اور مرہٹوں کی کثرت و طاقت دری کو سب

ذکر پانی پت کی لڑائی صفحہ ۷۵ معلم العلم ۱۹۵۵ء نج ۵

محسوس کئے ہوتے تھے لیکن تنہا نواب نجیب الدولہ نے سب کی مخالفت کی اور کسی طرح صلح پر رضامند نہ ہوتے جب سب نے جنگ کو صلح پر ترجیح دینے کا سبب دریافت کیا تو نجیب الدولہ نے بیان کیا کہ

نجیب الدولہ کی دوررس نگاہ | مرہٹہ ایک ایسی قوم ہے کہ جس کے قول وفعل اور اقرار و وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں اس وقت حسن اتفاق سے ہم سب ایک میدان میں جمع ہیں مرہٹوں سے لڑکر اور دل کے حوصلے نکال کر عزت کے ساتھ مرجانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ پھر ایسا موقع میسر ہونا ممکن نہیں اگر خدانخواستہ اس وقت صلح ہوگئی اور شاہ درانی افغانستان کو اور ہم سب اپنے اپنے علاقوں کو رخصت ہوگئے تو بعد میں مرہٹے ہم میں سے ایک ایک کو چن چن کر ہلاک کر ڈالیں گے ۔

(باقی آئندہ)

ایک علمی خوش خبری

عربی ادب کے ایک نایاب گنجینے کی دستیابی

(از جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی اُستاذ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

دوسری صدی ہجری کے اعلیٰ درجہ کے شعراء میں بشار بن برد مادرزاد نابینا ہوتے ہوئے بھی بہترین شاعر تسلیم کیا گیا ہے وہ کثیر الشعر تھا اور اس کا کلام مقبول بھی ہوا لیکن جس اعتنا کا مستحق تھا حاصل نہ کرسکا اس کا سبب اس کی لامذہبی کا چرچا بے باکی اور برسر اقتدار جماعت کے ساتھ اس کا سیاسی اختلاف تھا اس لیے اس کے اشعار کی پوری حفاظت نہیں ہوئی اور اس کے دیوان کا وجود مشکوک ہی رہا سیف الدولہ کے دربار کے دو شاعروں نے جو بھائی بھائی تھے اور خالدیان کہے جاتے تھے اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا جس کی شرح پانچویں صدی کے ایک ادیب اسمٰعیل ابن احمد نے لکھی تھی۔ یہ متن اور شرح بھی گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے اور بجز کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔ راقم الحروف نے اس مجموعہ کی خدمت کی اور مصر کی لجنۃ التالیف نے ۱۹۳۴ء میں اس کو شرح المختار من شعر بشار کے نام سے شائع کیا۔

جیسے ہی یہ کتاب شائع ہوئی میرے محترم دوست اور نامور مستشرق ڈاکٹر کرنکو نے کیمبرج سے مجھے بشار کے دیوان کے وجود کی خوشخبری سنائی ان کے خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"آج مجھے ٹیونس کے شیخ الاسلام اور وزیر عدالت سیدی محمد الطاہر بن عاشور کا خط ملا ہے۔ انھوں نے شرح المختار کا ایک نسخہ خریدا ہے اور ان کے ذاتی کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ دیوان بشار کا موجود ہے جس کی وہ شرح لکھ رہے ہیں مشکوک مقامات پر وہ میری

مدد کے خواہاں ہیں اور شرح کی تکمیل کر کے جلد شائع کرنے کا قصد ہے۔"

اس اطلاع پر میں نے براہ راست شیخ کو دیوان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے خط لکھا غالباً یہ وہی دیوان ہے جس کا ذکر دمشق کے مجلۃ المجمع العلمی العربی بابت ماہ کانون اول ۱۹۲۹ء میں آیا تھا۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۷۱۲-۷۱۱ لیکن اس وقت میری تمام کوششیں مزید معلومات کے لیے بے سود ثابت ہوئی تھیں) شیخ نے میرے خط کا جواب دیا اور میری اُن کی خط وکتابت جاری ہوگئی۔ اپنی کچھ تصانیف بھی انھوں نے بھیجیں جو قدیم طرز پر بعض قصائد کی شروح تھیں۔ ابن بشار کے دیوان پر میرے کام کی نوعیت شیخ کے کام سے مختلف ہونے کی بناء پر میں نے اُن سے عرض کیا کہ اس میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے اس لیے وہ اس کی نقل یا عکس مجھ کو دے دیں۔ شیخ اس کو بطائف الحیل ٹالتے رہے اور میں اصرار کرتا رہا کہ اس میں چار سال گذر گئے۔ جنگ عظیم شروع ہوگئی اور غیر ممالک سے کلی انقطاع ہوگیا۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد پھر مجھے دیوان بشار کی یاد تازہ ہوئی۔ اس کے لئے شیخ کا حال معلوم کرنا ضروری تھا چنانچہ متعدد ذرائع سے پتہ چلانا چاہا مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو خود انھیں کے نام سابق پتے پر خط لکھا جس کا جواب انھوں نے دیا اور لکھا کہ اب وہ شیخ الجامعۃ الزیتونیہ ہیں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ میں نے اس وقت لکھا کہ میرا مرتب کردہ دیوان ابن درید مصر کی لجنۃ التالیف میں زیر طبع تھا۔ اس کا ایک نسخہ شیخ کو نذر کرنے کا وعدہ کر کے پھر اپنی پرانی خواہش کا اعادہ کیا اس پر انھوں نے اپنی تصنیف مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ مجھے بھیجی اور دیوان کے متعلق لکھا کہ اُن کی شرح چھپنے کے لئے لجنۃ التالیف جا چکی ہے اصل دیوان بھی اسی کے ساتھ ہے۔ فوٹو کی بھی اجازت انھوں نے دے دی ان کی ہدایت کے مطابق میں نے لجنۃ کے صدر پروفیسر احمد کے نام متعدد خطوط بھیجے جو سب کے سب ضائع ہو گئے مجبوراً دہلی کے سفیر مصر کا ذریعہ اختیار کیا۔ اس ذریعے سے ان کو خط مل گیا اسی کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ اس سے پیشتر ان کو میرا کوئی خط نہیں ملا دیوان کا فوٹو تیار کرنا بخوشی منظور کیا میں نے شیخ کی تحریری اجازت بھیج دی اور جولائی ۱۹۴۸ء

فوٹو لینے کا کام شروع ہو گیا خدا کا شکر ہے کہ پندرہ سال کے بعد یہ آرزو پوری ہوئی اور ۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو دیوان بشار کا عکسی نسخہ میرے ہاتھ میں آگیا۔

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست   آمد آخر زپس پردہ تقدیر پدید

بشار کا دیوان معدوم ہونے کا خیال مختلف اشخاص کے لئے اس کے اشعار جمع کرنے کا باعث ہوتا رہا۔ دورِ حاضر میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے اپنا وقت اس کام میں صرف کیا تھا انھوں نے اپنا مجموعہ بعینہٖ مجھ کو دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن ایفا سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ محمد الطاہر نے مجھے لکھا تھا کہ آٹھ سو اکیاون[۸۵۱] اشعار انھوں نے جمع کئے ہیں دو مجموعے مصر سے شائع بھی ہوئے۔ ایک احمد حسنین القرنی کا جس کے اشعار کی تخریج ڈاکٹر کرنیکو نے کی اور دوسرا حسین منصور کا شرح المختار کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بھی تمام عربی لٹریچر کھنگول کر تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار جمع کیے۔

اس دیوان کے دو سو پچھتر[۲۷۵] اوراق ہیں جو شیخ کی شمار کے مطابق سات ہزار آٹھ سو[۷۸۰۰] اشعار پر مشتمل ہیں۔ خط قدیم مصری ہے، کوئی تاریخ درج نہیں مگر خط کا انداز شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر کی تحریر ہے۔ شروع میں نہ کسی روایت کا پتہ ہے اور نہ کوئی سند درج ہے بشار کا نسب لکھ کر اس کے کلام کا آغاز بترتیب قوافی کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی نسخہ صاف ہے بعض مقامات پر پانی پہنچ جانے کی وجہ سے حروف کچھ مٹ گئے ہیں بیچ میں قدرے خرم بھی ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ صرف قافیۃ الراء تک ہے جہاں جلد اول تمام ہوتی ہے لیکن موجودہ حالات میں جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے کیونکہ تقریباً آٹھ ہزار اشعار کا مہیا ہو جانا کہیں اور سے غیر ممکن ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر کرنیکو اور مصر کے نامور صاحب قلم، مختلف حیثیتوں کے جامع، اپنے قدیم محترم دوست پروفیسر ڈاکٹر احمد امین بک مدیر ادارہ ثقافیہ جامعۃ الدول العربیہ کا شکر ادا کرنا لازم ہے مسلم یونیورسٹی کے علم دوست وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کا شکر ادا کرنا بھی میرے لئے ضروری ہے جنہوں نے ازراہ ادب نوازی فوٹوگراف کا خرچ منظور فرمایا۔ طویل سامعہ خراشی کی معافی چاہتا ہوں کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

رثاء لحضرة الاستاذ مولانا شبیر احمد العثمانی

(از مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

تقف ساعة بين المقابر وهناك تنهمل النواظر

وهنا "لسان الصمت" أندى من خطيب ذي زماجر

وهناك للقلب السليم اذا تأمل كل زاجر

واذا بكيت مؤبنا نابك الكبير ابن الأكابر

شبير احمد سيد العلماء جماع المآثر

هذا الذي عرفت فضائله البوادي والحواضر

هذا الذي ما قط تنساه المكاتب والدفاتر

حق لئن ترثيه عيدان المساجد والمنابر

حق لئن تبكيه اقلام الكتابة والمحابر

هلا تبكيه بأسر بغير عيون اولى البصائر

وهو الذي دحضت لدى عرفانه حجج المكابر

ولسانه بمجرد ذي الشفرتين بكف شاهر

فبحكمة وخطابة غراء سخر كل نافر

أحيى بمسلمه العلوم وقبله كانت دوائر

وأتى بتفسير الكتاب فلاح وجه الحق زاهر

ومطالب سمجت قريحته بها، بيض المسافر

الله وفقه فخا — ء بسعيه يحيي الشعائر

بالله أي رزية — دهمت نواعول كل صابر

بالله أي رزية — حلت فتندهش المشاعر

تالله لا تحظى بشروا — ه المحافل والمحاضر

أفقيد بغداد الجديد — منقي ترابك كل عاطر

درت عليك سحائب — تتلو روائحها البواكر

ياعين وابكي سيدا — ماقط سايره مسايِر

بطلاً تقاذفت البلا — د به وخانته الأواصر

رجل العزيمة غير مفلول الشباة من البواتر

أما "التتار" فأمه — وجد ورده مثم المناخر

يدعى "بجار الله" في — حفظ الشريعة غير جائر

تبكيه تركستان بل — كل المواطن والمهاجر

يسقيه وادي النيل سقيا مستمرا غير ضائر

فكذاك تنقرض العصو — ر وتمحي تلك المفاخر

أما المنية فهي لا — تذر الكبار ولا الأصاغر

والله يطوي الدهر كيف يشاء طيا وهو ناشر

اَدبیات

غزل

(جناب عامر صاحب عثمانی)

کھل کر بھی عیاں وہ ہو نہ سکے چھپنا بھی گوارا ہو نہ سکا
ان کی ہی تجلی عام ہوئی ان کا ہی نظارا ہو نہ سکا

نظروں کو شکستِ فاش ہوئی دیدار کا یارا ہو نہ سکا
لیکن یہ بڑا کافر دل ہے مایوسِ نظارا ہو نہ سکا

ویسے تو کسی کے دامن تک بس ایک اشارہ کافی تھا
پاکیزگیِ دامن کی قسم بس ایک اشارا ہو نہ سکا

اِک آگ سی پیہم آٹھ پہر، رگ رگ میں سُلگتی ہے لیکن
آنسو یہ کہاں سے آتے ہیں کیوں خشک یہ دھارا ہو نہ سکا

اِک وہ کہ بھیانک طوفاں میں تنکوں کے سہارے تیر گئے
اک ہم کہ ہماری کشتی کا ساحل بھی کنارا ہو نہ سکا

قسمت کی نوازش تھی جن پر خورشید کی ضو سے چاند بنے
ذرّے کو ضیا دی سورج نے لیکن وہ ستارا ہو نہ سکا

فریاد! کہ ان کو پا کر بھی محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے
جو دردِ نہاں تھا سینے میں اس درد کا چارا ہو نہ سکا

ناموسِ الم کا داغ بنی وہ آہ جو آندھی بن نہ سکی
توہینِ مذاقِ غم ٹھیرا جو اشک شرارا ہو نہ سکا

ہیں غنچہ و گل بھی خوب مگر وہ عارضِ رنگیں کیا کہیے
کوئی بھی صحیفہ قدرت کا قرآن کا پارا ہو نہ سکا

اے وائے یہ پیہم ناکامی اے وائے یہ پیہم لعیدیں
جینا بھی گوارا ہو نہ سکا مرنا بھی گوارا ہو نہ سکا

اوروں پہ بھروسہ کیا کرتے اوروں کا سہارا کیا لیتے
آغوش میں پالا تھا جس کو وہ دل بھی ہمارا ہو نہ سکا

دیکھا ہے یہ اکثر اے عامر جینے کے فدائی جی نہ سکے
مرنے کی دعائیں کیں جس نے اللہ کو پیارا ہو نہ سکا

۱۹۵۲ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغت قرآن پر بے مثل کتاب طبع دوم قیمت للعہ مجلد صہ،

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب "کیپٹل" کا ملخص شستہ

رفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن۔ قیمت عہ

اسلام کا نظام حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ

حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث زیر طبع

خلافت بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت عہ

مجلد صہ

۱۹۵۳ء ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم

و تربیت۔ جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید

کتاب قیمت للعہ، مجلد صہ،

نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق و تفصیل

کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت

سے اب تک ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و

تربیت کیا رہا ہے قیمت للعہ، مجلد صہ،

قصص القرآن جلد سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ، مجلد سے،

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی

قیمت للعہ، مجلد صہ،

۱۹۵۴ء: قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف

اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت

للعہ، مجلد سے،

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ اور رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات

کا بیان ——— زیر طبع

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی

کتاب قیمت سے،

۱۹۵۵ء: ترجمان السنۃ۔ ارشادات نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ صفحات ۸۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹ جلد اول

قیمت للعہ مجلد عہ،

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید و تحقیق

از مترجم و نقشہائے سفر۔ قیمت سے،

جمہوریہ یوگوسلاویا اور مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ

کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز و دلچسپ کتاب قیمت عہ،

۱۹۵۶ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مصر کے مشہور مصنف

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب

"النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ قیمت صہ، مجلد صہ،

مسلمانوں کا عروج و زوال طبع دوم قیمت عہ، مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

قیمت للعہ، مجلد صہ،

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔ قیمت ۶ر

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے جس سے

آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین :۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص، ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین ۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبا :۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت یا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبا کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان وادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں اُن کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہو

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید ایڈیشن جس میں نظرِ ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ے مجلد سعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ۔ زیر طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم - زیر طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

سنہ ۱۹۴۳ء نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول - جس میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ جدید ایڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ قیمت عہ مجلد عہ

فہم قرآن - جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد سے

غلامانِ اسلام - اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن قیمت صہ مجلد سے

اخلاق اور فلسفہ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے۔ زیر طبع۔

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - جدید ایڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک - قیمت عہ مجلد سے

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب زیر طبع

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت عہ

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن عہ (زیر طبع)

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا ایڈیشن سے مجلد سعہ

اسلام کا اقتصادی نظام - وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا ایڈیشن عہ مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات ۳۵۰ جدید ایڈیشن قیمت سعہ مجلد صہ

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) جدید ایڈیشن قیمت ہے مجلد ہے مضبوط اور عمدہ جلد قیمت للعہ

بُرہان

جلد بست و چہارم شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۵۰ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہم کہاں ہیں

نصب العین کو پہچاننا، عزم اور ایثار یہی تین وصف کلیدِ کامرانی ہیں جس قوم کو یہ اوصاف نصیب ہو جاتے ہیں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے اور عروج و ترقی اُس کے استقبال کے لئے دوڑتی ہے۔ تاریخ عالم کی وہ بے شمار اقلیتیں جنہوں نے اکثریتوں پر غلبہ حاصل کیا۔ اور گردشِ لیل و نہار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ابلقِ روزگار کی تمام شوخیوں کو ختم کر دیا۔ وہ انھیں اوصاف کی حامل تھیں اور اُن کے دامن انھیں موتیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ کی عملی تصدیق ایسی ہی جماعتوں نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے اور انھیں اوصاف سے متصف گروہوں نے اکثریتوں کو اقلیتوں کی قدر شناسی پر مجبور

لیکن گذشتہ چند ہفتوں میں مشرقی اور مغربی بنگال میں جو انسانیت سوز خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ اور عمل و ردعمل کے جذبات نے دماغوں کے توازن پر جو اثر ڈالا اُس نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ان اوصاف کے معیار پر اپنے آپ کو پرکھیں۔ اور یہ معلوم کریں کہ ترقی اور کامیابی کی منزل میں ہم کہاں ہیں اور ہمارا موقف کیا ہے؟

یہ معلوم کرنا تو کسی مورخ ہی کا کام ہے کہ اس بربریت نواز وحشیانہ سلسلہ کا آغاز کہاں سے ہوا اور کیوں ہوا۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اثر ہمارے اوپر کیا پڑا اور امتحان و آزمائش کے اس دور میں ہم کہاں تک اپنے نصب العین پر قائم رہے اور عزم و ایثار کا کیا ثبوت ہم نے پیش کیا۔

جب ہم آزادی کے اس تنگ راستے سے گذر رہے تھے جو جیل خانوں، کال کوٹھریوں اور پھانسی گھروں کے بیچ میں سے ہو کر نکلتی ہے جہاں تیز گامی کو گراں بار بنانے کے لئے آہنی بیڑیوں اور ڈنڈا بیڑیوں کے پازیب پہنائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کوڑوں سے اور بید سے کمر کی ہڈیوں کی خاطر بھی کی جاتی ہے۔ تو ہمارا نصب العین تھا آزادیٔ ہند۔ جب ہماری کشتی منزل کے قریب پہنچنے والی تھی تو ساحل کے ان سبکساروں نے جو گردابِ انقلاب کے طوفانوں سے قطعی ناآشنا تھے۔ ایک نعرہ لگایا ہماری تہذیب جدا ہے۔ لہذا ہمیں ملک کا ایک حصہ دے دو، جہاں ہم آزادی

سے اپنی تہذیب کو زندہ رکھ سکیں یہ تحریکِ پاکستان کا حاصل اور مقصود تھا جو ظاہر کیا گیا۔ یہ نعرہ کامیاب ہوا اور پاکستان کا تصور حقیقت بن گیا۔ اس نعرہ کا یہ مفہوم لینا تو سراسر نادانی تھا کہ ہندستان کے اس گوشہ میں کوئی حکومت خلافتِ راشدہ کے مقدس اصولوں پر قایم ہوگی ایسا خیال صرف وہی کر سکتا تھا جو خلافتِ راشدہ کی حقیقت سے ناواقف ہو۔ البتہ یہ خیال درست تھا کہ جس طرح ایشیا کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں جہاں اگرچہ اسلامی قانون نافذ نہیں ہے مگر انسانی اخلاق کی ایسی سرد بازاری بھی نہیں ہے۔ وہاں اقلیتیں موجود ہیں لیکن اس درجہ مطمئن کہ آج تک اُن کو اپنے اقلیت میں ہونے کا احساس بھی نہیں ہو سکا اسی طرح پاکستان بھی ایک ایسی تہذیب کا گہوارہ ہوگا جس کو مسلم تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کا گہوارہ کہا جا سکے جس میں عدل و مساوات کی اتنی پاسداری لامحالہ ہو کہ ہر ایک اقلیت اطمینان کی زندگی بسر کر سکے اور اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو محفوظ سمجھ سکے چنانچہ مسٹر جناح نے بحیثیت گورنر جنرل جو تقریر سب سے پہلے کی تھی اس میں یہ ظاہر کیا تھا

"پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان ایک ملک کے رہنے والے ہوں گے جن کے ساتھ عدل و انصاف کا مساویانہ سلوک ہوگا ہر ایک اقلیت پوری طرح محفوظ ہوگی"

لیکن گذشتہ ہفتوں میں بریسال اور ڈھاکہ وغیرہ میں جو کچھ ہوا اس کا فیصلہ یہ ہے کہ پاکستان یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ اُس کا نصب العین کیا ہے اس کے حکمران اور عوام جس طرح رب العالمین کے احکام کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں اسی طرح وہ مسٹر جناح کے ارشاد کو بھی پاؤں تلے روند چکے ہیں اور اپنے طرز عمل سے ایک ایسی مثال قایم کر رہے ہیں جس کو اسلام سے تو کیا مسلمانوں کے عام اخلاق و عادات سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حادثہ کھیلنے کا تعلق ہندوؤں سے نہیں بلکہ کمیونسٹوں سے تھا تو بریسال اور ڈھاکہ وغیرہ کے واقعات کا کیا جواب ہوگا جس میں انسانیت کے گلے پر کند چھری چلائی گئی ہے اور وحشت و بربریت کا ریکارڈ قایم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پاکستان سے گذر کر انڈین یونین میں آئیے۔ یہ ہمارا وطن عزیز ہے۔ یہاں ہم پیدا ہوئے یہاں ہم آباد ہیں اور یہیں ہم آباد رہیں گے ہم نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس کی آزادی کی جدوجہد پر قربان کیا۔ یہ گاندھی جی کا ملک ہے جنہوں نے صداقت (ستیہ) اور مقاومت بالصبر (ستیہ گرہ) کے اعلیٰ اصول کام میں لاکر اس کو آزاد کرایا اور حریت کو فراخ حوصلگی اور پورے ملک کو عدل۔ مساوات اور محبت و پریم کا سبق دیتے رہے یہ پنڈت نہرو کا ملک

ہے بلکہ اس کو پوری ایشیا کا لیڈر بنانا چاہتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جب تک ایشیا کا متحدہ محاذ نہ قائم ہوگا ہندوستان یا کسی بھی ایشیائی ملک کی آزادی ناقص ہے محض نمائشی ہے آزادی سے پہلے اس کا نصب العین تھا مکمل آزادی اور جمہوریت آزادی کے بعد اس کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اس کو ریپبلک قرار دے چکی ہے اور ایک غیر فرقہ وار غیر مذہبی حکومت اس کا نصب العین قرار دے چکی ہے لیکن افسوس کہ جب واقعات نے ان بلند بانگ دعووں کا ثبوت طلب کیا تو ہم خاموش ہیں سراسیمہ اور سرگرداں ہیں ہم بڑے بڑے ذمہ داروں کو دیکھ رہے ہیں کہ نصب العین فراموش کر چکے ہیں کامیابی کے لئے عزم و ایثار تو درکنار وہ ناکامی کے لئے پوری جدوجہد میں مشغول ہیں انڈین نیشنل کانگرس۔ صوبائی اسمبلیاں۔ پارلیمینٹ سب ہی متحان کے شکنجہ میں ہیں اور ناکامی کے باوجود ستم یہ ہے کہ احساس ناکامی مفقود ہے۔ تبادلہ آبادی کا نعرہ ہر ایک کی زبان پر ہے اور اگرچہ کھلم کھلا انتقام کی تلقین نہیں کی جا رہی ہے مگر انتقام کو قدرتی نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ انتقام کس سے ؟ ایک بے بس مخلوق سے جو پا شکستہ ہے اسلحہ سے محروم ہے جو ہمت و جرأت ختم کر چکی ہے۔ جو امن کے ساتھ زندگی کے ایک سانس کو سب سے بڑی دولت تصور کرتی ہے واقعات آہنی پردہ ڈالنے کا الزام دوسروں پر ہے ممکن ہے یہ الزام صحیح ہو مگر اس لاچاری اور مجبوری کا کیا علاج کہ صوبہ آسام کا ایک علاقہ برباد کر دیا جاتا ہے اور حکومت کے دامن عصمت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا کیونکہ اس کو اس کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ بہرحال بدمستی کا جو منحوس کیف دماغوں پر مسلط ہے اس وقت اس سے نہ کوئی چھوٹا خالی ہے نہ کوئی بڑا اس سے مستثنے ہے صرف چند نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو اپنی جگہ باہوش ہیں مگر بے ہوشوں کی بحرانی دنیا کی حالت دیکھ کر دم بخود ہیں یا حواس باختہ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اپنا نصب العین فراموش کر چکے ہیں۔ بلاشبہ "ریپبلک" "سیکولر اسٹیٹ" اور "مکمل آزادی" کے نعرے ضرور زبان پر ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی اصرار ہے "تبادلہ آبادی" یا "جنگ" یعنی تقریباً ڈھائی کروڑ انسان نقل مکانی بھی کر لیں اس نقل مکانی کے دور میں جو بے انتہا قتل۔ خوں ریزی۔ غارت گری تباہی اور بربادی ہو وہ سب کچھ بھی ہو جائے یا دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے برخلاف جنگ بھی شروع کر دیں اور ایک دوسرے کے ملک پر قبضہ بھی کرنے لگیں۔ اور دنیا کی قومیں بیٹھی تماشہ دیکھتی رہیں۔ بے شک یہ ممکن تھا اگر ہندوستان کوئی بنجر یا ویران ملک ہوتا اور اس کی طرف استعمار پسند حکومتوں کی نظریں نہ ہوتیں لیکن جب کہ ایک سے ایک بڑھ کر حریف موجود ہیں اور شاطران برطانیہ کے دماغوں سے جو اب تک اس جنت نشان کو اپنا ورثہ قرار دیتے رہے ہیں تو کوئی ہوشمند دماغ ایک لمحہ کے لئے بھی مطمئن نہیں ہو سکتا کہ جنگ یا تبادلہ آبادی کے یہ تمام ہولناک واقعات ہو گذریں اور یو۔ این۔ او ہندوستان و پاکستان کی مطلق العنانی پر بندش نہ لگائے اور اقلیتوں کی حفاظت کے بہانے کوئی بین الاقوامی کنٹرول نہ قائم کر دے۔

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

تدوین حدیث

(۲)

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

میں تو سمجھتا ہوں صحیح مسلم کی یہ حدیث یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان عام فرمایا کہ قرآن کے سوا لوگوں نے مجھ سے جو حدیثیں لکھی ہیں ان کو ضائع اور محو کر دیں، یہ حکم یکایک نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اس حال سے واقف ہونے کے بعد یعنی آپ سے ہر سُنی ہوئی بات لکھی جا رہی ہے اس کی خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو اسی کے ردعمل کے لئے ضروری خیال کیا گیا کہ عام طور پر حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو روک دیا جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ اگر مسند احمد کی اس روایت کو ملا لیا جائے جسے اس وقت میں مجمع الزوائد سے نقل کرتا ہوں، روایت یہ ہے۔

کنا نکتب ما نسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخرج علینا، فقال ما ھذا تکتبون، فقلنا ما نسمع منك فقال اکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ واخلصوہ قال فجمعنا ما کتبناہ فی صعید واحد ثم احرقناہ

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے تب ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو، ہم نے عرض کیا کہ حضور سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اسی کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب ہے (یعنی ایسا نہ کرنا چاہئے، پھر فرمایا) ستھری کرو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ) سے اس کو پاک

لکھو (صحابی کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو
ایک میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا،

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ممانعت ہی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا تھا سب کو لوگوں نے ایک ہی جگہ پر لا کر جمع کیا، اور آگ لگا کر اس کو ضائع کر دیا۔ بلکہ اسی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ

اکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ واخلصوہ — کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ ستھری کردو اللہ کی کتاب کو (اور ہر قسم کے اشتباہ سے پاک کردا سکو)

ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا جو بالآخر ان مکتوبہ حدیثوں کا انجام آئندہ زمانہ میں چل کر ہو سکتا تھا، یعنی وہی بات کہ جن امور کی عام اشاعت مقصود نہیں ہے اگر نبوت ہی کے عہد میں اس کثرت سے ان کے مکتوبہ مجموعے تیار ہو جائیں گے تو بتدریج ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، انسانی فطرت اور اس فطرت کے خصوصیات پر جس کی نظر ہے وہ بھی بآسانی اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، پھر پیغمبر کی نظر تو پیغمبر ہی کی نظر تھی جن سے زیادہ بنی آدم کی فطرت کا پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ باقی یہ کہنا جیسا کہ بعضوں نے حدیثوں کی کتابت کی ممانعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں اور حدیثوں میں خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کر دی مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے آخر جس وقت قرآن نازل ہو ہو کر لکھا جا رہا تھا، اسی زمانہ میں تورات وانجیل کے بیسیوں نسخے عرب ہی میں موجود تھے، ان سے اختلاط کا شبہ کیوں نہ ہوا۔ نہ صرف توراۃ وانجیل بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ عرب ہی میں لقمان کا مجلہ بھی مکتوبہ شکل میں پایا جاتا تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں خطوط لکھوائے اور لکھواتے رہتے تھے بس یہ سمجھ لینا کہ محض مکتوب ہو جانے کی وجہ سے لوگ غیر قرآنی چیزوں کو قرآن سمجھ لیتے کم از کم میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ان دو چیزوں میں یعنی عمومی اشاعت جن چیزوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے ان میں اور جن چیزوں کے متعلق اشاعت عام کا یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا جاتا تھا ان دونوں کے نتائج واحکام میں فرق پیدا کرنے کی یہی صورت تھی مگر لوگوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرلیا تھا یعنی جیسے نازل ہونے کے ساتھ قرآن لکھ لیا جاتا تھا اسی طرح سننے کے ساتھ حدیثوں کو بھی لکھنے لگے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت فرمادی گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلامی دین کے ان دونوں سرچشموں میں اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کے مطالبہ کی قوت وضعف کا جو فرق آج سارے جہاں کے مسلمانوں کا مانا ہوا اور مسلمہ مسئلہ ہے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش میں یہ پہلا تاریخی اقدام تھا جو نبوت ہی کے عہد میں خود بارگاہ رسالت کی طرف سے اختیار کیا گیا۔ واقعہ کی جو اصل صورت ہے وہ تو یہی تھی باقی اس زمانے کے فیل شناسوں کا ایک گروہ اسی قسم کی روایتوں سے جو یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا مبارک یہ تھا کہ آپ کی حدیثوں سے مسلمان اپنی دینی زندگی سے مستفید نہ ہوں، اسی لئے لکھنے والوں کو حدیثوں کے لکھنے سے روک دیا گیا تھا۔ اور جو لکھ چکے تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ ان مکتوبہ حدیثوں کو ضائع کردیں میں نہیں سمجھتا کہ بدبختوں کی اس ٹولی نے تیرہ سو سال بعد ان روایتوں سے آخر یہ نتیجہ کیسے پیدا کرلیا در کیوں جائیے اسی روایت میں جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کی تعمیل میں صحابہ نے اپنے لکھے ہوئے مسودوں کو نذر آتش کردیا، اس کے آخر میں ہے کہ

فقلنا یا رسول اللہ فنتحدث عنك قال تحدثوا عني ولاحرج ومن کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار	تب ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ کی طرف منسوب کرکے ہم زبان سے بھی نہ بیان کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری طرف منسوب کرکے زبان سے بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جان بوجھ کر جھوٹ کو میری طرف منسوب کرکے جو بیان کرے گا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ وہ جہنم کو بنائے۔

سوال یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اگر یہی منشا رہتا جو کوتاہ نصیبوں کی یہ جماعت کہتی
ہے تو صحابہ کے اس سوال پر کہ آپ کی حدیثیں کیا زبانی بھی لوگوں سے ہم بیان نہ کریں؟ ظاہر ہے
کہ اس کے جواب میں بجائے یہ فرمانے کے کہ "ہاں! مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو، اس میں کوئی
مضائقہ نہیں ہے، یہ کہنا چاہئے تھا کہ "نہیں ہرگز ہرگز نہیں" بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے کی ممانعت
جو اس زمانہ میں کی گئی، اگر اس کی غرض یہی تھی کہ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے
استفادہ کا موقعہ نہ ملے، تو بجائے اس مشہور حدیث کے جس کا آخر میں یہاں بھی تذکرہ کیا گیا ہے یعنی
دہی من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار (جو جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کو منسوب
کرے گا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) بجائے اس کے جھوٹ ہو یا سچ ہر قسم کی بات کو آپ کی طرف
منسوب کر کے بیان کرنے کی ممانعت فرما دیتے بلکہ منکرین حدیث جس لب و لہجہ میں گفتگو کر رہے
ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں سے بجائے کسی فائدے کے مسلمان طرح طرح کی گمراہیوں
میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں فالہم بدھن العیاذ باللہ اگر پیغمبر کی گفتار و رفتار سیرت
و کردار کے یہی نتائج تھے، اور جیسا کہ ان دیوانوں کا بیان ہے کہ ان ہی خطرات کو محسوس کر کے پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں کی کتابت سے صحابہ کو روک دیا تھا، تو پھر اب میں کیا کہوں، بعض
روایتوں سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنے کی
سے حکم دیا گیا تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے اس سزا کو صرف ان ہی لوگوں کی حد تک محدود نہ ہونا چاہئے
تھا بلکہ جب پیغمبر کی باتوں سے مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچنے والا تھا، تو غلط ہی نہیں بلکہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح باتوں کو بھی منسوب کر کے بیان کرنے والوں کے ساتھ اگر یہ نہیں تو کم
از کم کسی نہ کسی سزا کا مستوجب قرار دینا چاہئے تھا، سو سزا تو سزا مضمون کے ابتدائی اوراق میں
متعدد روایتیں گذر چکی ہیں، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو دوسروں تک پہنچانے
والوں کو دعائیں دی گئی ہیں، آرزو کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کے چہروں کو تر و تازہ شاداب اور
بشاش رکھے، صرف یہی نہیں کہ زبانی بیان کرنے والوں کی ہمت افزائیاں مختلف الفاظ میں فرمائی گئی

بلکہ جیسے مذکورہ بالا بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے قلم بند کرنے کی ممانعت کی گئی تھی، اسی طرح روایتوں ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ ایک سے زیادہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت عطا فرمائی ہے، اجازت ہی نہیں بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بعض صحابیوں نے کی تو آپ نے ان کو ہدایت کی کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو (ترمذی) بعضوں میں یہ بھی ہے کہ قیدوا العلم بالکتاب (علم کو لکھ کر مقید کرو) اور میں تو کہتا ہوں کہ کتابت کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں کے متعلق تو کچھ گفتگو کی سنداً گنجائش بھی ہے، لیکن صحیح حدیثوں سے جب یہ ثابت ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابیوں نے کی تو بعض دعائی تدبیروں سے ان کے حافظہ کو قوی کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ جب یہی مقصود تھا کہ کسی طرح اُمت میں آپ کی حدیثوں کا ذکر نہ پہنچنے پائے۔ لکھنے سے ممانعت کی بھی یہی غرض اگر تھی تو ان صاحب کے حافظہ کو بجائے قوی کرنے کے چاہئے تھا کہ اور کمزور کر دیا جاتا تاکہ کوئی بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو یاد نہ رہتی خود بخود روایتوں کی منتقلی کا دروازہ اس تدبیر سے بند ہو جاتا۔

یہ کتنی بڑی علمی خیانت ہے کہ حدیثوں کو مضمحل کرنے کے لیے تو اس زمانے کے بے باکوں کا طبقہ انتہائی فراخ دلی سے کام لیتا ہے کمزور سی کمزور روایت سے ان کا کام چلتا ہو تو اس کے پیش کرنے سے وہ نہیں چوکتا اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ روایتوں کے متعلق بے اعتباری پھیلانے کے لیے لوگوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں پر جو بہر حال روایتیں ہی ہیں ان پر اعتماد کیا جائے

پہلی روایت ترمذی کی ہے لیکن روایت کی صحت پر ترمذی نے شبہ کا اظہار کیا ہے دوسری روایت کا ذکر ابن عبدالبر نے اپنی مسلسل سند کے ساتھ کیا ہے بظاہر اس روایت کی سند میں کوئی قابل اعتراض راوی نہیں معلوم ہوتا دیکھو جامع بیان العلم صفحہ ۱ میرا اشارہ حضرت ابوہریرہ کی اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں انھوں نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضور ہی کے حکم سے میں نے چادر بچھائی پھر اس کو سینے سے لگایا جس کے بعد بھولنے کی کمزوری کا مجھ سے ازالہ ہو گیا یہ روایت صحاح کی عام کتابوں اور بخاری وغیرہ میں پائی جاتی ہے ۱۲

اس غیر منطقی طرزِ عمل کی وجہ بتائیے کیا توجیہ کر سکتے ہیں، حالاں کہ دیانت داری کا اقتضا تو یہ تھا کہ جب روایتوں ہی سے کام لیا جا رہا ہے تو ساری روایتوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی آخر یہ بھی کوئی صحیح تحقیق و تلاش کا طریقہ ہوا کہ پہلے ایک نصب العین طے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد روایتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس مفروضہ نصب العین کی تائید جن روایتوں سے ہوتی ہو ان کو تو اُچھال اُچھال کر آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے، اور جن سے اس طے شدہ نصب العین پر زد پڑتی ہو ان سے گذرنے والے آنکھیں میچ میچ کر گذر جاتے ہیں آخر اسی قصہ میں دیکھئے حدیثوں کے لکھنے کی پیغمبر نے ممانعت کر دی تھی۔ اس کا ذکر تو بڑے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن جن روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر ہی نے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ان کے ذکر سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے حالانکہ سنداً دونوں قسم کی روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تفاوت نہیں ہے، بلکہ اگر اسناد کا صحیح علم ان مسکینوں کو ہوتا تو شاید وہ اجازت والی روایتوں کو ممانعت کی روایتوں سے زیادہ قوی پا سکتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اجازت دی گئی اور بعد کو ممانعت کی گئی کیوں کہ اجازت کی روایتوں میں بعض روایتوں کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے، یعنی آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس میں جو خطبہ ارشاد ہوا گذر چکا کہ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اکتبوا لابی شاہ — ابو شاہ کے لئے خطبہ کو لکھ دو۔

بہر حال ساری روایتوں کے جمع کرنے سے واقعہ کی صحیح شکل میرے سامنے تو یہی آتی ہے کہ ابتدا میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا، اور لکھنے میں اتنے مبالغہ سے کام لینا شروع کیا کہ جو کچھ سنتے تھے سب ہی کو لکھ لیا کرتے تھے عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اس وقت جب ان کا شمار صغر القوم میں تھا یعنی صحابیوں میں سب سے چھوٹے تھے انھوں نے صحابیوں کو اسی حال میں پایا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس کی اگر خبر نہ لی جاتی تو جن روایتوں میں عمومیت اور استفاضہ کا رنگ پیدا کرنا

مقصود نہ تھا، ان میں یقیناً یہی غیر مطلوبہ کیفیت پیدا ہو جاتی لازمی نتیجہ جس کا یہ تھا کہ آئندہ دین
کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا جن میں چاہا جاتا تھا اور یہی چاہئے بھی تھا کہ فرق باقی
رہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ اکتاب مع کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب کو بھی
کیا وہی اہمیت دینا چاہتے ہو؟ عام صحابہ ان نتائج کا اندازہ نہ کر سکتے تھے جن پر نبوت ہی کی
نظر پہنچ سکتی تھی۔ اسی کے بعد من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ
لکھا ہے اس کو محو کر دے یعنی مٹا دے) کا اعلان کیا گیا، اور اگر وہ روایت صحیح ہے کہ صحابہ نے اپنے
مکتوبہ مجموعوں کو ایک میدان میں جمع کر کے سب کو نذر آتش کر دیا تو سمجھا جائیگا کہ اسی محو کرنے کی حکم
کی یہ تعمیلی شکل تھی اور اس تدبیر سے اس خطرے کا ازالہ ہو گیا، جو عہد نبوت میں حدیثوں کی مختلف کتابوں
اور مجموعوں کے تیار ہونے سے پیدا ہو سکتا تھا اور یوں عمومی طور پر حدیثوں کے لکھنے کا رواج صحابہ میں
جو پھیل گیا تھا وہ مسدود ہو گیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اس عام اعلان سے اس خطرے کا
تو دروازہ بند ہو گیا مگر احساسات کی جن نازک تاثرات کا تجربہ آدمی کی فطرت کے متعلق ہوتا رہتا ہے
پھر وہی تجربہ سامنے آیا۔ گویا خطرے کے ازالہ کی اسی شکل نے ایک دوسرے خطرے کے سوراخ کو
پیدا کر دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہی عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں
نے بیان کیا تھا کہ ان صحابیوں نے جن میں سب سے میں چھوٹا اور کم سن تھا، مجھ سے بیان کیا کہ میرے
بھائی کے بچے! ہم جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے ہیں، وہ سب ہمارے پاس لکھا
ہوا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ یہی صورت حال اس زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی جس کا اللہ اور رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی ممانعت سے فرمانا چاہا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ بن عمرو
بن عاص کو اپنے بڑوں سے جہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لوگ لکھا کرتے
ہیں، وہیں کم عمری اور کم سنی کی وجہ سے وہ ممانعت کے حکم سے واقف نہ ہو سکے کیوں کہ جہاں تک قرائن
و قیاسات سے معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ میں ممانعت کے حکم کا اعلان جس وقت کیا گیا تھا عبداللہ ابن عمرو

اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ہجرت کے وقت بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین ہی سال کے تھے۔ لیکن مان لیجئے کہ وہی روائت صحیح ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جس سال مدینہ تشریف لاتے ہیں، عبداللہ کی عمر سات سال کی تھی ہجرت کے کچھ ہی دن بعد یہ اپنے والد عمرو بن عاص سے پہلے ہی مدینہ منورہ آکر مسلمان ہو گئے تھے شاید اس وقت یہ آٹھ نو سال کے ہوں گے اس عمر کے بچوں کا ایسے اعلانوں سے ناواقف رہ جانا کچھ تعجب نہیں ہے، یا مان لیجئے کہ ان کو بھی کتابتِ حدیث کی ممانعت کا علم ہو چکا تھا۔ مگر انھوں نے خود سمجھ لیا۔ یا جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے پر اُن کو معلوم ہوا کہ ممانعت کا تعلق عمومی رواج سے ہے، یہ مقصد نہیں ہے کہ بالکلیہ قطعی طور پر حدیثوں کا لکھنا گناہ ٹھہرا دیا گیا ہے، کچھ بھی ہوا ہو، ہوا یہ کہ جب عبداللہ سن رشد کو پہنچے اور نو عمری میں مدینہ منورہ آجانے کی وجہ سے ان کو نوشت و خواند میں مہارت حاصل کرنے کا کافی موقعہ مل گیا، کیوں کہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان بچوں کی نوشت و خواند کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ تھی قیدیوں تک کا فدیہ یہ مقرر کر دیا تھا کہ مدینہ کے دس بچوں کو جو لکھنا سکھا دے گا، آزاد کر دیا جائے گا۔ بہر حال حضرت عبداللہ بن عمرو نے صرف یہی نہیں کہ عربی خط میں کمال پیدا کیا بلکہ مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سریانی اور عبرانی زبان اور ان زبانوں کے خطوط کے سیکھ لینے کا جو موقعہ میسر آگیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، ایک سے زائد آدمیوں سے ابن سعد وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو سریانی زبان جانتے تھے اور اس زبان کی کتابیں پڑھا کرتے تھے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے یعنی انھوں نے دیکھا کہ میرے ایک ہاتھ میں شہد ہے اور دوسرے میں گھی ہے، کبھی میں اس ہاتھ کو چاٹتا ہوں، اور کبھی اس کو۔ اس خواب کا وہی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ تو تعبیر بتاتے ہوتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تقرء الکتابین التوراۃ والقرآن ج ۱۱۲ ۔ تم دونوں کتابیں یعنی تورات و قرآن کو پڑھو گے۔

راوی نے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ وکان لقرءھما (یعنی یہ واقعہ بھی تھا کہ عبداللہ دونوں کتابیں پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تورات وغیرہ کے پڑھنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر پیدا کرچکے تھے[۱]، اسی کے ساتھ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ نوجوانی کے زمانہ میں تدین، عبادات و مجاہدہ کا جوش ان کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا ہے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کرنی پڑی، لیکن آپ کے سمجھانے کے باوجود وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ جی نہیں میں اس سے زیادہ بار برداشت کرسکتا ہوں بعض روایتوں میں ان ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ

فما زلت انا قصہ دینا فقضی ابن سعد جلد ۴ ص ۲ — یعنی مجھ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلسل

---

[۱] بعضوں کا خیال ہے کہ عہد فاروقی کے فتوحات کے بعد شام و مصر پہنچنے کے بعد عبداللہ بن عمرو نے سریانی و عبرانی زبانیں سیکھی تھیں لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا مدینہ منورہ ہی میں ان چیزوں کا سیکھ لینا کوئی تعجب کی بات ہی نہیں ہے، آخر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیوں کے بیت المدارس میں ان کے خط اور زبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے کیا نہیں سیکھا تھا؟ پھر حضرت عبداللہ کے لئے کیا چیز مانع ہوسکتی تھی، باقی توراۃ و قرآن دونوں کا پڑھنا یہ بھی ان کے ساتھ مختص نہیں ہے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک دن تورات اور ایک دن قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ دیکھو ذہبی تذکرۃ الحفاظ، طبقات ابن سعد میں ابوالجلاء الجونی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات کو ختم کرنے کا قاعدہ انھوں نے مقرر کرلیا تھا اور لوگوں کو ختم کے دن جمع کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے، ابن سعد ج ۷ قسم اول ص ۱۶۱ باقی طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے حضرت عمر کے متعلق جو یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ تورات کا ایک مجموعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے اور عرض کرنے لگے کہ بنی زریق میں میرے اپنے ایک بھائی سے یہ مجموعہ ملا ہے کہتے ہیں کہ اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غضبناک ہوگیا حضرت عمر کو جب اس کا احساس ہوا تو معافی مانگنے لگے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ رہتے تو بجز میری پیروی کے ان کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی، جمع الفوائد میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ابو عامر قاسم بن محمد الاسدی ایک شخص ہے دراصل یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے نیز یہ ممکن ہے اس یہودی کو بھائی قرار دینے پر عتاب کیا گیا ہو نیز اور بھی اسباب اس کے ہوسکتے ہیں، بہرحال یہ جانتے ہوئے کہ تورات کا نسخہ بہت کچھ محرف ہوچکا ہے پھر قرآن پڑھنے والے کو اسی محرف تورات کی تلاوت کی جو اجازت دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محرف تورات کا مصحح تو اس کے پاس موجود ہی تھا یعنی قرآن اور قرآن کو مصحح بناکر جو بھی تورات کو پڑھے گا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ گمراہی میں مبتلا ہو بلکہ کچھ فائدہ ہی حاصل کرے گا۔۱۲

ردّ و کد ہوتی رہی (آنحضرت نرمی پر اصرار کرتے تھے
اور یہ اپنے اوپر زیادہ بار ڈالنا چاہتے تھے۔

اگرچہ آخر عمر میں پچھتاتے تھے اور کہتے تھے کہ بڑھاپے میں اب پتہ چلا کہ میرے لئے کیا اچھا ہوتا اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کو مان لیتا، خیر یہ تو تمہیدی قصہ تھا، اب اصل واقعہ کو سنیئے۔
اصل واقعہ تو صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو یہ لکھا کرتے تھے ان کے اس لکھنے کا ذکر بخاری میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کیا گیا ہے جس کا تذکرہ گذر چکا ہے، یعنی ابوہریرہ کہا کرتے تھے۔

کان یکتب ولا اکتب (عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

مگر پیش نظر اس وقت صرف ان کے لکھنے کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ اسی قصہ سے ایک اور بات جو معلوم ہوتی سب زیادہ تر میں لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ ان کے لکھنے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ بخاری کے مختلف کتابوں میں خود ان کے حوالہ سے بھی اور دوسروں کے حوالے سے پایا جاتا ہے اس وقت آپ کے سامنے ان تمام روایتوں میں سے سنن ابوداؤد جو خاص صحاح میں شمار ہوتی ہے اور ابن سعد یا جامع ابن عبدالبر وغیرہ کی روایتوں پر اس روایت کو ترجیح حاصل ہونی چاہیئے، بہرحال ابوداؤد کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ خود عبداللہ بن عمرو بیان کرتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا کرتا تھا، اسے لکھتا جاتا تھا، کہتے ہیں میرے اس طرز عمل کی خبر جب قریش کو ہوئی، بظاہر اس لفظ سے اشارہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرف کیا، کیونکہ وہ خود قریشی تھے، یہ پتہ نہ چلا کہ یہ کون صاحب تھے، کوئی بھی ہوں لیکن تھے قریشی عبداللہ کہتے ہیں کہ جب ان کو اس کی خبر ہوئی کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر بات کو لکھ لیا کرتا ہوں تو انھوں نے مجھے منع کیا مگر کیوں منع کیا بس ان ہی الفاظ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، عبداللہ کہتے ہیں کہ منع کرتے ہوئے ان ہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ

تکتب کل شئی ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر یتکلم فی الرضاء والغضب،

تم ہر چیز کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتے ہو، لکھ لیا کرتے ہو، رسول اللہ آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں، اور خوشی کی حالت میں بھی۔

گو حضرت عبد اللہ بن عمرو کی یہ حدیث اور اس حدیث کے الفاظ عام طور پہ مشہور ہیں، عموماً لوگ سُنتے پڑھتے ہیں اور گذر جاتے ہیں لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، یہ ذرا ٹھہرنے اور سوچنے کا مقام تھا۔

پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ جن قریشی صاحب نے عبد اللہ کو ٹوکا تھا، اگر حضرت عبد اللہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد لکھ رہے تھے تو ان کے ٹوکنے پر بآسانی جواب دے سکتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے بجائے اس کے ان کا خاموش ہو جانا، بلکہ آگے جو الفاظ ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ فامسکت (یعنی ٹوکنے پر عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں لکھنے سے رک گیا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر عرض کیا حالانکہ اگر پہلے سے اجازت یافتہ ہوتے تو اس کی بھی ضرورت نہ تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کسی وجہ سے کتابتِ حدیث کی ممانعت کی خبر نہ پہنچ سکی تھی، اب اس میں ان کی کمسنی کو دخل ہو یا کوئی اور وجہ ہو، اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی کمسنی کے زمانہ میں جب وہ اصغر القوم تھے، اپنے سے بڑی عمر والے صحابیوں سے ان کو یہ خبر ملی تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ سُنتے ہیں اُسے لکھ لیتے ہیں، خود اسی خیال میں رہے، بلکہ ان کی طبیعت کا جو انداز تھا خصوصاً عنفوانِ شباب میں دین کا نشہ ان پر جو چڑھ گیا تھا، خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اُتارنے سے بھی جو نہیں اُترتا تھا[1]۔ میں جب اس کو سوچتا ہوں تو خیال گذرتا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے جوش میں بھی کہیں

---

[1] عام کتابوں میں تو صرف اسی قدر ہے کہ رات کی شب بیداری، دن کے روزوں اور تلاوت قرآن ہی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے تھے کہ اتنا زیادہ بار اپنے اوپر نہ ڈالا کرو، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے لیکن وہ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اس خبر کو دخل نہ ہو، جو اپنے بڑوں سے انھوں نے سُنی تھی، یعنی ان کو یہی خیال آیا ہو کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھا کرتے ہیں تو میں بھی کیوں لکھنا سیکھ کر اس سعادت کا حصہ دار نہ بن جاؤں بلکہ اسی روایت کے بعض طریقوں میں یہ لفظ بھی بڑھا ہوا جو ملتا ہے یعنی عبد اللہ کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس لئے لکھا کرتا تھا تاکہ ان کو زبانی یاد کر دوں یعنی کہتے تھے کہ "ارید حفظہ" (مسند احمد ص۱۶۲ ج ۲) اس سے ان کی بلند ہمتی اور شدتِ ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، کیوں کہ ان بزرگوں میں یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ ہم لوگ جو کچھ لکھتے ہیں اسے زبانی بھی یاد کرتے ہیں، کچھ بھی ہو ان ہی وجوہ کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ بعض روایتوں میں اس قصہ کے بغیر صرف اتنا جو کہا گیا ہے کہ عبد اللہ کہتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور رضاً و غضب ہر حال کی گفتگو کے قلمبند کرنے کی مجھے اجازت تھی، وہ دراصل ان کی پوری گفتگو کا اختصار ہے جو راویوں نے کر لیا ہے اور ایسا روایتوں میں بکثرت ہوتا ہے، خیر یہ سوال تو چنداں اہم نہ تھا۔ دوسرا سوال جو بہت زیادہ مستحقِ توجہ اور محلِ غور ہے، وہ ان کے بیان کا یہ حصہ ہے یعنی قریش کے بزرگ نے کتابتِ حدیث سے منع کرتے ہوئے آگے جو یہ الفاظ بڑھائے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی بولتے ہیں"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہی کہتے جاتے تھے کہ یا رسول اللہ میری جوانی کا زمانہ ہے شباب کی قوت ہے میں سب برداشت کروں گا لیکن بعض روایتوں میں خصوصاً مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ مدینہ پہنچ کر جب یہ جوان ہوئے تو ان کے والد عمرو بن عاص نے ایک اونچے گھرانے کی خاتون جو قریش خاندان کی تھیں ان سے نکاح کر دیا۔ تین چار دن بعد عمرو بن عاص ان کے والد دلہن کے کمرے میں گئے پوچھا اپنے دولھے کو تم نے کیسا پایا ممکن ہے عمرو بن عاص کو بیٹے کے طرز عمل سے شبہ ہوا ہو اسی لئے خود دلہن سے جا کر پوچھا بے چاری نے کہا کہ بڑے اچھے شوہر ہیں۔ آج تک اس کی خبر نہ لی کہ میں کہاں رہتی ہوں اور کس بستر پر سوتی ہوں۔ عمرو بن عاص کو بھی بیٹے سے یہی توقع تھی، یا ہر شکل کر منتا کوئی باپ کسی جوان بیٹے کو کہہ سکتا ہے سب کچھ کہہ ڈالو لیکن دیکھا کہ یوں یہ لڑکا نہ مانے گا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا حال عمرو بن عاص نے پہنچایا۔ آپ نے بلا کر ان کو سمجھانا شروع کیا ۱۲

(باقی آیندہ)

قرآنِ حکیم کے لفظی و معنوی حقوق

(۳)

تلاوت، فہم، عمل

(از جناب خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب اسحاقی رحمانی، سہارنپوری)

اور قرآن سے قرآن کے مطلب کی وضاحت کا ادراک و علم نہ ہونے پر
سیدِ رسول قرآن پاک جن پر نازل ہوا۔ انھوں نے جو مطلب و معنی قرآن پاک کے بیان کئے
قولاً و فعلاً، یا ان پر عمل کر کے دکھایا (حالاً و دلالۃً) اور قرآنِ پاک کی جو تفسیر و توضیح اقوال و اعمال
احوال کی صورتوں میں ان سے منقول و ثابت ہے اس کو لیا جاتے۔ اور قرآن کا مطلب احادیث
سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا جائے اور بیانِ رسول سے مراد　　الٰہی کو
سمجھا جائے۔ کیونکہ آپ کی شان

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ اور
وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ کا مصداق ہے۔
رآن کی قرآنی تفسیر کے بعد تفسیر رسول ہر چیز پر مقدم ہوگی اور تمام امت کے لئے وہی تفسیر
وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ کے نص قرآنی کے مطابق

(الف) قابل حجت و لایق استدلال ہوگی۔

(ب) اس کا اتباع اور اس کے مطابق عمل واجب ہوگا۔

(ج) اس کے خلاف کہنا یا کرنا کسی صورت جائز نہ ہوگا۔

بشرطیکہ نقل صحیح ہو۔ اور سند صحیح کے ساتھ مستند ہو کر اس کا ثبوت بہم پہنچے۔ کیونکہ قرآن پاک جن پر نازل ہوا اُن سے زیادہ اور کون قرآن پاک کے معنے و مطلب کو سمجھ سکتا اور سمجھا سکتا ہے۔ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ انھوں نے جس طرح آیاتِ قرآنی کے معنی کئے۔ اور اس کی تشریح و تفسیر کی اور نقل صحیح کے ساتھ وہ تفسیر ہم تک پہنچی اس کو قبول کیا جائیگا۔ اور اسی کا اتباع اور اسی پر عمل واجب ہوگا۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

تفسیرِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین

تفسیر القرآن بالقرآن۔ اور تفسیرِ رسول کے بعد، تفسیرِ صحابہ سے قرآن مجید کے معانی و مطالب کو لیا جائے گا۔ قرآن سے قرآن کی تفسیر کا ادراک و علم نہ ہونے پر کلام صحابہ اور اقوال و آثارِ صحابہ کو ڈھونڈا جائے۔

صحابہ نزولِ قرآن کے عینی شاہد ہیں۔ وہ تنزیلِ قرآن کے وقت موجود تھے وہ نزولِ قرآن کے احوال و قرائن اور مشاہد و مواقع سے بخوبی واقف ہیں۔ آیاتِ قرآنی کے موارد و مصادیق ہیں۔ ان کا فہم تام ذوق کامل، علم صحیح۔ اور عمل صالح تھا جس کی گواہی خود قرآن مجید دے رہا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم و انوارِ نبوت کو بے واسطہ حاصل کرنے والے ہیں۔

انھوں نے قرآن عزیز کی جو تفسیر سمجھی وہ قبول کی جائے گی۔ کیونکہ نزولِ قرآن کی چشم دید گواہی اور علوم و اعمال نبوت کی وراثت و نیابت اور منصبِ تبلیغ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا انپر خاص فضل تھا۔ اسی وجہ سے ان کی قوتِ مدرکہ کے ساتھ نصرت و تائیدِ ربانی شامل تھی۔ ان کا حال حال تھا، قال نہ تھا۔

اور اگر ان تینوں مقامات و موارد میں طلب کرنے کے بعد بھی قرآن پاک کے معنی و مفہوم

کا علم و ادراک نہیں ہوتا۔ اور آیاتِ قرآنی کا مطلب حل نہیں ہوتا۔ تو اس کے بعد صحابہ کے شاگردوں سے یعنی حضرات تابعین کے اقوال سے تفسیر طلب کی جائے۔ اور انھوں نے قرآن پاک کو جس طرح جانا۔ سمجھا۔ بیان کیا اور عمل کیا اس کے مطابق تفسیر کی جائے گی۔

رسول۔ صحابہ۔ تابعین و اتباع تابعین۔ یہ تین چشمے اور منابع ہیں جن سے قرآن پاک کے مفاہیم و معانی، ہدایات و احکام اور کتابِ الٰہی کے اسرار و حکم کی سوتیں جاری ہیں۔ ان کا قول حجت، اور عمل لائقِ استدلال ہے۔

بہر حال قرآن کی تفسیر کا ارادہ کرنے اور اس کے معنی و مفہوم سمجھنے کے وقت ان اصول کا پابند ہونا اور ان کے مطابق تفسیر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ قرآنِ پاک کی تفسیر اور معنی و مفہوم کی تعین میں غلطی کا احتمال یقینی ہے۔

اور درحقیقت وہ تفسیر جو بیانِ رسالت اور تفسیر صحابہ و اکابر سلف یعنی سُنن و احادیث و آثارِ سلف صالحین کے مسلک کے خلاف ہو قرآن کی تفسیر ہی نہیں بلکہ معنوی تحریف ہے۔

قرآن حکیم کی وہی تفسیر معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور ما بعد کے علمائے راسخین سے منقول ہے، تواتر و توارث کے طریقہ پر دین کے عقائد و اعمال اس سے ثابت ہیں۔ اور ہر دور کے لئے تہذیبِ اخلاق۔ تدبیرِ منزل۔ سیاستِ مُدن کے بنیادی اصول، معاش و معاد۔ موت و حیات اور دنیا و آخرت کا اساسی قانون اس سے تکمیل پاتا ہے البتہ قرآن پاک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جس طرح سمجھا گیا آج ہمیں بھی اس کو اسی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عرب ہوں یا عجم سب کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے فہم و تدبر اور اس کی تفسیر و تاویل ان ہی سرچشموں سے حاصل کریں جو اس کے اصل موارد و مواقع ہیں۔ قرآن مجید کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا معجزہ قرار دیا گیا ہے اور نبی علیہ السلام نے جیسا کہ خود قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ

فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ اِنْ كَانُوْا صَادِقِيْنَ

عرب کے اور اُن کے واسطہ سے قیامت تک تمام دنیا کے فصحاء، بلغاء اور ادباء وشعر
کو اس کلام کے مثل لانے پر جا بجا اس پوری کتاب کی یا اس کی دس سورتوں کی یا ایک چھوٹی
کے مقابلہ ومعارضہ میں تحدی کی اور چیلنج دیا ہے۔

قرآن پاک کی آیات وکلمات کا تحدی کے باوجود زمانۂ نزول قرآن سے نقل متواتر
سا تھ آج تک منقول ہونا اور جن لوگوں کے سامنے قرآن حکیم نازل ہوا ان کا اس کے اعجاز
تاثیر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا، دل وزبان سے اس کا اقرار کرنا، اس کی تحدی اور مقابلہ
عاجز ہونا اور تمام عرب اور کفار ومشرکین کا اس کے معانی ومطالب کو سمجھ لینا تاریخی بداہ
کا ایسا روشن ترین واقعہ ہے جس کا کوئی اہل علم وعقل موافق ومخالف انکار نہیں کرسکتا۔

اور آج بھی تمام دنیا میں کوئی ایک فرد واحد بھی اس کے اعجاز وتاثیر اور روحانیت ذا
کا مقابلہ نہیں کرسکتا، قرآنِ پاک کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسا
کا یہ اعجاز علمی وعقلی تمام منکرین ومعاندین ہی پر نہیں بلکہ تمام انسانوں کی درماندگی وعجز پر دا
دلیل اور قوی برہان ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

قرآن مجید اور تفسیر بالرائے ماقبل میں یہ ذکر ہوچکا ہے کہ قرآن پاک ایک قطعی اور یقینی چیز ہے اور اس کے معا
ومطالب بھی بیّن اور روشن ہیں اور یہ اپنے دعویٰ ومدعا اور برہان ودلیل م
محکم ومستحکم ہے۔ نیز یہ کہ آپ اپنے مقصود ومدعا کے لئے کافی ووافی ہے اور اس کا مطلب بغ
روایات واخبار اور احادیث وآثار کے ملاتے خود اس سے ہی سمجھ میں آتا اور آسکتا ہے۔ جو ا

مفہوم کے اظہار میں کسی خارجی ضمیمہ اور بیرونی مدد کا محتاج نہیں اور اس کا مقصود و مدعا و مفہوم و مطلب، ترجمہ و معانی اپنی ذات میں کامل اور مکمل و مفید ہیں، ناقص و ناتمام ناکمل و غیر مفید یا کسی دوسری چیز پر موقوف نہیں۔

اب اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کا مطلب بغیر علم کے یا اپنی رائے سے اس طرح بیان کرے جو

(الف) عربی زبان کے خلاف ہو۔

(ب) یا ان ضروریاتِ دین اور بیّن و بدیہی امور کے خلاف ہو جو صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی طور پر ثابت ہیں۔

تو وہ تفسیر بالرائے کہلائے گا اور وہ تفسیر صحیح و معتبر نہ ہو گی۔ بلکہ قرآن پاک کی معنوی تحریف ہو گی۔

احادیثِ رسول اور تفسیر بالرائے | تفسیر بالرای کے بارے میں چار حدیثیں ہیں ملتی ہیں۔ جن میں سے دو حدیثوں کو موضوعات میں شمار کیا گیا ہے[1] ان میں پہلی حدیث یہ ہے۔

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهٖ فَاَصَابَ كُتِبَتْ عَلَيْهِ خَطِيْئَتُهٗ لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ الْعِبَادِ لَوَسِعَتْهُمْ وَاِنْ اَخْطَأَ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

اس حدیث میں ابو عصمہ راوی وضع وکذب اور اختلاق کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے حاصل مطلب حدیث کا یہ ہے کہ محض اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنے والا اگر اتفاق سے صحیح مطلب بیان کر رہا ہے تب بھی وہ اتنی بڑی خطا کا مرتکب ہے جو تمام دنیا کے خطاکاروں کے گناہ کے برابر ہے اور اگر مفسر سرے سے تفسیر ہی میں غلط بیانی ہو رہی ہے تو وہ مستحق جہنم ہے سنداً اور متن دونوں کے لحاظ سے یہ حدیث درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهٖ وَهُوَ عَلٰى وُضُوْءٍ فَلْيُعِدْ وُضُوْءَهٗ

---

[1] تذکرۃ الموضوعات للعلامۃ الطاہر مطبوعہ مصر صہ ۸۲

اس حدیث میں عثمان راوی وضع وکذب کے ساتھ موصوف ہے، اس کا حاصل یہ ہے جو شخص باوضو ہوتے ہوئے محض اپنی رائے سے تفسیر کرتا ہے اس کا وضوء ٹوٹ جاتا ہے اس کو وضوء کا اعادہ کرنا چاہئیے اس حدیث کے متن اور معنی کی رکاکت بھی ظاہر ہے۔

الغرض یہ مذکورہ بالا دونوں حدیثیں بحث سے خارج ہیں اور ان پہ کوئی کلام کرنا بیکار ہے چونکہ سند ومتن دونوں کے اعتبار سے یہ موضوعات میں شمار ہوتی ہیں۔

اب دو حدیثیں تفسیر بالرائی کی ممانعت میں باقی رہتی ہیں اور یہی اس بارے میں زیادہ مشہور ہیں ایک حضرت ابن عباسؓ کی۔ دوسری حضرت جندبؓ کی۔

یہ دونوں حدیثیں صحیح اور مرفوع ہیں اور تفسیر بالرای کے بارے میں نص قطعی کا حکم رکھتی ہیں حضرت ابن عباس کی روایت دو طرح پہ ہے۔ ایک روایت میں (برأیہ) کا لفظ ہے اور دوسری میں (بغیر علم) کا۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں اور اسی طرح حضرت جندبؓ کی روایت میں برأیہ کا لفظ آیا ہے رائے سے نفس عقل وفہم مراد نہیں کیونکہ اس صفت سے کوئی انسان بھی خواہ عالم ہو یا عامی خالی اور عاری نہیں۔ یہ عقل وفہم ہی ہے جو انسان اور باقی حیوانات ومخلوقات کے درمیان مابہ الامتیاز ہے نیز انسان کے لئے تمام امور تکلیفیہ اور اوامر ونواہی کا مدار اسی پہ ہے قرآن پاک اسی عقل وفہم کی رو سے انسان سے خطاب کرتا اور پھر ان عقول وافہام کے مراتب ومدارج کے لحاظ سے ان سے کلام کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجنون وسفیہ اور طفل لایعقل قرآن پاک کے مخاطب ومکلف نہیں ہیں،

اور یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کسی فعل کے حسن وقبح اور کسی شے کی خوبی وزشتی کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے جس کا کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا اچھے کام اور اس کے کرنے والے کی مدح وتعریف اور برے کام اور اس کے کرنے والے کی مذمت وتنقیص اہل عقل کا شیوہ ہے البتہ فعل حسن پہ شارع کے مقرر کردہ ثواب، اور فعل قبیح پہ شارع کے بیان کردہ

عقاب، تعزیرات وحدود داد رکسی فعل پر جزا و سزا کے ہونے کا عقلی طور پر ادراک بعض صورتوں میں ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں انسانی عقل کی رسائی شارع کی اس نافع مصلحت اور غامض حکمت کی گہرائیوں تک نہیں ہوتی جو شارع کی نگاہ میں ہر ایک ان امور میں مخفی رکھی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس کی پہلی روایت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ[1]

شاہ عبدالحق صاحب نے اس حدیث کا مطلب یہ لکھا ہے جو شخص قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے، اپنی عقل اور اپنے قیاس سے بغیر نقل سند کے کچھ کہے تو اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں پکڑ لینا چاہئے[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کے بارے میں صرف اپنی رائے کو دخل دینا اور صرف اپنی عقل و خیال سے ظن و تخمین کا تیر چلانا سخت منع ہے۔ جب تک نقل صحیح سے اس کا استناد نہ ہو۔ اور جو اس امر کا ارتکاب کرے وہ بتصریح حدیث مستحق وعید ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت میں مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ الخ کا لفظ ہے[3] اور مطلب اس کا یہ ہے کہ قرآن پاک میں زبان عرب۔ اصول عربیت اور ضروریات دین کی کامل معلومات کے بغیر کچھ کہنا اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنانا ہے۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اپنی رائے سے اور بغیر علم کے کلام الٰہی کے بارے میں کچھ کہنا اس دنیا ہی میں جہنم کی وعید کا مستحق بنا دیتا ہے اور جس امر پر شارعؑ کی جانب سے وعید ہو وہ کبیرہ گناہ، حرام بلکہ قریب بکفر ہے۔

دوسری روایت تفسیر بالرائے کی ممانعت میں حضرت جندبؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ ۔ کہ جو کوئی قرآن میں اپنی طرف سے کوئی رائے، کوئی بات، کوئی خیال، اور کوئی مطلب بیان کرے اور وہ اتفاق سے درست بھی نکل آئے تب بھی اس نے خطا کی،

---

[1] مشکوۃ ص۳۵ و جمع الفوائد ج ۲ ص۴۲ [2] اشعۃ اللمعات ج ا ص۱۶۵ [3] مشکوۃ ص۳۵ و جمع الفوائد

شاہ عبدالحق صاحب اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ فی الواقع اس کی رائے درست اور صواب نکلی مگر اس پر غلطی کے ارتکاب کا حکم لگایا جائے گا اور اس کو خطاوار کہیں گے کیونکہ اس نے قرآن کے قصدِ فہم اور طریقِ فہم میں غلطی کی ہے، اپنے رائے کو دخل دیا ہے اور جو اس کے سمجھنے کا طریقہ و اسلوب تھا اس کو اختیار نہیں کیا۔

پھر آگے چل کر اسی ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن پاک کے فہم کے لئے دو طریقے ہیں ایک تفسیر، دوسرے تاویل۔

تفسیر یہ ہے کہ آیت کے معنی کے متعلق جزم و یقین اور زور کے ساتھ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد اس آیت سے یہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ مراد نہیں ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ مرادِ الٰہی کو کسی آیت کے متعلق متعین کر دینا اس وقت درست ہو سکتا ہے جبکہ اسے سندِ صحیح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ائمہ تفسیر نے نقل کیا ہو۔ یہ تفسیر بیانِ رسالت سے نقل و سمع اور اس کی صحت واستناد پر موقوف ہے۔

اور تاویل یہ ہے کہ آیت کے متعلق بطور احتمال اور بطریق اجمال کہا جائے کہ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے لیکن اس کے صحیح ہونے کے لئے بھی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ قواعد عربیہ کے موافق ہو دوسرے یہ کہ قوانین شریعت کے خلاف نہ ہو۔

غرضکہ قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر میں اسی طرح شرائع اور اصولِ دینیہ میں کوئی اختلاف تضاد اور تناقض ممکن نہیں۔ البتہ کلام اللہ کی تاویل میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے اور اس کے لئے تصحیح رائے اور ترجیح قول کی صورت ضروری ہے۔ بغیر اس کے وہ اختلاف مقبول و مسموع نہیں، تاویل چونکہ ایک احتمالی امر ہے اور چند معانی میں دائر و مشکوک رہتی ہے۔ اس لئے تاویل کے ذریعہ کسی امر منصوص و مصرح یا امر توقیفی پر قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس تاویل کو امر منصوص کی طرف رد کیا جائے گا۔ اور اسے نص و توقیف کی موافقت پر محمول کریں گے۔ لیکن نص کو تاویل کے ساتھ رد کرنا جائز نہ ہوگا۔ تاویل خود اپنی صحت کے

نبوت میں نص اور دلالت قطعی کی محتاج ہے اور اس سے احتجاج واستدلال ساقط ہے[1]
حضرت ابن عباسؓ کی پہلی روایت کا جس میں "برائیہ" کا لفظ منقول ہے۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں جو مطلب لکھا ہے ہم اس کو اپنی عبارت میں لکھتے ہیں۔ علامہ علی قاریؒ لکھتے ہیں۔

قرآن میں اپنی رائے سے کلام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کے معنی میں یا اس کی قراءت میں (کیونکہ قراءت عشرہ متواترہ بھی تفسیر القرآن بالقرآن ہے (مترجم)) اپنی طرف سے گفتگو کرے اور اس کا یہ کلام علمائے لغت وعربیت کے اقوال کے جو قوانین شرعیہ کے موافق ہوں تتبع وتفحص کے بغیر ہو بلکہ اپنی عقل سے تفسیر کرے۔ حالانکہ

(۱) وہ معانی ومطالب ایسے ہوں کہ ان کا نقل پر موقوف ہونا ظاہر ہے جیسے اسباب نزول آیات، ناسخ ومنسوخ آیات وغیرہ جو امور قرآنی نقل وسمع پر مبنی ہیں۔

(۲) یا وہ معانی ومطالب ایسے ہوں جو قصص واحوال سے متعلق ہوں۔

(۳) یا اوامر ونواہی اور احکام سے متعلق ہوں۔

(۴) یا ظاہر نقل کے ساتھ تفسیر کردی حالانکہ وہ بات ایسی ہے جس کا توقف عقل پر ہے جیسے متشابہ آیات کی تفسیر فرقہ مجسمہ نے کی ہے کہ ان کے ظاہری الفاظ کو لے لیا اور یہ نہ خیال کیا کہ ظاہری الفاظ کے معانی محال ہیں۔ صرف ظاہری نقل کے تقاضے پر عقلی توقف کو پس پشت ڈال دیا۔

(۵) یا ایسی تفسیر کی جو بعض علوم الٰہیہ کے تو موافق ہے مگر خود باقی علوم کو یا علوم شرعیہ کو کما حقہ نہیں جانتا۔ حالانکہ وہ علوم ایسے ہیں کہ ان میں علوم شرعیہ کی ضرورت وحاجت ہو۔ یہ تمام صورتیں تفسیر بالرای کی ہیں۔

ان دونوں صحابہ کی روایات سے اور ملا علی قاری اور شاہ عبدالحق صاحب کے بیانات سے جو امور معلوم ہوتے ہیں ہم اس کو ایک عام فہم عبارت میں تفصیل ووضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۱۲۳

ماحصل سب کا یہ ہے کہ اگر قواعدِ عربیت کے لحاظ سے آیتِ قرآنی کے کئی معنے ہو سکتے ہیں تو ان متعدد معانی کو دیکھا جائیگا کہ باہم دگر مخالف و معارض تو نہیں۔ اگر نہیں تو معانی مراد لیئے جا سکتے ہیں۔ اور اپنے اپنے موقع اور مورد و محل پر ان کا استعمال و انطباق کیا جائے گا۔

اور اگر ان متعدد معانی میں باہم دگر تضاد و تناقض ہے تو ان سب معانی میں ایک کو دوسرے معنی پر ترجیح دینے کے لئے روایات و احادیث، اخبار و آثار اور سُنن کی طرف رجوع کریں گے پس اگر ایک معنی کی تائید و تصدیق روایاتِ صحیحہ اور سنتِ رسول سے ہو جاتی ہے تو اس معنے کو ترجیح دی جائے گی اور باقی کو ترک کر دینا پڑے گا۔

لیکن اخبارات و روایات کے متعلق یہ بات ضرور ملحوظ رہے گی کہ ان کا درجہ باوجود ہونے کے ظنی ہے اور قرآن مجید قطعی ہے۔ اور ظنی چیز کو قطعی چیز کے ساتھ ملا کر نتیجہ نکالنا اگر از روئے اصولِ ظنی ہوگا مگر چونکہ روایت و حدیث کو اس آیت کے ساتھ ملانے سے اس کے معنی و مطلب

(الف) زبانِ عرب کے قواعد کے خلاف نہیں۔

(ب) ضروریاتِ دین اور اصولِ شریعت کے خلاف نہیں۔

(ج) بداہت و عقل کے خلاف نہیں۔

اس لئے ان معانی کو ترجیح دینا ضروری ہوگا۔

اور اگر آیت کے معنی اور اس کا مطلب و مفہوم تو سمجھ میں آگیا ہے لیکن اس کے مدلول کی تعیین یا اس کے مصداق و مورد کی تشخیص آیتِ قرآنی سے نہیں ہو سکی۔ بلکہ کسی ذریعہ اور بیرونی واقعہ (تاریخ و قصص و آثار وغیرہ) پر موقوف ہے۔

تو اب اس واقعہ کو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ واقعہ اپنے ثبوت میں قرآن کے ثبوت اور سے کم نہیں تو بلا نکیر اس کو قبول کریں گے اور قرآن ہی کی طرح وہ بھی قطعی ہوگا۔ اور اگر اس

ا ثبوت قرآن کی قطعیت سے کم ہے تو اس کو ملا کر جس مراد کی تعیین یا جس مصداق کی تشخیص
ی جائے گی وہ ظنی ہوگا۔

غرضکہ مشکوۃ و جمع الفوائد کی متعلق احادیث سے جو ترمذی و ابو داؤد سے نقل کی گئی ہیں
ور اشعۃ اللمعات و مرقاۃ سے جو ان کے مطلب کی توضیح کی گئی ہے تفسیر بالرای کے متعلق
سب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک یہ کہ تفسیر بالرای اسے کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت کا مطلب نقلِ صحیح کے بغیر اپنی رائے
ور قیاس سے کیا جائے اور بغیر علم و معلومات اس بارے میں کچھ کہا جائے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی اور یاد رکھنی ضرور ہے کہ علم سے مراد ۔

(الف) زبانِ عرب اور عربیت (قواعد ادب و بلاغت وغیرہ) کا علم۔ اور۔

(ب) اصولِ شریعت و ضروریاتِ دین کا علم ہے۔

س لئے ایسا شخص جو زبانِ عرب سے ناواقف اور علمِ اصولِ شریعت سے بے بہرہ ہو اگر قرآن
ی کسی آیت کا مطلب بیان کرنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عدمِ واقفیت کی وجہ سے وہ جو کچھ
کہے گا اپنی رائے اور عقل سے کہے گا۔ اور وہ مطلب اتفاق سے صحیح بھی نکل آئے اور فی الواقع
رست اور حقیقت میں صحیح وصواب ہو۔ یہ تفسیر بالرائی ہوگی۔

تفسیر بالرائی اور تفسیر بدون الرائی

اس لئے ایسے شخص کو جو ان دونوں علوم (زبان عرب اور اصولِ شرع) سے کامل
واقفیت نہ رکھے یا جو بالکل جاہل اور ناآشنائے محض ہو قرآن پاک کی آیات کے
معانی و مطالب بیان کرنے کے لئے لب کشائی کرنا کسی صورت درست نہیں۔

اور جو ایسا کرتا ہے وہ بجائے تفسیر قرآنی کے قرآن پاک میں معنوی تحریف کا مرتکب
ہوتا ہے اور احادیث کے مطابق جہنم کی وعید کا مستحق۔

پس قرآن کی آیات کا مطلب اپنی عقل اور اپنے قیاس سے بدون مراجعت کتاب و
سنت اور بدون تتبع آیات و روایات بیان کرنا اور زبان عرب کے قواعد اور شریعت کے

اصول و قوانین کا لحاظ نہ کرنا تفسیر بالرای ہے

اور قرآنی آیات کا مطلب قواعدِ عربیت اور اصولِ شریعت کے مطابق (بغیر ظنی روایات و اخبار کے ملائے) بیان کرنا صحیح تفسیر ہے اور یہی تفسیر بدون الرائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے معانی و مطالب معلوم کرنے کا صحیح، اصلی اور اصولی طریقہ یہ ہے کہ

(۱) اصولِ عرب اور زبانِ عرب کی پابندی کی جائے۔

(۲) اور اصولِ شریعت (کتاب و سنت) کے مطابق قرآنی آیات کا مطلب اور اس کے نظم و عبارت کا مفہوم بیان کیا جائے۔ اور اگر

(الف) اس مطلب کی تائید و موافقت میں صحیح روایات مل جائیں تو ان کو لے لیا جائے مگر ان کا درجہ قرآن سے کم ہوگا۔ کیونکہ قرآن قطعی ہے اور احادیث ظنی۔

(ب) اور اگر صحیح روایات نہ ملیں۔ بلکہ ضعیف روایات ملتی ہیں تو قرآن پاک کی موافقت اور تائید و تصدیق کی وجہ سے ان کو بھی قبول کیا جائے۔ اگرچہ وہ ضعف کے کسی درجہ میں بھی ہوں لیکن موضوع و مختلق نہ ہوں

(ج) اور قرآن پاک کے معانی و مطالب کی صریح مخالف روایات قابلِ ترک ہونگی چونکہ قرآن پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور احوال و اعمال کی تصدیق و تائید کرنے والا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرا جو کلام حدیث تم تک پہنچے اس کو کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھو، اگر کتاب اللہ کے موافق نکلے اس کو قبول کرو اور اگر موافق نہ ہو تو اس کو قبول نہ کرو۔[۱]

تفسیر بدون الرای جو حق اور صحیح تفسیر ہے اور تفسیر بالرائی جو غلط اور باطل تفسیر ہے ان دونوں کا فرق معلوم کرنا اور پھر تفسیر بالرای میں یہ معلوم کرنا کہ تفسیر کیا ہے اور درای، کیا ہے اور

---

[۱] تفسیر احمدی ص۳

کتنی ہے۔ ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ جس کی معرفت فطرتِ سلیمہ کے ذوقِ صحیح پر موقوف ہے۔
اور باوجود ذوقِ سلیم، عقلِ صحیح، نورِ فراست ایمان وعمل صالح کے مرادِ الٰہی کو بالیناہر
کس وناکس کا کام نہیں۔ لغزش اور غلطی سے کوئی انسان وہ کیسا ہی ماہر وباکمال اور حاذق و
محقق ہوا اپنے آپ کو مبرا نہیں کر سکتا۔

البتہ سلف صالحین کی روش پر اور سابقین امت کے نقشِ قدم پر چل کر ہر زمانہ کی ضروریات
ومصالح کے لئے قرآنی آیات کے ابواب کشادہ ہیں اور ہمیشہ مفتوح رہیں گے کیونکہ یہ انسان
کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور متعین وغیر مبدل اساسی قانون و دستور۔

سُننِ نبوی اور آثار صحابہ وتابعین اور مابعد کے علمائے راسخین کے فہم وعمل پر اعتماد ویقین
قرآنِ پاک کے علم وعمل اور تادیلی نکات وتفسیری حقائق کی وضاحت کے لئے کافی وافی ہیں۔ ان
ہی اصول کے مطابق عصری ضروریات اور اہل زمانہ کے مصالح کے لئے قرآن پاک کی تشریح
وتفسیر اور افہام وتفہیم لازم ہے۔ اور ان سے انحراف قرآن وسنت میں تحریف اور تعاملِ
سلف کا ابطال ہے۔

قرآن کریم کے سب سے پہلے شارحین ومفسرین حضرات صحابہ کرام ہیں انھوں نے
جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے مطالب ومعنی حاصل کئے کلامِ الٰہی کی مراد معلوم
کی اور اس پر عمل ہوتے ہوتے دیکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے حکم وارشاد
سے عمل کر کے دکھلایا۔ اسی طرح بعد والوں کو تبلیغ وتعلیم اور ابلاغ وتلقین کی صحابۂ کرام جو قرآنِ عظیم
کی تفسیری خدمات انجام دیتے تھے قریباً سب کے سب پہلی صدی ہجری کے حدود میں دفات
پا گئے تھے۔

ان کے بعد تابعین کرام میں قلیل تعداد ان شارحین ومفسرین کی ہے جنہوں نے پہلی
صدی ہجری میں انتقال کیا اور کثیر تعداد ان تابعین ائمہ تفسیر کی ہے جنکی وفات ہجرت نبویہ کے

---

[۱] العرف الشذی تقریرات ترمذی حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ

دوسرے دور میں ہوئی۔ پھر تبع تابعین میں جو علمائے مفسرین شمار ہوتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے اواخر تک جوارِ رحمتِ رب سے ہمکنار ہوئے۔

تیسری صدی ہجری کے بعد سے کتب تفاسیر اور اقوالِ مفسرین کی کتابت و تدوین کا دور شروع ہوتا ہے۔ آج چودھویں صدی کے نصف سے زیادہ گذرنے تک قرآنِ حکیم کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تفسیریں لکھی گئی ہیں اور ہر صاحبِ ذوق عالم نے اپنی زبان اپنے فضل و کمال اپنے زمانہ کے رنگ، ماحول و مذاق، رجحان طبیعت اور عصری ضروریات کے مطابق قرآن پاک سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

لیکن یہ حقیقت آج بھی اسی طرح حقیقت ہے اور ہمیشہ اسی طرح حقیقت رہے گی کہ قرآن کا صحیح معنے میں فہم و عمل، بغیر اس متوارث نمونۂ عمل کے سمجھے اور معلوم کئے ناممکن اور محال ہے جو متواتر اور مستند طور پر اسوۂ حسنہ نبویہ، صحابہ و اہل بیت، تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین و علمائے صالحین سے منقول و ثابت اور جمہورِ امت کا معمول بنا رہا ہے۔

خلافت عباسیہ

جلد اول۔

تاریخ ملت کا پانچواں حصہ جس میں نو عباسی خلفاء سفاح، منصور، مہدی، ہادی، ہارون امین، مامون، معتصم اور واثق باللہ کے سوانح حیات ایک خاص اسلوب سے جمع کئے گئے ہیں، خلافتِ عباسیہ کا یہی دور حقیقت میں دورِ عروج تھا اور اس دور میں عباسی خاندان کی قوت و اقتدار کا رعب تمام ہمسایہ سلطنتوں پر چھایا ہوا تھا کتاب کے اس حصے میں آپ کو نہ صرف ان عظیم الشان خلافتوں کے جامع و مستند حالات و واقعات ملیں گے بلکہ ہر خلیفہ کے عہد حکومت اور اس کے علمی مذہبی تمدنی اور اصلاحی کارناموں پر دلپذیر تبصرہ بھی ملے گا جس سے مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے مرکز بغداد کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے صفحات ۴۴۴ قیمت غیر مجلد ۱۲/- مجلد للعہ

اقبال کا نظریۂ شاعری

(از خواجہ احمد فاروقی ، دہلی کالج)

ایک تقریر جو رمنا کالج رام پور میں یوم اقبال کے موقع پر کی گئی

اقبال کی شاعری نے اُس وقت ہوش کی آنکھ کھولی جب ہمارے قوائے عمل شل ہو چکے تھے ، اور شعلہ حیات سرد ہو رہا تھا ، ہندوستان میں تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا ، مشرق آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا ، اس کے خون سے مغرب میں شراب ناب بنائی جارہی تھی ۔ خود مغرب ، مادیت کے فریب میں گرفتار تھا اس کے حصّہ میں نہ لغزشِ مستانہ تھی ، نہ آہِ بیتابانہ ۔ ہر طرف تدبر کی فسوں کاری کارفرما تھی یا جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری جلوہ فرما

مشرق خراب ، و مغرب ازاں بیشتر خراب   عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو

اس وقت ہندوستان ہی نہیں ، تمام عالمِ مشرق ایک ایسے آتشیں فطرت ، نوا سنج کے رجز ہائے امید افروز کے لئے گوش برآواز تھا ، جو اس کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے ، جو ظلمتِ شب کے بعد صبح عید کی خبر دے اور جو اپنے نفسِ شعلہ بار سے سیماب کی سی بیتابی پیدا کر دے ۔

قدرت نے یہ خدمت اقبال کے سپرد کی جس نے اپنے نفسِ گرم کی آمیزش سے الفاظ کے ہیکر میں نئی روح پھونک دی اور اپنی معجز بیانی اور شعلہ بار آواز سے سارے مشرق کے نیستان کو آتشکدہ بنادیا ۔

اقبال کو مشرق کی ایسی متزلزل اور اقتدار باختہ اقوام کو مخاطب کرنا تھا ، جن کے پاس بجز اوہام کے تار و پود کے اور کچھ نہیں تھا جن کے دل اور دماغ دونوں گرفتارِ طلسم تھے

جن کے جام و سبو میں گریۂ طفل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جو اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے بے خبر تھے، جن کے الفاظ بے جان اور بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اور جن کی شاعری افسوں و افسانہ سے زیادہ نہیں تھی ان کے سبزہ زاروں کا تخیل عشق و مستی کو جنازہ تھا اور ان کے اندیشۂ تاریک میں پوری قوم کا مزار نظر آ سکتا تھا۔

اقبال کو جو کچھ کہنا تھا، وہ زمانہ کی زبان بندی اور اقوام کی زبوں حالی کے پیش نظر نہایت اہم اور مشکل کام تھا۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے سوزش جگر کے ساتھ دل باخبر اور اضطراب موج کے ساتھ۔ سکون گہر کی ضرورت تھی۔ پھر خیالات کا یہ خزانہ ہی کافی نہیں تھا اس کے اظہار کے لئے ایک نئے شاعرانہ نقطۂ نظر، ایک نئے اسلوب اور ایک نئے سانچے کی ضرورت تھی۔

اقبال نے خوابوں کے عظیم الشان محل تعمیر نہیں کئے، اس نے تصور جاناں ہی کو اپنا سرمایۂ حیات نہیں سمجھا اس نے ہمارے متاخرین شعرا کی طرح "حسن کی رسیلی شبنم کے جرعہ نوشیں سے پرورش نہیں پائی۔ اور خیالی جنت کی نہروں کا مصفا دودھ نہیں پیا" وہ اگر ستاروں سے آگے پرواز کا قائل ہے، تو اپنا ایک پیر زمین پر بھی استوار رکھنا چاہتا ہے، سرد و شعر کو بھی وہ خودی کی حفاظت سے الگ کرنا نہیں چاہتا۔ اور سنگ و خشت کے بجائے افکار تازہ سے اس جہان قدیم کی تخلیق نو کا آرزومند ہے، وہ الفاظ و تراکیب کا سارا سرمایہ، خط و خال یا زلف و عارض کی تعریف و توصیف پر صرف کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا خواہشمند ہے کہ ادبیات کے کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کیا جائے یا اس کہن روح کو تقلید کی بندش سے آزاد کر دیا جائے وہ نغمۂ خواب آور کو جائز نہیں رکھتا، وہ تو ایسا نغمہ چاہتا ہے جو لالہ و گل کی آگ بھڑکا دے۔ وہ ایسا نفس چاہتا ہے جو حرارت و گداز میں اضافہ کر دے، وہ ایسے ادب اور شعر سے بیزار ہے جو حریم وجود میں خودی کی شمع کو روشن نہ کر سکے اس لئے کہ آرٹ کا تعلق زندگی سے کبھی بھی منقطع نہیں کیا جا سکتا اور زندگی دراصل اسی خودی کے سرور و سوز اور ثبات کا نام ہے، اقبال آرٹ کو غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے

وہ اس کے ذریعہ افسردہ رگوں میں زندگی کی برقِ تپاں دوڑانا چاہتا ہے۔ وہ اُس بادِ سحر کا قائل
نہیں جس سے چمن افسردہ ہو اور نہ اُس قطرۂ نیساں کا جس سے دریا کا دل متلاطم نہ ہو۔
اقبالؔ نے جب اپنے مخصوص رجز کی ترانہ سنجی شروع کی اس وقت امیرؔ و داغؔ کا طوطی
بول رہا تھا۔ یہ اندازِ نگارش اقبالؔ کے لئے فائدہ مند نہ تھا، حالیؔ و اکبرؔ نے ایک نئی روش ضرور
نکالی تھی لیکن اقبالؔ کی پیاس اس جوئے کم آب سے کہاں بجھ سکتی تھی؟ اس نے غالبؔ کے خرمن
سے خوشہ چینی کی اور بقول ڈاکٹر عبدالحق اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اقبالؔ کبھی نہ ہوتے لیکن حقیقتاً یہ میدان
بھی اُس کی ہمت کے لئے کم تھا، اس نے تمام اردو اور تمام فارسی شاعری کا جائزہ لیا اور اُس سے
بہت سے علامات و اشارات لئے اور اس میں بہت سے اپنی طرف سے اضافے کئے اس طرح
مینائے کہن میں نئی شراب اُنڈیل کر اس نے اردو و فارسی شاعری کا رنگ و آہنگ ہی بدل دیا۔
اقبالؔ کے نزدیک شاعری کا مقصد حقیقت طرازی ہے اگر اس سے یہ مقصد پورا نہیں
ہوتا تو وہ ایک نشہ ہے لطیف لیکن مہلک۔ اس خیال کو اس نے جا بجا ادا کیا ہے:-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبالؔ دوسروں کے افکار و تخیل سے اپنی دوکان آراستہ کرنا نہیں چاہتا وہ خود اپنی نظر
سے چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی خودی تک پہنچنے کا آرزومند ہے۔ اپنے نورِ سحر سے آسمانوں
کو روشن کرنے کے لئے مضطرب ہے:-

دیکھے تو زمانہ کو اگر اپنی نظر سے افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

اقبالؔ کے کلام میں جلال اور جمال دونوں کی خوبصورت آمیزش ہے وہ کہتا ہے وہ نغمہ کیا
جو آتشناک نہ ہو، وہ شعلہ کیا جو سرکش و بیباک نہ ہو۔ اِس آئینۂ فطرت میں اگر شاعر یا مصور اپنی
خودی نہیں دکھلا سکتا تو اس کی کوششیں بیکار اور مرگِ تخیل کے مترادف ہیں۔ اسی طرح وہ سرود
کو کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو ستاروں کو پگھلا نہ سکے، مغنی کا وہ زیر و بم بیکارِ محض ہے جو زندہ و پایندہ نہ ہو۔

وہ اہلِ ہنر جن کی خودی، غلامی کی تاثیر سے نرم ہو چکی زمین پر بوجھ ہیں اور قوم کے لئے زہر ایسے مرغانِ سحر جن کی نوا سے گلستان افسردہ ہو، وہ اگر خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے اسی طرح ایسے فرہاد جو صرف کوہ کنی کے قائل ہیں اور دولت پرویز کو متزلزل نہیں کر سکتے ان کا وجود قوم کے لئے فائدہ مند نہیں، نقصان رساں ہے۔

اقبال آرٹ کے مقابلہ میں ذوقِ نظر اور خلوصِ دل کے ساتھ محنتِ پیہم کا بھی قائل ہے اس کا خیال ہے کہ کوئی جوہر بغیر کوشش ناتمام کے ظاہر نہیں ہوتا۔ مے خانۂ حافظ اور بت خانۂ بہزاد خونِ رگِ معمار ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

درحقیقت اقبال شعر کو پیغامِ حیاتِ ابدی، نغمۂ جبرئیل اور بانگِ اسرافیل سمجھتا ہے۔ وہ حسن کو بجائے خود اہم نہیں سمجھتا بلکہ اس کو اظہارِ حقیقت کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے اس کے نزدیک یہ افادی چیز ہے اور اس کی اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ زندگی سے ہم آہنگ ہے اور حقائق کی ترجمان۔ "ورنہ کف دریا سے زیادہ سبک" بے روح اور بے مصرف ہے۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو نوعِ انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دے اور انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر دے۔ اقبال اس نظریہ پر پوری طرح کاربند رہا ہے اور اس نے اپنے فرائض کو پوری گرمجوشی اور صناعانہ چابک دستی کے ساتھ ادا کیا ہے

اقبال شاعرِ ماضی، شاعرِ حال اور شاعرِ مستقبل تینوں حیثیتوں کا جامع ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایہ سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لئے وسعت پیدا کی یونان کے دیوتا جانس (Janus) کی طرح اس کا ایک رُخ ماضی کی طرف اور دوسرا مستقبل کی طرف ہے لیکن اس کا محور حال ہے، ایاز اور، خُم اور، ساقی اور، ابراہیم اور نمرود اور، ہر تلمیح اور ہر تشبیہ میں اس کا ذوقِ نظر کارفرما ہے۔ ہر لفظ پر اس کا اپنا نقش موجود ہے بقول شخصے کوئی تشبیہ کوئی استعارہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ، باقی نہیں جس کے اندر اقبال نے اپنا پیام نہ رکھ دیا ہو۔ پھول کی پنکھڑی میں، کانٹے میں، دریا کی روانی میں، صحرا کے بگولوں میں

پہاڑ کی بلندی میں، مے خانہ کے خُم میں، ساقی کے ساغر میں، مغنی کے ساز میں، ہوا میں، آسمان میں، غرض کائنات کے ہر ہر ذرہ میں اس کے پیام کا پرتو موجود ہے" یہی وجہ ہے کہ ان حکیمانہ اسرار کو جب وہ لالہ وگل کے پردہ میں ادا کرتا ہے تو دل و دماغ اور قلب و نگاہ سب ہی جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہی شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ الیست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

جانوروں سے دلچسپی رکھنے والا عربی کا ایک قدیم شاعر

(از ڈاکٹر فارق ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی)

میں صولی (متوفی ۳۳۵ھ) کی کتاب الاوراق کا مطالعہ کر رہا تھا کہ عباسی دور کے ایک شاعر کا ذکر آیا جس کو جانوروں سے خاص دلچسپی تھی اور جس نے ان کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا، یہ بات انوکھی معلوم ہوئی کیونکہ عربی شاعری میں اس طرز کی شاعری فن یا صنف کی حیثیت سے مجھے نظر نہ آئی تھی اور اپنی رسائی کی حد تک باوجود تلاش کے تذکروں اور ادب کی کتابوں میں ایسے شعر بہت کم ملے تھے جن میں پرندوں کی موت پر مرثیے یا موذی جانوروں کی شکایت میں دلچسپ و مزاحیہ نظمیں لکھی گئی ہوتیں۔

مجھے اس وقت ہندوستانی کا یہ طعنہ یاد آیا کہ عربی شاعری میں اونٹ کے ذکر کے سوا کیا اور یورپ کے بعض نقادوں کی یہ شکایت دل میں تازہ ہوئی کہ عربی شاعری میں یکسانیت زیادہ ہے اور زندگی و فطرت کی رنگینیاں بہت کم ہیں"۔

یہ رائے اس وقت تک جب میں معلقات اور ابوزید قرشی (متوفی ۱۷۰ھ) جمہرہ پڑھتا تھا ایک حد تک مجھے درست معلوم ہوئی تھی . . . . ایک حد تک میں نے اس لئے کہا کہ ان مجموعوں میں بھی اونٹ کے ذکر کے علاوہ اور بہت سی قدر و قیمت کی چیزیں اور زندگی و فطرت کی عکاسیاں موجود ہیں،

بہرحال مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ عربی شاعری کا دامن تنگ ہے اور اس میں زندگی کا دھارا اس شدت گہرائی اور پھیلاؤ کے ساتھ نہیں بہتا جیسا کہ بعض دوسری زبانوں میں بہتا آتا ہے لیکن مخصوص اور رائج دیوانوں کی تنگنائے سے جب قدم باہر نکلا اور لٹریچر کے د

میدانوں میں داخل ہو کر حجاز وعراق، ایران و شام، مصر و اسپین کی عربی شاعری کے نمونے دیکھے اور مشہور شعراء کی شاعری کے مرصع محلوں سے باہر جاکر گمنامی میں پڑے ہوتے شعراء سے ملاقات کی تب عربی شاعری کے نقائص کا دھندلکا آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے لگا اور زندگی و فطرت کی نیرنگیوں کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آنے لگیں۔

پھر بھی مجھے توقع نہ تھی کہ عربی شاعر کے دل میں پرندوں، پتنگوں اور بالتو جانوروں کے لئے بھی کوئی اچھی یا بڑی جگہ ہوگی اور عربی شاعری میں ان کے ترانے بھی گونجے ہوں گے لیکن صولی کی کتاب الأوراق کے قسم الشعراء کو دیکھنے کے بعد یہ امید ہو چلی ہے کہ عربی شاعری میں ابھی اور بہت سے اعجوبے چھپے ہیں اور کتاب الأوراق کی طرح جس کو مطبوعات کی دنیا میں پہلی بار آتے صرف چودہ برس ہوتے ہیں جب مصر، ترکی اور یورپ کے کتب خانوں میں روپوش بہت سے دوسرے تذکرے کھلی ہوا میں آئیں گے تو عربی شاعری کی نئی نئی طرزوں اور رنگینیوں کا پتہ چلے گا۔

یہاں میں اس شاعر کی جانوروں سے متعلق نظموں کی اقتباس کا ترجمہ پیش کروں گا جس کو پڑھ کر شاید ہندوستانی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگا اور عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو عربی شاعری کے بارے میں ایک نئی یا کم از کم خوش آیند بات معلوم ہو جائیگی۔

تھوڑا سا شاعر اور اس کے ماحول کا تعارف ضروری ہے، اس کا سن پیدائش اور وفات مجھے نہ معلوم ہو سکا، لیکن یہ دوسری و تیسری صدی ہجری کا شاعر ہے اور اپنی شاعری میں اس نے ایک جگہ ۳۷ برس کا ہونے کی تصریح کی ہے (صولی ص۱۷۰)

اس کا نام قاسم تھا یہ کوئی پیشہ ور شاعر نہ تھا بلکہ سرکاری ملازم تھا، اس کا تعلق کاتبوں کے ایک ممتاز خاندان سے تھا، کاتب اصطلاحی زبان میں محرر اور سکریٹری کو کہتے ہیں، محرر معمولی قسم کا کاتب تھا سکریٹری چوٹی کا ان دونوں کے درمیان کاتبوں کے متعدد مدارج تھا، اور ہر شعبہ حکومت کے الگ الگ کاتب ہوتے تھے مثلاً قاسم کا تعلق خط و کتابت اور محصولات کے شعبوں سے تھا۔ سب سے اہم سکریٹری دو تھے، ایک کاتب الرسائل یعنی خط کتابت کے شعبہ کا سکریٹری

اور دوسرا کاتب الخراج یعنی شعبۂ محصولات کا سکرٹیری یہ دونوں عہدے کبھی کبھی ایک شخص میں بھی جمع ہو جاتے تھے، محرر خلیفہ یا وزیر یا سکرٹیری کے ملفوظات کو تحریر کرتا تھا جیسے آج کل کے اسٹینو ہوتے ہیں، سکرٹیری کے رتبہ کا کاتب بادشاہ، وزیر یا گورنر کا عندیہ معلوم کر کے اپنے الفاظ میں لکھ کر نافذ کراتا، انکو مشورہ دیتا اور ان کا رازدار و مقرب ہوتا تھا، اس کو حکومت کی پالیسی عہدہ داروں کے عزل و نصب میں دخل ہوتا تھا، اس رتبہ کا کاتب اکثر وزیر بھی ہو جاتا تھا جیسے مشہور برمکی وزیر یحیی فضل اور جعفر تھے یا جیسا کہ خود قاسم کا بھائی أحمد تھا

یہ تو کاتب کی سیاسی حیثیت تھی، اس کی علمی حیثیت یہ تھی کہ وہ عربی ادب۔ نثر و نظم دونوں کا فاضل ہوتا، مضمون نویسی میں ماہر ہوتا، نپے تُلے، مختصر اور بلیغ الفاظ میں احکام نویسی کا سلیقہ رکھتا، اس سلیقہ کو فن توقیع کہتے تھے، یحیی برمکی وزیر کو اس میں یدطولیٰ حاصل تھا، برمکیوں کے مٹنے پر (۱۸۷ھ) ان کی توقیعات کی بڑی مانگ ہوئی اور جس طرح آجکل ٹکٹ وغیرہ جمع کرنے کا فیشن ہے جعفر کے توقیعات جمع ہونے لگے اور اس کے ہر توقیع (حکم جو سرکاری کاغذات کے نیچے مختصر الفاظ میں لکھا جاتا تھا) کی قیمت ایک دینار (تقریباً ساڑھے پانچ روپے) تک پہنچ گئی (کتاب العبر ابن خلدون ۲۰۶/۱)

یہ دونوں حیثیتیں قاسم کے باپ، دادا اور بھائی کو حاصل تھیں۔ ان کا پردادا صبیح کوفہ کے ایک عرب اُموی سکرٹیری کا قبطی (قدیم مصر کا غیر عرب باشندہ) غلام تھا، اس کا دادا قاسم یعنی صبیح کا لڑکا اس عرب کی سرپرستی میں لکھ پڑھ گیا اور بنو اُمیہ کے آخری زمانہ میں کوفہ کے دفتر میں سکرٹیری کے منصب پر فائز ہوا اس نے بڑی ترقی کی اور اموی خلیفہ ہشام کا سکرٹیری ہو گیا عباسی دور کی ابتداء میں خلیفہ منصور (۱۳۶ تا ۱۵۸) کے چچا ابن علی نے اس کو اپنا سکرٹیری مقرر کیا یہ یحیی برمکی کا بڑا دوست تھا اور مضمون نویسی میں قابل ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔

قاسم کا باپ یا صبیح کا پوتا یوسف نہایت عمدہ مضمون نویس، مقرر اور شاعر تھا، اس نے اپنے باپ کے ساتھ سرکاری دفتروں میں سکرٹیری شپ کی ٹریننگ حاصل کی تھی، خلیفہ

منصور نے تاسیس بغداد (۱۴۵ھ) سے پہلے اس کو اپنے کوفہ کے دفتر میں متوسط درجہ کی سکرٹری کا منصب عطا کیا اور اس کی تنخواہ دس درہم یومیہ (تقریباً ساڑھے پانچ روپئے) سے بڑھا کر پندرہ درہم کردی، پھر مہدی (منصور کا لڑکا اور جانشین از ۱۵۸ تا ۱۶۹ھ) کے وزیر یعقوب بن داؤد نے اسکو اپنا سکرٹیری مقرر کیا، اس کے خطوط توقیعات اشعار اور چیدہ چیدہ واقعات صولی نے لکھے ہیں، رشید کے زمانہ میں (۱۷۰ تا ۱۹۳ھ) وہ برمکی وزیر یحییٰ کے ساتھ غالباً سکرٹیری کی حیثیت سے رہا اور اس کی غیر موجودگی میں دفاتر کی نگرانی اعلیٰ (دیوان الأزمّۃ) اور سرکاری احکام نویسی (توقیع) کے اہم ترین فرائض انجام دیتا تھا، قاضی ابویوسف (شاگرد ابوحنیفہ) سے اس کی دوستی تھی۔

یوسف کے دو لڑکے بہت مشہور ہوئے، ایک قاسم (شاعر زیر بحث)، دوسرا احمد قاسم احمد سے بڑا تھا اور احمد کے بعد تک زندہ رہا، احمد آسمان کتابت میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ چمکا، بنو سہل کے بعد یہ مامون (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) کا وزیر ہوا، شاعری اور مضمون نویسی میں اس کا پایہ بہت بلند تھا، سکرٹیریوں کی ایک مجلس میں تمام پچھلے سکرٹیریوں کی ادبی قابلیت پر تبصرہ ہوا تو سب نے متفقہ طور پر رائے ظاہر کی کہ عباسی دور کے سکرٹیریوں میں مضمون نویسی کے لحاظ سے دو آدمی چوٹی کے ہیں ایک احمد بن یوسف دوسرا ابراہیم بن عباس (صولی ص۲۰) عہد عباسی کا نہایت لائق مضمون نویس اور شاعر، متعدد خلفاء کے مراسلات کے شعبوں کا صدر تھا اس کی وفات بقول مصنف اغانی ۲۰/۹، ۲۴۳ھ میں ہوئی ابوتمام کی یہ رائے اس کی شاعری پر بہترین گواہ ہے اگر ابراہیم بادشاہوں کی ملازمت کی طرف مائل نہ ہوا ہوتا تو کسی شاعر کے لئے روٹی کا سہارا نہ چھوڑتا (فہرست ابن الندیم ص۱۸۶)

قاسم کے مفصل حالات ہم کو نہیں معلوم ہیں، حکومت سے اس کی وابستگی کب تک اور کس کس نوعیت کی رہی ہم نہیں بتا سکتے غالباً یہ اپنے بھائی احمد کے ماتحت سرکاری مناصب پر سرفراز رہا ہوگا، صولی نے اس کے ایک منصب کی تصریح کی ہے وہ لکھتا ہے کہ جب مامون نے احمد کو وزیر مقرر کیا تو احمد نے صوبہ سواد کی تحصیل لگان قاسم کے سپرد کردی اور قاسم نے اپنے

پر مشتمل موذی جانوروں کی شکایت میں ہیں جیسے مچھر، پسو، کھٹمل، چیونٹی، چوہا وغیرہ اور چار نظمیں ایک سو ترپن اشعار پر مشتمل، قمری، شاہ رخ (باز یا اُس جیسا شکاری پرندہ) بلی اور بکری کے لمبے مرثیے ہیں ان سارے اشعار کا ترجمہ نہ تو یہاں مناسب ہوگا نہ قارئین کے لئے دلچسپ اس لئے ہر نظم کے چیدہ چیدہ حصے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

میرے پیش نظر کتاب الاوراق کا پہلا اڈیشن ہے جو ایک علم دوست انگریز نے پروفیسر گب، ڈاکٹر طٰہٰ حسین وغیرہ کی تلقین و مدد سے چھاپا ہے اس میں شک نہیں کہ اڈیٹر نے بڑی محنت و قابلیت سے کام کیا ہے پھر بھی کتاب اور خاص طور پر اس کے شعری حصے ابھی تہذیب و تصحیح کے محتاج ہیں، میں نے اپنی بے مائگی کے باوجود ترجمہ کرتے وقت کہیں کہیں لفظی تصرف کرنے کی جرأت کی ہے۔

بکری (سوداء) کا مرثیہ

۱:اے آنکھ ہماری بکری سوداء پر خوب رو جو سونلی دلھن کی طرح تھی رخصت کے دن۔

۲۔اس کے دو پتلے باریک سینگ تھے اور دو تھن بھرے ہوئے ڈولوں کی طرح

۴۔اس کی گردن اور آنکھیں نوجوان وحشی ہرنیوں کی طرح تھیں۔

۵۔اس کے کان لمبے تھے، چہرہ بیضادی اور دانت مسکراتے وقت چمکتے تھے۔

۶، ۷، ۸۔ان تین شعروں میں اس کی مزید جسمانی خوبصورتی بیان کی گئی ہے۔

۱۰۔آپ چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھی جس کی خدمت کے لئے انائیں اور خدمتگار مامور تھے۔

۱۱۔اس جیسی کہاں ہو سکتی ہے وہ تو بادشاہوں اور وزیروں کی بہترین دودھ دینے والی بکریوں میں سے چنی گئی تھی۔

۱۴۔اس کی غذا کھجور کی گٹھلیاں، کھلی، ٹکڑے، عمدہ روٹی اور حلوا تھی۔

۱۵۔گرمی میں ٹھنڈے پانی کے مزے اڑاتی۔ سردی میں آگ سے تاپتی۔

۱۶۔ ہم نے اس کے لئے جھولداریاں لگادی تھیں اور اس کی دیکھ بھال کے لئے لونڈیاں اور آزاد عورتیں مقرر کردی تھیں۔

۱۷۔ وہ سب اس پر مہربان تھیں اور محبت سے ماں باپ اس پر صدقہ قربان کرتی تھیں۔

۱۸، ۱۹، ۲۰۔ ان تین شعروں میں اس کی پاکبازی اور شرم وحیا کی تعریف ہے۔

۲۱۔ اس کو اونی جھول اڑھائی جاتی، اور اُس کے گلے میں تعویذ باندھ دیا گیا تھا تاکہ دشمنوں کی نظر نہ ہو جاتے۔

۲۲۔ لیکن اس کے بچاؤ کی کوئی تدبیر کام نہ آئی جب اس کی موت کا حادثہ ہمارے اوپر نازل ہوا۔

۲۳۔ وہ تو قبر کی مٹی میں مل گئی لیکن اس کی تعریف زندہ ہے۔

۲۴۔ میں سوداء کی خوبیاں نہیں بھول سکتا جب تک زمین پر بادل برستے رہیں گے۔

۲۶۔ مجھے سوداء پر صبر آجائے یہ ممکن نہیں، سوداء نے صبر مجھ سے چھین لیا۔

۲۷۔ وہ عربی نسل کی تھی، حسب نسب میں عمدہ، اور خلفاء کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

۲۸۔ گرمی میں اور سخت سردی میں جب آندھیاں چلتیں وہ نہایت اچھی ماں ثابت ہوتی

۳۰۔ وہ بغیر کسی دقت کے صرف تھنوں پر ہاتھ پھیرنے سے دودھ دے دیتی تھی۔

۳۱۔ وہ صبح شام دو برتن دودھ سے بھر دیتی تھی۔

۳۴۔ کتنے دنوں سوداء نے صبح شام اور دوپہر پیالے بھر بھر کر ہمیں دودھ پلایا ہے۔

۳۵۔ کس قدر ہم نے اس کا خالص اور بلویا ہوا دودھ اور اس کے دودھ کا شربت پیا ہے

۳۸، ۳۹۔ اے سوداء تو نے اپنے چھوٹے بکروں اور دودھ پیتی بکریوں کا (جو خوب دودھ پی کر اور اچھی غذا کھا کر موٹی تازی ہو گئی تھیں) قلیہ اور بھنا ہوا گوشت کس قدر ہم کو کھلایا ہے۔

۴۲۔ تو زندہ بادل تھی، تو بہار تھی، تو عمدہ تعریف کی مستحق ہے۔

۴۳۔ اگر زندہ زرِ مخلصی دے کر مردہ کو بچا سکتا تو ہم تجھ کو بچا لیتے چاہے ہم کو کتنا ہی خرچ کرنا پڑتا

۴۴۔ اے سوداء تو بہت اچھی تھی کاش تو زندہ رہتی۔

۲۔ چھوٹے کیڑوں کی شکایت۔ کھٹمل، مچھر اور پسّو

۱۔ ہم چھوٹے کیڑوں کی (کھٹمل) مصیبت میں مبتلا ہوئے جو نہایت بدذات کیڑے ہیں۔
۲۔ جو بھاگتے پھرتے ہیں، کثرت سے ہیں، بے قرار ہیں اور بے قرار رکھتے ہیں۔
۳۔ جو لوگوں کا خون بہاتے اور پیتے ہیں۔
۴۔ جو ہمارے ساتھ بستر اور کپڑوں میں رہتے ہیں اور ہمارے اوپر کودتے پھرتے ہیں۔
۵۔ ہم میں سے کوئی بے چین ہو کر کھجلاتا ہے، کوئی کپڑوں میں ان کو تلاش کرتا ہے۔
۶۔ اور کنیزیں سامان جھاڑتی ہیں۔
۷۔ یہ موذی ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، جسم پر خراش ڈالتے ہیں، یہ شکاری ہیں، قاتل ہیں،
۸۔ انگلی اور کپڑے ان کے خون سے رنگ جاتے ہیں۔
۹۔ پھر یہ خون کے دھبے دھونوں کے دھوئے نہیں چھوٹتے۔
۱۰۔ ہمارے اوپر چھوٹے کیڑوں کی (مچھر) مصیبت نازل ہوئی جو اُڑتے اور نیچے اُترتے
۱۱۔ جو زخمی کرتے ہیں، جسم میں گھُس جاتے ہیں، جو خود جاگتے اور دوسروں کو جگاتے ہیں
۱۲۔ جو سونے کے وقت جگانے کی بانسری بجاتے ہیں۔
۱۳، ۱۴۔ جو لمبی زخمی کرنے والی لٹکتی ہوئی سونڈوں سے خون پینے نیچے اُترتے ہیں۔
۱۵۔ اُن سونڈوں کا بھالا بہادر سپاہی کے بھالے سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔
۱۶۔ ان کی وجہ سے جسم پہ بہت سے بدنما داغ پڑ گئے ہیں۔
۱۸۔ جس کے یہ کاٹتے ہیں وہ ان سے بدلہ لینے کے لئے خوب منہ پر طمانچے مارتا ہے۔
۱۹۔ اور کہیں ہزار میں ایک اس کے ہاتھ آتا ہے۔
۲۱، ۲۲۔ اور ہم پسوؤں کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ جو جسموں میں چمٹے رہتے ہیں۔
۲۳۔ اور وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں چھونے والے کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔
۲۴۔ نہیں بلکہ وہ تو آنکھ تک سے نظر نہیں آتے۔

۳۔ بلّی کا مرثیہ

۵۔ وہ تیندوؤں کی طرح جھپٹ کر یا زمین سے جمپٹ کر شکار کرتی تھی۔

۶۔ وہ جب گھات میں ہوتی تھی، چوہے سہمے ہوئے بل میں دُبکے رہتے تھے۔

۷۔ اگر کوئی چوہا ذرا سر نکال دیتا تو پھر وہ بل میں واپس نہ جا سکتا تھا۔

۸۔ گویا موت اس کے ہاتھ میں ہوئی تھی جب وہ اس کی (چوہے) طرف بڑھتی تھی۔

۹۔ گویا وہ تیندوے کی طرح پیٹ کے بل رینگتی اور ناگن کی طرح تیزی سے بل کھاتی بھاگتی

۱۲۔ گھر کی محافظ تھی حریف اگر پیچھا کرتا تو جوابی حملہ کرکے اس کو بھگا دیتی۔

۱۳۔ چھتوں پر جا کر رویا کرتی تھی جیسے اس کا کوئی عزیز جاتا رہا ہو۔

۱۴۔ جب رات کو گھر کے سب لوگ سو جاتے وہ جاگتی تھی۔

۱۸۔ کھانے کے وقت وہ موجود ہو جاتی اور دسترخوان کے ٹکڑے اس کو ڈال دیتے جاتے۔

۱۹۔ کڑاکے کی ٹھنڈی راتوں میں وہ نماز کے وقت ہمارے پاس آتی تھی۔

۲۰۔ ہم اس کی صحبت سے خوش تھے وہ ہماری صحبت سے۔

۲۱۔ پھر ہلاکت کا ایک ایسا حادثہ نازل ہوا کہ وہ خاک میں مل گئی۔

۲۲۔ اور چوہے گھر میں بے خوف ہو کر آنے جانے لگے۔

۲۳۔ ہماری دیواریں کھود کر برباد کرنے لگے اور ہمارے کپڑے خوب کاٹ کاٹ کر ناس لگانے لگے

۲۴۔ جب لوگ سو جاتے ہیں تو خورد و نوش کے ذخیروں میں سے کھا جاتے ہیں۔

۲۵۔ روٹی کے ٹکڑے، بچا ہوا ستو اور پنیر کے ٹکڑے تک نہیں چھوڑتے۔

۲۶۔ اور بڑی چالبازی سے اپنی دُمیں شیشیوں میں ڈال کر تیل پی جاتے ہیں۔

۲۷۔ ہمارے چراغوں کا تیل سرکش ڈاکوؤں کی طرح چرا لیتے ہیں۔

۲۸۔ چھتوں میں اس طرح دوڑتے پھرتے ہیں جیسے عمدہ گھوڑے دوڑ کے میدان میں مقابلہ کرتے ہوں۔

۴۔ چیونٹیوں، چوہوں اور چڑیوں کی شکایت

۱۔ گھر کی رونق رینگنے والوں اور اُڑنے والوں سے تباہ ہو گئی ہے۔

۲۔ ہماری کچھ بُری پڑوسنیں ہیں جو اپنے پڑوسیوں کو ستاتی ہیں۔

۳۔ جو کھیتی تو نہیں کرتیں لیکن زمین جوتتی ہیں جب ان کے لشکر نکلتے ہیں۔

۴۔ اُن فوجی دستوں کی طرح منظم جو حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے جاتے ہیں۔

۱۲۔ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح ان کی باڑیں سوراخوں سے باہر نکلی چلی آتی ہیں۔

۱۴۔ ہماری کچھ اور پڑوسنیں ہیں جن کی پاکباز بڑی بدکار ہیں۔

۱۵۔ جو بہت مفلس ہیں، خدا نہ کرے ان کی مفلسی کبھی دور ہو۔

۱۶۔ جو فاسق ہیں، چور ہیں، نقب زن ہیں۔

۱۸۔ جو گھر والوں کا کھانا کھا جاتے ہیں ان میں اوپر سے اتر کر یا نیچے سے آکر۔

۱۹۔ اور ہمارے پڑوسیوں میں سانپ ہیں جو مارنے والوں پر حملہ کرتے ہیں۔

۲۰۔ جو رسی کی طرح کھل جاتے ہیں اور ڈھال کی طرح گول ہو جاتے ہیں۔

۲۲۔ جو پانچ پانچ ہاتھ اور دس دس بالشت لمبے ہیں۔

۲۴۔ رہے پرند تو چڑیاں ان سب میں بدذات ہیں۔

۲۵۔ گویا لوہار کے ہتوڑے ان کی چونچوں میں بھرے ہیں۔

۲۷، ۲۸۔ ان کے پڑوس میں خُطّاف، زُرزر اور فاختائیں آباد ہیں جن سے کبھی وہ ما
ہو جاتی ہیں کبھی انجان بن جاتی ہیں۔

۳۰۔ یہ مختلف قسم کے باہم مانوس و غیر مانوس پرندے تنکے اور انڈے گراتے رہتے ہ

۳۱۔ اور ہمارا گھر پروں سے بھر جاتا ہے، خدا ان کا ناس کرے۔

۳۲۔ اور ایک شخص ہر وقت جھاڑو لئے صفائی کے لئے موجود رہتا ہے۔

۵۔ شاہ رُخ کا مرثیہ

۱۔۱ے ابو سَعد (شاہ رُخ کی کُنیت جو خطاب احترام ہے) تیری موت سے گھر اور میدان

۲۔ قسمت نے تیری موت کا ہمیں داغ دیا اور یہ ہمارے بہترین عزیزوں پر بھی ہاتھ ڈالتی ہے۔
۳۔ ہماری فکر و احتیاط اس کو نہیں ٹال سکتے۔
۴۔ زمانہ نے تجھ کو ہم سے چھٹا کر مصیبت میں ڈال دیا اور زمانہ کا کام یہی ہے
۵۔ زمانہ نے ہم پر ظلم کیا اور ہم اس سے انتقام نہیں لے سکتے۔
۶۔ تیرے بعد غم کے جھکوں سے دلوں میں زخم پڑ گئے۔
۸۔ تیری موت کے دن گھر والے اور پڑوسی سب روتے۔
۹۔ تیرے بعد ان کا ستون قوت ٹوٹ گیا۔
۱۰، ۱۱۔ دشمن، بدبودار کیڑے، سانپ اور چوہے گھر میں آزاد ہو کر حملے کرنے اور بربادی پھیلانے لگے۔
۱۲۔ جب تک تو تھا یہ ذلیل تھے اور ان کی دال نہ گلتی تھی۔
۱۴۔ اے ابو سعد خدا کرے تیری قبر پر خوب بارش ہو۔
۱۵۔ تو ادھیڑ تھا، منکسر مزاج، باادب، باوقار۔
۱۶۔ جب شکار تیری رسائی میں آجاتا تو پھرتی سے تو پکڑ لیتا تھا۔
۱۷۔ اور اگر بھاگ کر پکڑنا ممکن نہ ہوتا تو گھات اور دھوکہ سے کام نکالتا۔
۱۸۔ چھپ کر یا سوراخ میں بھاگ کر تجھ سے کسی کا جان بچانا ممکن نہ تھا۔
۱۹۔ ہر دن تو دشمنوں پر چھاپے مارتا اور حملے کرتا تھا۔
۲۰، ۲۱۔ اگر اپنے حریف سے اس کو لڑنا پڑتا تو شیر بیشہ کی طرح اس کو دبا کر غلبہ پا لیتا تھا
۲۲، ۲۳۔ رات میں بہت کم سوتا، لمبے لمبے ڈگ بڑھا کر چلتا رہتا، خوب چوکنا اور مستعد رہتا
۲۸۔ پرندوں کا بادشاہ تھا، ان میں اس کو بڑا مرتبہ اور عزت حاصل تھی۔
۳۰۔ اس کا رنگ سفید زردی مائل تھا۔
۳۱۔ اس کی چونچ اور پنڈلیاں زرد و گلابی تھیں۔

۳۲۔اس کا سر گولائی لئے ہوئے تھا اور پیر کشادہ تھے۔

۶۔قمری کا مرثیہ

۱۔کیا کسی کو اس زمانہ کے حادثوں سے امان ہے؟

۲۔شب و روز ہر نئے کو پرانا کرتے ہیں اور خود پرانے نہیں ہوتے۔

۷،۸،۹۔قمری سترہ برس تک ہمارے شریف ترین ساتھیوں اور مخلص ترین دوستوں میں سے تھی

۱۰۔پھر زمانہ کے ایک حادثہ نے اچانک اس کو غارت کر دیا۔

۱۱۔قمری کفن میں لپٹی ہوئی قبر کی مٹی ہو گئی۔

۱۲۔آبادی کے ایک سنسان گھر میں رہنے لگی۔

۱۳۔دل اس کی موت کی شدت سے زخمی ہو گئے۔

۱۴۔جگر میں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح غم کے چرکے لگنے لگے۔

۱۵۔آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بند نہیں ہوتی۔

۱۶۔قمری سے گھر والوں اور پڑوسیوں کو بڑا اُنس تھا

۱۸۔۱۹۔وہ بڑی خوش مزاج اور خندہ رو تھی، جب کوئی اس کے پاس آکر آنکھ یا انگلی سے اشارہ کرتا تو جواب دیتی تھی۔

۲۰۔رات میں چہکتی اور اذان دیتی تھی۔

۲۱۔اور خوب صاف صاف او دو ستو! او دو ستو! کہتی تھی۔

۲۲۔بہت دن تک مَعْبد، ابن سُرَیج، اور غَرِیض (پہلی صدی ہجری کے تین مشہور گوّیے) کی لَے میں گانے سُنا کر مجھے وجد میں لاتی رہی۔

۲۹۔اس کی آنکھیں یاقوت کی طرح سُرخ تھیں؛ ۳۰۔اس کے پیر جیسے سرخ نیلے رنگے تھے

۳۱۔اس کا سر جیسے بانس کی شاخ پر نصب تھا (یعنی اس کی گردن لمبی اور خوبصورت تھی)

۳۲۔اس کا رنگ جنت کے لباس کی طرح سبز تھا؛ ۳۷۔افسوس تیرا ثانی یا تجھ سے ملتا جلتا نہیں مل سکتا

۳۸۔تجھ جیسا کھیل تماشہ والا کبھی پیدا نہ ہوا ہوگا۔

چین کے مسلمان

ڈاکٹر یوسف شخت کے قلم سے

مترجمہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب باقی غازی پوری لکچرر عربی کلکتہ یونیورسٹی

تمام مسلمان چین کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُس حدیث سے جانتے ہیں جو کہتی ہے کہ "علم کو طلب کرو اگرچہ وہ چین میں ہو"

اسلام سے پہلے ہی چین کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قایم ہو چکے تھے اور وہ لوگ کسی قدر اُس ملک سے واقف ہو چکے تھے پہلی صدی ہجری میں یہ تجارت بہت ترقی کر گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ظہور اسلام کے ساتھ چین میں خاندان تانگ (T.ang) کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آئی۔ چین کی سرکاری تاریخ میں سب سے پہلی بار عربوں اور مسلمانوں کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"خاندان تانگ کی حکمرانی کے ابتدائی عہد میں مملکت مدینہ، سے غیر ملکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کینٹن میں آئی۔ وہ لوگ آسمانوں کے پروردگار کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کی عبادت گاہوں میں بت اور تصویریں نہیں پائی جاتی ہیں اور وہ لوگ نہ سور کا گوشت کھاتے ہیں اور نہ شراب پیتے ہیں اور جن جانوروں کو خود ذبح نہیں کرتے اُن کے گوشت کو حلال نہیں سمجھتے انھوں نے کینٹن میں خوبصورت اور عظیم الشان مکان تعمیر کئے ہیں۔ اور فغفور چین نے اُن کی استدعا پر ان کو وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے وہ لوگ خوش حال اور دولتمند ہیں اور خود اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا سردار منتخب کر لیتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں"

جینیوں اور عربوں کے درمیان تبادل سیاسی | چین کے بادشاہ مغرب میں حکومتِ عربیہ کی بڑھتی ہوئی طاقت

کو بہت غور و توجہ سے دیکھتے رہے اور جب فیروز بن یزدجرد نے اُن سے عربوں کے مقابلے میں جنگی مدد طلب کی تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ رد کر دیا بلکہ اُس کے برعکس خلیفہ عثمان بن عفان کے پاس اپنا ایک سفیر بھیجا جس کے جواب میں حضرت عثمان بن عفان نے بھی اپنی فوج کے ایک کمانڈر کو ۳۱ھ میں چین بھیجا یہ تبادلِ سیاسی دوسری بار ۹۷ھ میں ہوا جب کہ قتیبہ بن مسلم نے بعض ایلچیوں کو چین کے شاہی دربار میں بھیجا اور اُس کے بعد کے پینتالیس برسوں میں کم سے کم اُنیس سیاسی مشن چین میں بھیجے گئے۔ خلفائے عباسیہ (جن کو چینی سیاہ پوش عرب کہتے تھے) میں سے ابوالعباس، ابوجعفر، اور ہارون الرشید نے جو سفارتی وفود وہاں بھیجے تھے وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ہارون الرشید کے سفیروں نے حکومت چین سے ایک جنگی معاہدہ بھی کیا تھا اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہو گئے تھے

چین کی اُن تاریخی کتابوں سے جو اُس عہد میں لکھی گئیں اُس ملک میں عرب کے مسلمانوں کے ورود کی بعض دوسری تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن میں درج ہے کہ :-

"مغرب سے آنے والے غیر ملکی بڑی بڑی جماعتوں کی شکل میں چین میں پہنچے اور اپنے ساتھ اپنی مقدس کتابیں بھی لائے جن کو چین کے شاہی محل کے اُس ہال میں جو کتب مقدسہ کے لئے مخصوص ہے ایک خاص جگہ دی گئی اور اس وقت سے ان کا دین (اسلام) مملکت تانگ میں پھیلنے لگا اور لوگ علانیہ فرائض دین ادا کرنے لگے"

مسلم تجار چین میں | مسلمانوں میں سے جو لوگ سب سے پہلے چین میں جا کر مقیم ہوئے وہ تجار تھے جن میں سے اکثر سمندر کے راستے سے ابلہ اور سیراف دو عراقی بندرگاہوں سے وہاں گئے تھے اور شہر کنٹین، جس کو عرب خانفو کہتے تھے چین میں ان کا پہلا مرکز تھا۔ دوسرا راستہ جس سے مسلم تجار چین میں پہنچے تھے، خشکی کا تھا جو وسط ایشیا کو چیرتا ہوا جاتا ہے۔ وہ مسلمان جو اس راستے سے گئے سی نان فو (Si-nan-fu) تک پہنچ گئے جو اس وقت چین کا دار السلطنت تھا اور عرب اس کو خمدان کہتے تھے۔ اور یہ اسلام کا دوسرا قدیم مرکز چین میں تھا۔ سلیمان تاجر نے ۲۳۷ھ

میں اُن تاجروں کی دوکانوں اور مسجدوں کے صحیح حالات لکھے ہیں اور اس کے معاصر ابو زید سیرانی نے لکھا ہے کہ شاہ چین نے ایک مسلمان قاضی مقرر کر دیا تھا جو مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کرتا تھا اور نمازوں میں ان کی امامت بھی۔ اس کے فیصلے عام طور پر خوشی کے ساتھ تسلیم کئے جاتے تھے۔

عالمِ اسلامی اور حکومت چین کے درمیان جو تعلقات تھے وہ اگرچہ خاندان تانگ کی حکومت کے زوال کے بعد کچھ عرصے کے لئے کسی قدر کمزور ہو گئے تھے لیکن وہ کبھی منقطع نہیں ہوئے تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان سونگ (جو خاندان تانگ کا جانشین ہوا) کی حکومت کے زمانے میں عربوں نے تقریباً بیس سفارتی مشن چین میں بھیجے۔ اُس عہد میں شہر کینٹن کی اہمیت ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے کم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک دوسرے شہر نے لے لی تھی جس کے لئے ابو الفدا نے اس کا چینی نام شنجو (Shenchow) استعمال کیا ہے اور اکثر عرب جغرافیین اور سیاحین نے اُس کو زیتون کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابن بطوطہ چین میں | شہر زیتون ہی میں عرب سیاح ابن بطوطہ کے قدم پہلی بار سرزمین چین پر پڑے ابن بطوطہ قدیم شہر کینٹن میں بھی گیا اور اس کو اس نے صین الصین کے نام سے ذکر کیا ہے، وہ پیکنگ (یا خان بالق) بھی گیا۔ اور جہاں بھی وہ گیا وہاں اُس نے بہت ترقی یافتہ اسلامی جماعتوں کو پایا اور چینی مسلمانوں اور چینی حکام دونوں نے یکساں طور پر اس کا خیر مقدم اور اس کی عزت و تکریم کی وہ لکھتا ہے کہ:-

"اور چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا ایک شہر ہے جس میں صرف وہی آباد ہیں اور وہاں اُن کی مسجدیں ہیں جن میں جمعہ وغیرہ کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ اُن لوگوں کی وہاں تعظیم و توقیر کی جاتی ہے۔ چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا ایک شیخ الاسلام ضرور ہوتا ہے جس کے پاس مسلمانوں کے تمام معاملات جاتے ہیں اور ایک قاضی بھی ہوتا ہے۔ جو ان کے مقدمات کے فیصلے کرتا ہے۔"

وہ پھر لکھتا ہے کہ:-

"ملک چین تمام ملکوں سے زیادہ پُر امن ہے اور مسافر کے لئے تمام ملکوں سے اچھا۔"

ابن بطوطہ نے وہاں جن معززین، علما اور تجار سے ملاقاتیں کیں اُن کے ناموں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں جیسا کہ ہم نے اور ماخذوں سے بھی نکالا ہے کہ اس وقت چینی مسلمانوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خالص عالمِ اسلامی سے وہاں گئے تھے۔ مشرق میں ایران سے لے کر مغرب میں اندلس تک کے لوگ وہاں موجود تھے۔

اوپر دو انتقالاتِ مکانی کا ذکر ہو چکا ہے یعنی ایک وہ جو سمندر کے راستے سے ساحلِ چین تک تھا اور دوسرا وہ جو خشکی کے راستے سے چین کے شمال مغرب تک۔ ساتویں صدی ہجری میں ان دونوں کے ساتھ ایک تیسرے انتقالِ مکانی کا ظہور ہوا جس میں چین کو جانے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی اور یہ تیسرا انتقالِ مکانی بھی خشکی ہی کے راستے سے تھا لیکن اس کا رُخ چین کے جنوب مغرب کی طرف صوبہ یونان تک تھا۔ ابن بطوطہ ان اطراف میں نہیں گیا اور اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی اس اہم وطن سازی کا ذکر نہیں کیا۔

مسلمانوں اور چینیوں کا تعاون

مسلمانوں اور چینیوں کے مادی اور تجارتی مفاد کے مشترک ہو جانے کے بعد صوبہ یونان ہی میں وہ پہلی بنیاد بھی ڈالی گئی جس پر مسلمانوں اور چینیوں کے دوستانہ تعاون کی عمارت تعمیر کی گئی۔ اس تعاون کی سب سے اچھی مثال شمس الدین عمر بخاری معروف بہ سید اجل ہیں جو ۶۷۲ھ سے ۶۸۰ھ تک صوبہ یونان کی گورنری کے عہدے پر فائز رہے اور آبپاشی کے اہم ذرائع کے پیدا کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس سلسلے میں دریاؤں میں پشتے باندھے اور نہریں نکالیں اُن کی وفات کے بعد وہاں ان کی یادگار میں ایک ہال بنایا گیا اور اُس میں اُن کی مدح وثنا تحریر کی گئی۔ یہ ہال اب تک موجود ہے اور یہ چینیوں کے اس مشہور طرزِ عمل کی ایک دلیلِ قاطع ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے اچھے کاموں کی بڑی قدردانی کرتے ہیں۔ اور چین کی سرکاری تاریخوں میں اُن کی سیرت دوسرے عمالِ حکومت کی سیرتوں کے ساتھ متعدد بار، اور آخری بار ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی۔

شمس الدین نے مرنے کے بعد پانچ بیٹے اور انیس پوتے چھوڑے اور وہ سب مناصب

جلیلہ پر فائز ہوئے اور اُن کے دو بیٹے ناصر الدین اور حسین بھی اُن کی طرح صوبہ یونان کے گورنر ہوئے اور ناصر الدین نے اُس صوبے میں اسلام کی ترقی کے لئے بہت کوششیں کیں۔

سید اجل کی بندرہویں پشت میں وہ عالم یختاناجو گذرے ہیں جنہوں نے ۱۰۹۵ھ میں اپنی مشہور کتاب مقناطیس الاسلام تصنیف کی جس میں انھوں نے اسلامی اور چینی اخلاق میں موافقت ومطابقت کی شرح کی ہے۔

مسلمانوں کے چین میں جاکر آباد ہونے کی تحریک جو نویں صدی ہجری میں بہت ہی قوی ہوگئی تھی اور سید اجل جس کے سب سے بڑے اور ممتاز داعی تھے، اس وقت ختم ہوگئی جب مسلمانوں نے چین کو اپنا وطن بنا لیا لیکن پھر بھی عالم اسلامی اور چین کے درمیان تعلقات برابر قائم رہے اور اسلام چین میں برابر بڑی وسعت کے ساتھ پھیلتا رہا نویں اور دسویں صدی ہجری کی کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے متعدد تجارتی مشن چین میں گئے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے وہاں خاندان مینگ کی حکومت کے عہد میں، ۷۶۹ھ سے ۱۰۵۰ھ کے درمیان بہت بڑی تعداد میں مسجدیں بنائیں۔ خاندان مینگ کی سرکاری کتب جغرافیہ میں ممالک عربیہ کا عموماً اور مکہ ومدینہ کا خصوصاً ذکر پایا جاتا ہے۔ اُس خاندان کے حکمرانوں نے اُن مسلمان بادشاہوں کے ساتھ جو چین کی مغربی سرحدوں پر تھے دوستانہ سفارتی تعلقات قایم کئے۔

چین کے مسلمانوں کی موجودہ تعداد کا سبب یہ نہیں ہوسکتا کہ غیر ملکی مسلمانوں نے اس کو اپنا وطن بنا لیا تھا نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان وطن بنانے والوں کی اولاد بڑھ کر اتنی تعداد میں ہوگئی کیونکہ اُن کی تعداد (جو اصلی چین میں دس ملین سے کم نہیں ہے) مملکت مصر کے باشندوں کی تعداد کی دو تہائی کے قریب ہے اور مملکت عربیہ سعودیہ کے باشندوں کی تعداد کی دگنی اور عراق، شام اور لبنان کے باشندوں کی تعداد کی تگنی۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی ہجری سے اب تک چینیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا اور یہ سبب ہے ان کی موجودہ تعداد کا دراس وقت مسلمانانِ چین میں خالص چینیوں کی اکثریت ہے۔ اور کسی چینی کو ۸۵۹ھ سے پہلے

یہ موقع نہیں ملا کہ وہ شیخ الاسلام کے منصب جلیل پر فائز ہو اور چینی حکام نے کبھی اسلام کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

اب تک ہم نے عالم اسلامی اور حکومت چین کے تعلقات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ آ ہم مسلمانوں اور چینیوں کے روحانی تعلقات کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جو دل خوش کن حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے اخلاق فاضلہ اور چینی حکیم کنفوسیوس کی تعلیم میں پورے طور پر موافقت و مطابقت ہے اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلا اور فلسفۂ چین کے درمیان اُن تمام امور میں جو دنیاوی زندگی سے متعلق ہیں پورا اتفاق ہے۔ ا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر چین کے مسلم علماء پورے وثوق کے ساتھ قایم ہیں۔ اور چینی علما نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اس کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ ۱۸۱۱ء میں شہر سی نان فو میں ایک مسجد کی از سر نو تعمیر کے موقع پر سرکاری طور پر پتھر پر ایک تحریر کندہ کی گئی تھی جو حسب ذیل ہے :—

"حکیم مذہب محمدؐ، حکیم چین کونفوسیوس کے بہت دنوں کے بعد جزیرۃ العرب میں پیدا ہوئے وہ دونوں اپنے مذاہب اور تعلیمات میں ایک دوسرے سے متفق ہیں باوجودیکہ ان دونوں کے زمانوں اور ملکوں میں بہت بعد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کے پاس ایک ہی ضمیر تھا اور ایک ہی حقیقت، بڑے بڑے اخلاقی مسائل ہوں یا روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے چھوٹے چھوٹے امور، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو بیک وقت احکام عقلیہ اور تعلیمات محمدیہ کے تحت میں نہ آتے ہوں۔ وہ دونوں خالق جل وعلا کے احترام کو واجب قرار دیتے ہیں اور یہ تعلیمات اگرچہ اپنے دقائق اور تفصیلات میں متعدد ہیں مگر وہ سب ایک ہی بلند مقصد کی طرف لوگوں کو بلاتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔"[1]

اور پھر اس اتحاد و اتفاق کا نتیجہ عملی زندگی کے میدان میں دیکھتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف چینی اپنی مشہور روایات کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں اور دو

---

[1] فاضل مقالہ نگار نے اس تاریخی کتبے کی عکسی تصویر اس مقالے کے آخر میں چھاپ دی ہے۔

طرف چین کے مسلمان اپنے وطن کے ساتھ پورا اخلاص رکھتے ہیں اور اس کے وفادار ہیں۔

اوپر کے بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ کس طرح چینیوں نے اُن مسلمانوں کو جو آٹھویں صدی ہجری تک عالم اسلامی سے وہاں بسنے اور آباد ہونے کو جاتے تھے، اس کی اجازت دی کہ وہاں اپنی مسجدیں اور مدرسے بنائیں اور اپنے قاضی اور مفتی مقرر کریں اور اپنے معاملات کا خود شیخ الاسلام کی سرداری کے ماتحت انتظام کریں۔ اس سے زیادہ اہم اور عظیم الشان ایک چیز اور ہے اور وہ یہ کہ چینی حکام نے ہمیشہ مذہبی آزادی کے اصول کو قایم رکھا اور مسلمانوں کی حمایت آٹھویں صدی ہجری کے بعد تک کرتے رہے جبکہ خالص چینیوں کی ایک بڑی تعداد اسلام قبول کرنے اور اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگی۔ اور خاندان مینگ (جو ۷۶۹ھ سے ۱۰۵۹ھ تک چین پر حکمراں رہا) کے بانی نے مسلمانوں کو بہت سے حقوق اور رعایتیں دیں جن سے وہ برابر مستفید ہوتے رہے اور اسلام اس خاندان کی حکمرانی کے عہد میں خوب پھولتا پھلتا رہا جیسا کہ اس زمانے کی کثیر التعداد مساجد کی تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۷۳۱ھ میں فغفور چین نے ایک شاہی فرمان جاری کیا تھا جس میں اس نے یہ حکم دیا تھا کہ اسلام کو سرکاری طور پر "الدین الحق الحنیف" (سچا اور سیدھا دین) کے نام سے یاد کیا جائے۔ اور وہاں آج بھی اسلام کا یہی نام ہے۔

اور ۸۲۳ھ میں فغفور چین نے شہر سی نان فو اور شہر نانکنگ میں مسجدوں کے بنائے جانے کا حکم دیا تھا اور یہ دونوں شہر صوبوں کے دارالسلطنت تھے۔ اور ۹۰۰ھ سے کچھ پہلے ایک مسلمان تاجر سید علی اکبر نے چند سال شہر پیکن میں گذارے۔ وہ وہاں اس وقت مسلمانوں کی بڑی تعداد بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں مسلمانوں پر ٹیکس نہیں لگائے جاتے اور نہ مال درآمد پر اُن سے محصول لیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے فغفور چین سے زمینداریاں اور دوسرے بہت سے عطیات حاصل کیے ہیں اور مذہب کے معاملے میں انھیں پوری آزادی حاصل ہے اور اُن سے مکمل رواداری برتی جاتی ہے اور اُن کے مذہب کو چینی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اور اسلام کے قبول کرنے میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل ہے اور اس میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے پیکن میں چار بڑی بڑی مسجدیں اور دوسرے صوبوں میں تقریباً نوے مسجدیں دیکھیں اور یہ سب مسجدیں فغفور چین نے اپنے خرچ سے تعمیر کرائی تھیں۔

شاہی فرمانوں میں سے ایک فرمان کی عبارت، جس کو خاندان مینگ کے بانی نے اس بارے میں جاری کیا تھا، اپنی اصلی صورت میں پتھر کی ایک تختی پر کندہ کی ہوئی اب تک محفوظ ہے۔ اس نے اس میں حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو مقررہ عطیات دئے جائیں۔

"اور دو سمتوں میں دو مسجدیں بنائی جائیں اور جب ان کی مسجدیں شکستہ ہو جائیں تو انھیں ان کی مرمت کی اجازت، اور تمام صوبوں اور ضلعوں میں آمد و رفت اور تجارت کی آزادی دی جائے اور چنگی گھروں میں اور گھاٹوں پر انھیں بلا روک ٹوک کے جانے کی اجازت دی جائے۔"

چین کے مسلمانوں کے تعلقات وہاں کی اکثریت اور حکام کے ساتھ، خاندان مینگ کی حکمرانی کے پورے عہد میں، اعتماد و مودت کی بنیادوں پر قائم رہے اور خاندان مانچو (جو خاندان مینگ کا جانشین ہوا) کے زمانۂ حکومت میں بھی منقطع نہیں ہوا جیسا کہ اس فرمان شاہی سے جس کو فغفور چین نے ۱۷۳۱ء میں جاری کیا تھا، معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرمان حسب ذیل ہے:—

"ملک کے ہر حصے میں کئی صدی سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو میری پیاری قوم کا ایک جز ہیں میں ان کو اسی طرح اپنی اولاد سمجھتا ہوں جس طرح دوسری رعایا کو میں اُن میں اور دوسرے لوگوں میں جو اُن کے ہم مذہب نہیں ہیں، کوئی فرق نہیں سمجھتا وہ اُنھیں اخلاق کریمہ سے آراستہ ہیں جن سے میری دوسری رعایا، اُن میں ایک خاصی تعداد سول عہدہ داروں اور فوجی افسروں کی ہے جو اعلیٰ عہدوں تک پہنچ گئے مختصر یہ کہ وہ لوگ عظیم چینی خاندان کے افراد ہیں اور اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے امور دینی پر عمل کرنے میں آزاد چھوڑ دئے جائیں۔"

اور اس کے تیس برس کے بعد مشہور شہنشاہ چین کین لونگ نے مسلم دوستی کی

لہ فاضل مقالہ نگار نے اس تاریخی کتبہ کی عکسی تصویر اس مقالے کے آخر میں چھاپ دی ہے۔

دلیلیں پیش کیں۔

اور یہ واقعہ کہ مرکزی حکومت نے مسلمانوں پر ظلم کیا اور وہ اس کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوئے صرف خاندان مانچو کی حکمرانی کے آخری عہد میں خصوصاً ۱۲۷۱ھ سے ۱۳۱۴ھ تک پیش آیا لیکن جلد ہی چینی رواداری کی روح اپنی اصل کی طرف لوٹی اور خود چینیوں نے خاندان مانچو کو تخت سے اُتار دیا۔

اور جب چین میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مسلمانوں کو ایسی آزادی ملی جو سابق حکومتوں میں سے کسی حکومت کے ماتحت انھیں نہیں ملی تھی۔ چینی جمہوریت کے بانی پریسیڈنٹ سن یاٹ سن نے علانیہ مسلمانوں کی اہمیت کا اعتراف کیا اور اُنھیں دعوت دی کہ وہ چین کی اصلاح میں ان کی مدد کریں اور اپنے متبعین کو ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب دی اور چینی قومیت کی نشأۃ ثانیہ کے پروگرام میں سرکاری طور پر پوری مساوات اور کامل مذہبی آزادی لکھ دی گئی۔ چین کے مسلمانوں نے داعیِ وطن کی آواز پر لبیک کہنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پورے عزم و اخلاص کے ساتھ وطنی تحریک میں حصہ لیا۔

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی تحریک بھی قومی تحریک کے پہلو بہ پہلو چلی اس کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ پیکن سے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں ایک اسلامی اخبار "الجریدۃ الوطنیہ" کے نام سے جاری ہوا۔ اور ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء جمعیۃ التقدم الاسلامیہ اور ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ العلمیۃ الاسلامیۃ الصینیہ قائم کی گئی۔ پھر چین کی تینوں یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک میں زبان عربی اور علوم اسلامیہ کی پروفیسری کے لئے جگہیں بنائی گئیں اور یہ چونگ کنگ، کون مینگ اور ہان چونگ کی یونیورسٹیاں ہیں،

اور شاید تم جانتے ہو گے کہ جاپانیوں نے جس وقت چین پر زیادتی شروع کی تو چینی مسلمان بھی ان کے ایذا اور شر سے نہ بچ سکے۔ لیکن چینی مسلمان حمیتِ وطنی کے لحاظ سے جاپانیوں کی مزاحمت اور اُن کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے میں دوسروں سے کم نہ تھے اس لئے کہ وہ خالص وطن دوست تھے اور اس لئے بھی کہ اُن کا دین ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ بُرائی، ظلم و جور اور بے انصافی د

واستبداد کو اپنے دلوں، زبانوں اور ہاتھوں سے روکیں اور خاص اسی غرض کے لئے انھوں نے جمعیۃ الدفاع الاسلامیۃ الصینیہ قایم کی جس کے صدر عمر بائی چونگ سی ہیں جو چینی فوج کے ارکانِ جنگ کے صدر اور جنرل چیانگ کائی شیک کے ایک فوجی مددگار اور اُن کے ایک بہترین اور برگذیدہ ساتھی ہیں۔

چین کے مسلمان اپنے وطن کے وفادار ہیں اور مزید یہ کہ وہ اپنے مذہب کے پکے پیرو بھی ہیں اُن میں سے تقریباً ایک سو ہر سال فریضہ حج کے ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں۔

خلافت عباسیہ

جلد دوم۔

تاریخ ملت کا چھٹا حصہ جس میں اٹھائیس[۲۸] حکمرانوں متوکل سے لے کر مستعصم تک کے تمام تاریخی حالات بڑی کاوش سے جمع کئے گئے ہیں اس حصے میں بھی پہلے حصے کی تمام خصوصیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے واثق باللہ کے زمانے تک ایک صدی کو چھوڑ کر عباسی خلافت کے چار سو چھبیس[۴۲۶] سال کے دورِ حکومت کی تاریخ آپ کو اس میں ملے گی جس سے اندازہ ہوگا کہ بغداد جو مسلمانوں کی عظمت و اقتدار کا گہوارہ اور مشرقی ملکوں کا سرتاج تھا کس طرح ویران و پراگندہ ہو کر ان متفرق جماعتوں کا مسکن ہو کر رہ گیا جو ہلاکو خاں کی فوج کے ساتھ آئی تھی سلاطین بویہ، سلاجقہ، زنگی، ایوبی، علویین، باطنیہ، وغیرہ ہم عصر دول اسلامیہ کے حالات کا جامع خلاصہ بھی آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کتاب کے آخر میں عباسی خلافت کے تمام دوروں پر ایک سیاسی اور تاریخی نظر ڈالی گئی ہے جو کم وبیش ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے صفحات ۷۶۴ قیمت غیر مجلد چار روپے بارہ آنے مجلد پانچ روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ
اور
جنگ پانی پت

(۶)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

پھر کچھ بنائے نہ بنے گی اس طرح ہندوستان سے اسلامی حکومت و اقتدار کا نام و نشان ذلت کے ساتھ گم ہو جائے گا یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ مرہٹے اپنے قول و قرار پر قایم رہیں اور ہماری جمعیت کے پریشان ہوتے ہی تمام عہد و مواثیق کو بالائے طاق نہ رکھ دیں "

نجیب الدولہ کی ان باتوں کا معقول جواب تو کوئی سردار روہیلہ نہ دے سکا لیکن شجاع الدولہ کے کہنے سننے سے صلح کو ترجیح دئے جاتے تھے آخرش نجیب الدولہ تنگ آگیا اور اس نے کہا شاہ دُرانی نے صلح یا جنگ کے متعلق مشورہ کرنے کا ہم کو حکم دیا تھا بہتر ہے کہ اب بادشاہ کے حضور میں تمام روداد پیش کر دیں چنانچہ شاہ درانی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کل حالات عرض کئے۔ بادشاہ نے سب سرداروں سے مخاطب ہو کے کہا کہ میں نواب نجیب الدولہ کا طلبیدہ آیا ہوں اس لئے۔ نجیب الدولہ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو سردار نہ لڑنا چاہے وہ شوق سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلا جائے "

بادشاہ کا سرداروں نے جوابِ تلخ سن کر مجبوراً اطاعت پر اظہار خیال کیا صرف شجاع الدولہ خاموش رہے ان تمام حالات سے بھاؤ کو مطلع کر دیا اس کے ہمراہی سردار بھی آخری لڑائی لڑنے کے لئے بھاؤ سے اصرار کر رہے تھے۔ مگر وہ شاہ درانی سے مرعوب ہو چکا تھا اور سمجھ رہا تھا

احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ سے جاں بر ہونا اب مشکل ہے ادھر فوج میں رسد کے نہ ملنے سے مرہٹوں کو سخت مصیبت تھی یہاں تک مورخین لکھتے ہیں کہ مرہٹے گھوڑوں کی ہڈیاں پیس پیس کر آٹے میں ملا کر کھا گئے اس کے علاوہ حصار میں پانچ لاکھ آدمیوں کے بول و براز کا جمع ہونا سخت تکلیف دہ تھا کوئی حصار سے باہر درانیوں کے ڈر سے نہ آسکتا تھا جو نکلا سو گولی کا نشانہ بنا۔ بھاؤ نے آخری مرتبہ شجاع الدولہ کے کارندہ کاشی راؤ کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔

اب پیالہ لبریز ہو گیا ہے ایک بوند پانی کی سمانے کی گنجائش نہیں اگر ممکن ہو تو فوراً کچھ کیجئے ورنہ صاف جواب دیجئے پھر خط و کتابت کا موقع نہ ملے گا۔"

اس خط کے روانہ کرنے کے بعد سردار اور اُس کے سپاہی بھاؤ کے خیمہ کے گرد ہجوم لائے فریادی ہوئے کہ پانی بیت لوٹ کر دو چار دن گذارے اب ہم کو دو دن فاقہ سے گذر رہے ہیں اس عذاب میں مرنے سے بہتر ہے کہ تلوار کے منہ مارے جاویں اب درنگ کرنی ضرور نہیں جو مشیتِ ایزدی ہے وہی ہوگا اگر حکم دو تو ایک پانی غنیم سے کر کے دل کے ارمان تو نکال لیں۔"

بھاؤ نے جواب دیا کہ میں بھی یہی مناسب جانتا ہوں اور جو سب کی مرضی ہو اس پر راضی

صبح کے بڑے میں جنگ | بھاؤ نے حکم دیا کہ ایک گھنٹہ رات رہے سے مخالف کے لشکر کی طرف کوچ ہو اور تمام توپ خانہ آگے چلے بعد اس کے سب نے قسمیں کھائیں کہ جب تک جان تن میں ہے لڑائی سے منہ نہ پھیریں گے اور ہر ایک نے بیڑہ اٹھایا۔"

ادھر کاشی راؤ شقۂ بھاؤ شجاع الدولہ کو سنا رہا تھا رات کے تین بجے تھے یکایک جاسوس خبر لے کر پہنچے کہ مرہٹے مسلح ہو رہے ہیں اور اپنی جگہ سے حرکت کر رہے ہیں۔

شجاع الدولہ نے بھاؤ کے اس طریقے سے سمجھ لیا کہ ایک طرف صلح کی سلسلہ جنبانی ہے دوسری طرف فوج سے حملہ کی تیاری اسی وقت نجیب الدولہ کی نصیحت یاد آئی اور فوراً شاہ درانی کے خیمہ میں پہنچا تو دیکھا کہ شاہ درانی بالکل مسلح ہے اور خیمہ کے سامنے گھوڑا کسا کھڑا ہے۔ شاہ درانی نے تیاری کا حکم دیا اور تنے میں سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے قبل ہی مرہٹوں کی ھرتھری

آوازیں سُنائی دینے لگیں ‘‘

نقشہ میدان جنگ | منشی سدا سکھ لال لکھتے ہیں کہ مرہٹوں نے اپنے معسکر سے قریب ڈیڑھ کوس کے نکل کر توپوں کی ایک باڑ چلائی تب شاہ درانی کو یقین کلی ہوا کہ مخالف آتے ہیں فوراً قلیان کو جو اس وقت پی رہا تھا نوکر کے ہاتھ میں دیا اور بغیر کسی طرح کی بدحواسی کے وزیر اعظم شاہ پسند خاں کو بُلا کے وزیر کو اپنی خاص فوج پر متعین کیا اور فرمایا کہ تم قلبِ سپاہ میں رہو اور شاہ پسند خاں سے کہا کہ تم اپنی سپاہ نجیب الدولہ کے پاس رکھو مستعد پیکار رہو اور ہر ایک سردار کو موقع بتلا کے حکم دیا کہ قرنا اور سرنا کی آواز بہادران رستم نژاد کے دلوں کو زندہ کیا چاہیے اور مخالفوں کی سپاہ میں شور وحشت کا ڈالا چاہیے ‘‘

بادشاہ اسپ تیز گام پر سوار ایک مرتبہ تمام سپاہ سے آگے بڑھ کے سب سرداروں کی فوج کو ملاحظہ کرتا ہوا ایک سرے سے لے کر دوسرے بازو تک گذر گیا اور بعد ازاں صف سپاہ کے پیچھے اس سُرخ خیمہ میں جو لشکر کے سامنے ایستادہ کیا تھا جا بیٹھا اور وہاں سے لڑائی شروع کرنے کا حکم بھیجا مرہٹوں کی فوج کا رخ مشرق کی جانب اور احمد شاہ درانی کی سپاہ کا مغرب کی طرف تھا اور دونوں لشکروں کی ترتیب مقابلہ میں اس نہج پر تھی ‘‘

مشرق	مغرب
درانی	مرہٹے
برخوردار خاں، امیر بیگ خاں وغیرہ سرداران	ابراہیم خاں گارڈی، آپاجی گائیکوار،
مغل، دوندے خاں، حافظ رحمت خاں،	شیودیال پٹیل، بہاؤ مع بسواش راؤ، جسونت راؤ
عباس خاں، احمد خاں بنگش، شاہ ولی خاں،	پنوار، شمشیر بہادر[1]، ملہار راؤ،
شجاع الدولہ، نجیب الدولہ، شاہ پسند خاں	جنکوجی سندھیہ۔

[1] باجی راؤ پیشوا کے تین بیٹے تھے بالاجی راؤ، رگھناتھ راؤ، اور شمشیر بہادر یہ ایک مسلمان عورت کے بطن سے تھا جو تمام بندیل کھنڈ کا مالک تھا اس کی اولاد میں نواب باندہ تھے (سیر المتاخرین)

(باقی آئندہ)

مرثیۃ الاستاذ العلامۃ شبیر احمد العثمانی رحمہ اللہ

(شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)

البشر یا شبیر بلطف ربک

۱۳۶۹ھ

أراني وقلبي دائماً يتوجع ‖ ولست أرى دمعي عن العين تقلع

يفجعني دهري فلا يكتفي بوا ..... حدٍ بل يجبر بعد آخر يفجع

خليل، ومحمود، عزيز، وانور ‖ واشرف، كانوا بيننا ثمّ اقشعوا

ومن بعدهم مولاي شبير احمد ‖ الامام الهمام القرم امسى يود

شيوخ تقضوا واحدا بعد واحد ‖ فاصبح علم الدين مغناه بلقع

وهذي رزايا فادحات واننا ‖ الى يومنا هذا لسهما نتفجع

ولكنما الرزء الاخير رزية ‖ لعمرك انّى للقلوب واوجع

فقد كان سلوانا لنا وبقية ‖ لاسلافنا كنا به نتمتع

منار الهدى طود العلى قدوة الورى ‖ به يرتسى شيخ له القوم خضع

افاد طلاب العلم درسا وخطبة ‖ وخطا وتصنيفا له الفضل اجمع

اليه انتهى فهم الكتاب فهذه ‖ فوائده تملى وتتلى وتسمع

ودرس احاديث النبي وشرحها ‖ بوجه لنا فيه شفاء ومقنع

يُخلِّد ذكراه لنا شرح مسلم ‖ كتاب جليل مستطاب ممتع

مناقبه جلّت عن الحصر كثرة ‖ مآثره تروى مدى الدهر تسمع

نطين ذكي ثاقب الذهن نافذ البصيرة ذو رای متين مُروَّ

نقيه ونظار كذا متكلم ‖ يُقوّم زيغ الزائغين فيقمع

مفسر تنزیل الکتاب محدث — ورتبته فی دین اعلی وارفع
ادیب بعید الصیت والذکر منشئ — بلیغ، خطیب بالغ النطق مصقع
فمن کل نوع حظه متکامل — وفی کل ضرب فضله لیس یدفع
نقی تقی ناسک ثم دیّن — نموذج اخیار مضوا متورع
شبیه بهم فی سمتهم ثم دلهم — وقور حلیم خاشع متخشع
قضی العمر فی بث العلوم ونشرها — خطابا وتذکیرا یفید وینفع
یحط رحال المستفیدین بیته — ومجلسه روض من العلم ممرع
فاکرم به من عالم عامل بعلمه جالبا نفعا الیه وینفع
یذب عن الاسلام طول حیاته — ویحمی عن الدین المتین ویمنع
ویدأب فی التصنیف والدرس یومه — ولیس من الاوقات شیئا یضیع
وکان اذا ما الدیک صاح بسحرة — یقوم فیدعو الله والناس هجّع
رزئنا به علما کبیرا وحکمة — وهذا الرزء خرقه لیس یرقع
فافئدة الاصحاب کلمی لفقده — واکبادهم حری وکادت تصدع
واعینهم عبری تسیل شؤونها — واحشاءهم مما دهوا یتقطع
بکی فقده مصر وشام واعولت — مدائن پاکستان والهند اجمع
بنفسک فارفق ایها المرء واستفق — فحتی متی تبکی علیه وتجزع
(فکل نعیم لا محالة زائل) — وکل سبیل الهالکین سیتبع
وفی الوارث الباقی عزاء من الذی — مضی والیه کل حی سیرجع
نرجّی له الحسنی ومرضاة ربه — فما عنده خیر لعبد مضیع
فاکرم اله الخلق فی الخلد نزله — وافضل واجزل ان فضلک اوسع
اقول ضریح فیه نور مورخا — لقبر ثوی فیه الامام السمیدع

سنہ ١٣٦٩ھ

ادبیات

غزل

(منشی چند بہاری لال صباؔ جے پوری تلمیذ رشید حضرت مائل دہلوی)

(جو دہلی کے لال قلعہ کے مشاعرے میں بتقریب جشن جمہوریت پڑھی گئی)

کیا سمجھتا مرا ساقی مجھے مے خوار نہیں
اُس کو دیتا ہے دو عالم جسے درکار نہیں

میری تسکین کا باعث ترا اقرار نہیں
میں تری ہاں کو سمجھتا ہوں ستمگار نہیں

تیغ کا کام نگاہوں سے اگر اُس نے لیا
وہ بھی مر جائیں گے مرنے کو جو تیار نہیں

وعظ کا حضرتِ واعظ کے خلاصہ یہ ہے
ساری دنیا ہے مگر خود وہ گنہ گار نہیں

موت آ جائے جو اس وقت غنیمت سمجھو
آج کل زیست سے بڑھ کر کوئی آزار نہیں

آنکھ لگتے ہی مجھے خواب میں تم آؤ نظر
ایسے بیدار مرے طالع بیدار نہیں

بات وہ بھی کسی موقع سے کہی جائے گی
جو مجھے سہل نہیں آپ کو دشوار نہیں

لوگ جنت کے لئے یوں جو مرے جاتے ہیں
اُس پہ سایہ تو ترا کوچۂ دلدار نہیں

دیکھنا حشر میں یہ ہے کہ شہادت کو مری
ساتھ اُٹھتی ہے مرے یا تری تلوار نہیں

صاف آتی ہے نظر موت ہماری ہم کو
ایسی روشن تو کسی کی بھی شبِ تار نہیں

جب سے آیا ہے سمجھ میں کہ رضا ہے کیا چیز
اس کی حسرت ہی نہیں مجھ کو کہ مختار نہیں

یہی مطلب ہے قیامت سے یہی دیکھے گا
کس کو اقرار ہے اس کا کسے اقرار نہیں

وہ گئے دن کہ صباؔ سے وہ کہا کرتا تھا
تو نہیں ساتھ تو لطفِ گل و گلزار نہیں

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیںگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ ۵ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبار۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبار میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۸ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ے مجلد ۔

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ زیر طبع

سوشلزم کی بنیادی حقیقت - اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم — زیر طبع

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

۱۹۳۹ء نبی عربی صلعم - تاریخ ملت کا حصہ اول۔ جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت ۱۲ مجلد ۔

فہم قرآن - جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت ۲ مجلد ۔

غلامانِ اسلام - اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن قیمت ۔ مجلد ۔

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے۔ زیر طبع۔

۱۹۴۰ء قصص القرآن جلد اول - حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک - قیمت ۔ مجلد ۔

وحی الٰہی - مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب

بین الاقوامی سیاسی معلومات - یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل نئی کتاب۔ قیمت ۔

تاریخ انقلاب روس - ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن ۔

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد دوم - حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا ایڈیشن مجلد ۔

اسلام کا اقتصادی نظام - وقت کی اہم کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے تیسرا ایڈیشن قیمت ۔ مجلد ۔

مسلمانوں کا عروج و زوال - صفحات جدید ایڈیشن قیمت ۔ مجلد ۔

خلافتِ راشدہ - تاریخ ملت کا دوسرا ایڈیشن قیمت ۔ مجلد ۔ مضبوط اور خوبصورت جلد

بُرہان

جلد بست و چہارم شمارہ (۴)

اپریل سنہ ۱۹۵۰ء مطابق جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پچھلے دنوں بنگال چیمبرس آف کومرس کے صدر مسٹر اے۔ کیمرن کلکتہ کے قریب ایک مقام پر اپنے مسلمان ملازم کی جان بچاتے ہوئے اُس کے ساتھ بڑی بے دردی سے مارے گئے اگرچہ مشرقی اور مغربی بنگال میں جو کچھ ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ واقعہ نہ کچھ زیادہ حیرت انگیز ہے اور نہ مقابلۃً کچھ زیادہ افسوسناک لیکن اگر ہم میں انسانیت کی حس بالکل ہی مر نہیں گئی ہے تو اس واقعہ کا ایک پہلو ہمارے لئے کس قدر عبرت انگیز و سبق آموز ہے۔

مسٹر کیمرن کون تھے؟ کس ملک کے رہنے والے تھے؟ اور جس شخص کی جان بچانے میں انھوں نے خود جان دے دی اس سے ان کا کیا رشتہ تھا؟ ظاہر ہے وہ یورپین تھے ہندوستان کے شہری نہیں بلکہ اجنبی۔ اُس قوم سے تعلق رکھتے تھے جس سے ہندوستان نے ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی ہے اور جس کو انھوں نے سعیِ آزادی کے دور میں ہر تقریر اور ہر تحریر میں کیا کچھ بُرا بھلا نہیں کہا۔ پھر اُس ملک کے رہنے والے تھے جو ہمارے نزدیک خدا ناشناسی۔ مادہ پرستی۔ فحاشی اور عیاشی کا مرکز ہے۔ رہا اس شخص سے تعلق! تو معلوم ہے کہ سوائے انسانیت کے ان کے اور ان کے نوکر کے درمیان کوئی اور مجانست نہیں تھی۔ یہ انتہائی امیر اور وہ انتہائی غریب۔ یہ گورا وہ کالا۔ یہ مغربی وہ مشرقی ان کی زبان اور اس کی بولی اور۔ یہ یہاں کے اجنبی وہ یہاں کا شہری۔ یہ عیسائی وہ مسلمان لیکن ان سب اختلافات کے باوجود انسانیت کا احترام اس شخص کے دل میں اس درجہ ہے کہ وہ ایک حقیر اور ادنیٰ سی جان کو بچانے کے لئے اپنی زندگی بے دریغ قربان کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ دخل نہ دیتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں دیکھیے ہم مشرقی بنگال دمغربی بنگال کے ہندو مسلمان ہیں جو ایک ہی ملک کے شہری ہیں۔ ایک زبان اور ایک کلچر رکھتے ہیں۔ صرف ایک مذہب کا اختلاف ہے باقی سب چیزوں میں ایک دوسرے کے مجانس اور مماثل۔ پھر ہمیں روحانیت اور اخلاق اور خدا پرستی کا بھی دعویٰ ہے۔ ہم ایشیا کو اور اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو روشنی دکھانے کا عہد بھی کر رہے ہیں ہمیں اپنے مذہب کی عظمت و سربلندی پر بھی ناز ہے، تیس چالیس برس تک ہم نے گاندھی جی سے عدم تشدد کا سبق بھی پڑھا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ایک دوسرے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ کیمرن تنہا نے ایک مجمع کا مقابلہ کیا۔ یہاں یہ عالم ہے کہ ایک شخص اپنے حریف کے چھرا بھونک کر بھاگ جاتا ہے اور اس کے ہم مذہب دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے غور کرو جہاں تک انسانیت کے احترام کا تعلق ہے یورپ اور ایشیا میں کتنا بڑا فرق ہے اور اگر ہم نے اس طرح عبرت حاصل نہیں کی اور اپنے آپ کو جلد نہیں سنبھالا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل ہمارا انجام کیا ہوگا۔

اب اگرچہ دونوں جگہ امن و امان ہے لیکن اس سے اقلیتوں کا معاملہ حل نہیں ہوتا کیونکہ گذشتہ واقعات نے اقلیتوں کے دماغ پر اس خیال کو مسلط کر دیا ہے کہ ایک ملک کی اقلیت اپنے ملک میں دوسری اقلیت کے لئے یرغمال کی حیثیت رکھتی ہے اگر ایک جگہ کی اقلیت پر کسی بنا پر وہاں کی اکثریت کی طرف سے کوئی ظلم ہوگا تو دوسرے ملک کی اقلیت سے اس کا انتقام اکثریت کی جانب سے لیا جائے گا اور یہ سب کچھ اس قدر جلدی اور اتنی بڑی تنظیم کے ساتھ ہوگا کہ اس ملک کی حکومت بھی فوری طور پر کوئی کامیاب اور مکمل بندوبست نہیں کر سکے گی چونکہ ایک ملک کی اقلیت اس معاملہ میں بالکل بے بس ہے یعنی اس کا نہ دوسرے ملک کی اکثریت پر جو اس کی ہم مذہب ہے کوئی زور چل سکتا ہے

اور نہ وہاں کی حکومت پر اس کی آواز کا کوئی اثر ہو سکتا ہے اس بنا پر دونوں ملکوں کی اقلیتیں سمجھتی ہیں کہ ہماری قسمت ایک دوسرے کی قسمت سے وابستہ ہے۔ اور ہماری زندگی اور ہماری جان و مال کی عزت و حفاظت بذات خود محفوظ نہیں ہے۔ بس یہ ایک خیال ہے جس کے باعث اقلیتوں میں ڈھارس۔ خود اعتمادی۔ اور اپنی حفاظت کا یقین و اذعان پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں حکومتوں کا اور ان کی دونوں اکثریتوں کا فرض ہے کہ اگر وہ ایمانداری کے ساتھ اقلیتوں کو شہری حقوق کے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں تو اقلیت کے دل و دماغ سے اس خیال کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ بغیر اس کے زندگی امن و چین کے ساتھ بسر نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں حکومتوں کا فرض ہے کہ ایک طرف وہ قانون کی گرفت کو سخت کریں اور جو مجرم ہو اس کو اقلیت کا نہیں بلکہ خود حکومت کا دشمن اور باغی قرار دے کر وہ سزا دیں جو باغیوں کے لئے ہوتی ہے اور دوسری جانب انھیں چاہیئے کہ جگہ جگہ تعلیم بالغان کے مرکز کھول کر۔ اور فلم۔ اخبارات۔ ریڈیو اور جلسوں وغیرہ کے ذریعہ اکثریت کے عوام میں عمدہ شہری زندگی اور اس کے فرائض و واجبات کا احساس اور قانون و ریاست کے احترام کا ایسا قوی جذبہ پیدا کریں کہ رائے عامہ کے استوار ہو جانے کے بعد چند غنڈوں اور بدمعاشوں کو اپنے فرقہ کے افراد کی طرف سے مداہنت یا چشم پوشی کے باعث فتنہ و فساد پیدا کرنے کی ہمت نہ ہو سکے۔

تدوین حدیث

(۴)
محاضرۂ چہارم

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

ان الفاظ سے بزرگ قریش کی غرض کیا تھی ؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی جو وہ کہہ رہے تھے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی عام کتابت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کا جو اعلان فرمایا تو عموماً دلوں میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ کیوں منع کیا جا رہا ہے ؟ اس میں شک نہیں کہ ممانعت کی اسی تقریر کے الفاظ "اکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ واخلصوہ" سے چاہیئے تو یہی تھا کہ منشار نبوت کو لوگ سمجھ جاتے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے کہ عمومی اشاعت کے رنگ میں ایک نسل سے دوسری نسل تک مسلمانوں میں کوئی کتاب اللہ کی کتاب کے سوا بھی منتقل ہو لیکن طبائع ایک طرح کے نہیں ہوتے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے باوجود بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشار مبارک کو بعض لوگ نہ پا سکے، اور بعض لوگ کیا مشہور روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ اصحاب میں تشریف فرما تھے اتنے میں ایک نوعمر نوجوان آدمی آیا اور آکر اس نے یہ مسئلہ پوچھا کہ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ کیا آدمی لے سکتا ہے، آپ نے فرمایا نہیں وہ سن کر چلے گئے تھوڑی دیر بعد ایک کہن سال معمر آدمی آئے، اور بجنسہ اسی سوال کو آنحضرت کی خدمت میں پیش کیا، ان کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ ہاں ! لے سکتا ہے، ایک ہی مجلس میں ایک ہی سوال کے

قطعاً منفی و مثبت دو جواب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئیے تو صحابہ ہی کا بیان ہے کہ

نظر بعضنا الی بعض ہم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مجمع کو مخاطب کرکے فرمانا شروع کیا کہ

"تم لوگ باہم ایک دوسرے کو جس وجہ سے دیکھ رہے ہو میں اس کو سمجھ رہا ہوں، بات یہ ہے کہ بوڑھا آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔" (مسند احمد ص۱۸۵ ج ۲)

مقصد مبارک یہ تھا کہ جوانوں کو اگر اجازت دی جائیگی، تو ان کے لئے خطرہ ہے آگے بڑھ جانے کا اس لیے جوان کو تو میں نے اجازت نہیں دی اور بوڑھے بیچارے کے متعلق اس کا خطرہ نہ تھا، اس لئے ان کو اجازت دے دی گئی۔

یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ مبارک تک کے پا لینے میں ان حضرات میں بھی بعضوں کو دشواری پیش آ جاتی تھی جو براہ راست صحبتِ نبوت سے سرفراز تھے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے تھے اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ آج تیرہ صدیوں کے گذر جانے کے بعد اس قسم کے لوگ جن کا لے دے کر سارا علمی سرمایہ اس راہ میں چند افواہی قصے یا ناقص معلومات والی سطحی کتابوں کے چند اوراق سے زیادہ نہیں ہیں وہ پیغمبر کے صحیح مقاصد و اغراض تک ان بزرگوں کی راہ نمائی کے بغیر پہنچنے کی اس زمانے میں جو کوشش کر رہے ہیں، جنہوں نے ساری عمر اور عمر کا ایک ایک لمحہ صرف[1] ان ہی مقاصد کے سمجھنے میں خرچ کیا ہے خود ہی سوچنا چاہیے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

---

[1] جس وقت قلم سے یہ الفاظ نکل رہے تھے آج سے تیس اکتیس سال پہلے کا ایک نقشہ دماغ کے سامنے آگیا خاکسار سیدنا الامام العارف باللہ شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حلقۂ درس میں بمقام دار العلوم دیوبند ایک ادنیٰ ترین طالب العلم کی حیثیت سے شریک تھا۔ ایک مسئلہ پر جو شوافع و احناف کے درمیان اختلافی ہے۔ حضرت والا نے تقریر شروع کی جس میں بار بار اسی اصول کو دہراتے جاتے تھے کہ ہر شخص کا

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

اسی مسئلہ میں دیکھئے حدیث کی عام کتابت کا جو رواج بڑھتا جا رہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی ممانعت کا اعلان فرمایا جاتا ہے، اور اعلان بھی ایسے الفاظ میں کیا جاتا ہے جن سے سمجھنے والے چاہتے تو ممانعت کی وجہ کو بھی سمجھ سکتے اور یقیناً اکثر حضرات صحابہ نے اس کو سمجھ بھی لیا ہوگا، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت عبداللہ کے ٹوکنے والے یہ بزرگ قریشی ان کا ذہن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوگیا گویا جیسے اس زمانہ میں اسی قسم کی روایتیں جن میں عام حدیثوں کی عمومی اشاعت کی حدبندی کی ان تدبیروں کی خبر دی گئی ہے جو عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں اختیار کی گئی تھیں لیکن ایک طبقہ ہے جس کے کسی ایک فرد نے ابتداء میں ادھر ادھر سے اسی قسم کی چند روایتوں کو جمع کرکے پھیلا دیا ہے اور تقریباً چالیس پچاس سال سے خصوصاً ہندوستان میں رٹنے والے ان ہی روایتوں کو رٹتے چلے جاتے ہیں اور ان ہی کو پیش کرکرکے مسلمانوں کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ قرآن کے سوا دین کا سارا سرمایہ جو تیرہ سو سالوں میں اب تک جمع ہوا ہے، قطعی طور پر مسترد کر دینے کے قابل ہے۔

ظاہر ہے کہ صحابی بہر حال صحابی تھے وہ حقیقت سے اگر کچھ دور بھی ہوتے تھے تو اتنا دور کیسے ہو سکتے تھے جتنا اس زمانے کے بے بصروں اور بے باکوں کا یہ گروہ خود دور ہو چکا ہے، اور دوسروں کو دور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے جیسا کہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، شاید وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت حالت رضا اور عام معمولی حالت میں رہتے ہیں اس وقت تو آپ کی گفتار و رفتار غلطیوں سے پاک ہوتی ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے وہ نمونہ بن سکتی ہے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مذاق شناسِ نبوت ہونا ضروری نہیں ہے نبوت کی مذاق شناسی، یہی مذہبی حقائق کے سمجھنے کا ایک گر ہے، پہلی دفعہ اسی دن کان میں یہ بات پڑی، اور جیسے جیسے تجربہ بڑھتا گیا اس اصول کی اہمیت بھی دل میں بڑھتی گئی۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء ۱۲

آپ کو بشر قرار دیتے ہوئے ان کو یہ خیال گذرا کہ غصہ کی غیر معمولی حالت میں پیغمبر کی زبان سے جو چیزیں نکلتی ہیں غلطیوں سے پاک ہونے میں شاید ان کی یہ کیفیت نہیں ہے، انھوں نے شاید یہ خیال کر لیا کہ حدیثوں کی کتابت کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو ہوئی ہے، اس کی وجہ یہی ہے، انھوں نے عبداللہ بن عمرو کو ٹوکتے ہوئے اسی وجہ کا ذکر کیا جو ان کی سمجھ میں آئی تھی، اور گو جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا، ان کی یہ غلطی معمولی غلطی نہ تھی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، آج جب کہ حدیث کے سارے دفتر ہی کو ختم کر دینے کا مشورہ ان ہی روایتوں سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو ہو کر دینے والے دے رہے ہیں، ان کے لحاظ سے یقیناً ان کی غلطی کا وزن کچھ ہلکا ہو جاتا ہے، آج تو جو کچھ کہا جا رہا ہے، سچ پوچھئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مشہور پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے جو صحاح کی مختلف کتابوں میں پائی جاتی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

الا ھل عسی رجل یبلغہ الحدیث عنی وھو متکی علی اریکتہ فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ حلالا استحللناہ وما وجدنا فیہ حراما حرمناہ الا وانی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ

(ابو داؤد ترمذی وغیرہ)

خبردار! قریب ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کسی شخص کو میری حدیث پہنچے گی، اور وہ اپنے چھپر کھٹ یا کرسی پر بیٹھا ہے (تو میری حدیث سن کر) وہ کہے گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن ہے پس قرآن میں جن چیزوں کو ہم حلال پائیں گے ان ہی کو حلال سمجھیں گے اور جن چیزوں کو اس میں حرام پائیں گے انھیں ہم حرام سمجھیں گے (یہ کرسی نشین کی بات ہوئی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) خبردار! مجھے کتاب یعنی قرآن بھی دیا گیا ہے اور اسی جیسی چیز بھی قرآن کے ساتھ دی گئی

یہ سب کس بنیاد پر کیا جا رہا ہے، ممکن ہے محرکات اس کے کچھ اور ہوں لیکن استدلال ان ہی تحدیدی روایتوں کو پیش کرتے ہیں، جن کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ قرآن کے سوا اپنی زندگی کی تعمیر میں مسلمان اور کسی چیز سے قطعاً استفادہ نہ کریں بلکہ جیسا کہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ عمومی اشاعت کی راہ سے امت میں جن چیزوں کا منتقل کرنا مقصود تھا، محض ان سے الگ کرنے کے لئے عام حدیثوں کے متعلق یہ خاص طرزِ عمل اختیار کیا گیا، اب عمومی اشاعت کی راہ سے جو چیزیں پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں تک پہنچیں کیا وہ رد کی جا سکتی ہیں کہ جس پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر مان کر قرآن پر اعتماد کیا جا رہا ہے، اسی پیغمبر کی طرف منسوب ہونے والی ان باتوں کو مسترد کر دیا جائے جو اسی تواتر و توارث کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، جس راہ سے پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر قرآن پہنچا ہے، چونکہ یہ مسئلہ "تدوین حدیث" سے زیادہ "تدوین فقہ" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی پوری بحث تو اسی کتاب میں پڑھنی چاہئے لیکن یہاں بھی میں پوچھتا ہوں کہ قرآن کے سوا تواتر و توارث کی راہوں سے جو چیزیں ہم تک پہنچی ہیں، ان کو اگر مسترد کر دیا جائے گا تو قرآن کے کسی ایک مطالبہ پر بھی عمل ممکن ہے؟ میں نے خود نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا قول تدوین فقہ میں نقل کیا ہے کہ کوئی نماز تک نہیں پڑھ سکے گا، یہ بھی نہیں جانا جا سکتا کہ ظہر کی کتنی رکعتیں ہیں، اور عصر کی کتنی؟ بلکہ یہ بھی نہیں کہ ہر رکعت میں ایک سجدہ کرنا چاہئے یا دو، یا سجدہ ہی کیسے کرنا چاہئے، اور یہی حال تقریباً سارے قرآنی مطالبات کا ہے

بس عام حدیثوں کی کتابت ہو یا روایت، ان کے متعلق تحدیدی روایتوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے مطالبوں کی گرفت میں اتنی سختی نہ پیدا ہو، جو صرف ان ہی مطالبوں کی خصوصیت ہو سکتی ہے جن کا انتساب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر قسم کے شکوک و شبہات سے قطعاً پاک ہے، لیکن سمجھنے والوں نے ان روایتوں سے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی کتاب کے سوا ان ساری چیزوں کا مسترد کرنا مقصود ہے، جو پیغمبر کی طرف منسوب ہو

اور جب عہد نبوت میں بعضوں کو یہ غلط فہمی لگ گئی کہ رضا کے حال کی چیزیں تو صحیح ہیں لیکن غصہ کے وقت کی جو باتیں پیغمبر کے منہ سے نکلتی ہیں ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے اور اپنے اسی غلط خیال میں مبتلا ہونے کے ساتھ یہ بھی چاہا کہ دوسروں کو بھی اسی غلط خیال میں مبتلا کر دیں یعنی عبداللہ بن عمرو کو بھی سمجھاتے ہوئے حدیث کے لکھنے سے منع کر دیا، حضرت عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ قریش کی بزرگی اور اپنی خوردی کا خیال کر کے اس وقت تو قلم ہاتھ سے انھوں نے رکھ دیا لیکن اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا اظہار کیا۔ کتنی شدید غلطی میں ٹوکنے والے یہ صحابی مبتلا تھے۔ ہم کو اور آپ کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن دنیا کے اغلاط ہی کی تصحیح کے لئے بھیجا گیا تھا (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سننے کے ساتھ ہی آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا جس کی زندگی کا ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک پیدا ہونے والے انسانوں مردوں اور عورتوں سب ہی کے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے

. . . .

. . . . ، اگر اس کی زندگی کے کسی پہلو میں ایک غلطی بھی رہ جائے گی تو وہ ایک غلطی نہ ہوگی بلکہ کروڑہا کروڑ بے شمار انسانوں کی غلطی بن جائے گی ان بزرگ صاحب کو اس کا اندازہ نہ ہوا

لَکُمْ فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ تمہارے لئے رسول اللہ میں بہت اچھا نمونہ ہے

کا اعلان جس ذاتِ گرامی کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت اس کی زندگی کے کسی پہلو میں کسی غلطی کو باقی رکھ سکتی ہے۔ اسی لئے تو یہ طے شدہ فیصلہ سلف سے

---

[1] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز بانی دار العلوم دیوبند نے اس کی کتنی اچھی مثال دی ہے کہ سلوانے والا درزی سے مثلاً قمیص سلوانا چاہتا ہے نمونہ کے لئے تمام قمیصوں میں جو بہتر قمیص ہوتی ہے اس کو درزی کے حوالہ کر کے ہدایت کرتا ہے کہ بس اسی نمونے پر ساری قمیصوں کو تراش کر کے سی دو۔ اب اگر

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۰۳)

لے کر خلف تک کا ہے کہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے۔

بہر حال حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ سمع مبارک میں جس وقت میرے الفاظ پہنچے اور معلوم ہوا کہ کتابتِ حدیث سے روکتے ہوئے ایسی بات مجھ سے کہی گئی ہے جن کا حاصل یہی ہے کہ پیغمبر غصّہ میں جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں اٹھیں جن کا رُخ دہن مبارک کی طرف تھا عبداللہ بن عمرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

فاومأ باصبعه الیٰ فیه — پس اشارہ کیا اپنی انگلی سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دہن مبارک کی طرف

اور وہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی طرف سے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ عام حدیثوں کے مطالبہ کی قوت قرآنی مطالبہ کی قوت کے برابر نہ ہو جائے چند دن پہلے یہ منادی کرائی گئی تھی کہ قرآن کے سوا جس کسی نے مجھ سے (یعنی میری طرف منسوب کرکے) جو کچھ لکھا ہے چاہیئے کہ اسے محو کردے، اسی پیغمبر کو دیکھا جا رہا ہے کہ ایک دوسرے خطرے کے انسداد کے لئے عبداللہ بن عمرو کو فرما رہے ہیں۔

اکتب — تم (قرآن کے سوا بھی میری باتیں) لکھو

اور جس خطرے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، اور اندیشہ کیا بلکہ مبتلا ہونے والے اس خطرے میں کلی طور پر نہیں تو کم از کم غصّہ کی حالت کی باتوں کے متعلق اس غلط فہمی کے شکار ہو چکے تھے کہ ان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فرض کیجئے کہ نمونے ہی کی اس قمیص میں کوئی سقم یا خرابی ہوگی تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ساری قمیصیں جو اس نمونے پر تراشی جائیں گی، خراب ہو کر رہ جائیں گی پیغمبر کو بھی خدا نمونہ بنا کر پیدا کرتا ہے بندوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اپنی زندگیوں کو اسی نمونے پر ڈھالتے جائیں جو جس قدر اس نمونے سے قریب تر ہوگا خدا کے نزدیک وہی سب سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ غیر ممکن ہے کہ غیر محدود طاقت و قدرت رکھنے والے خدا کسی ایسے نمونے کو پیدا نہیں کر سکتا جس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہ ہو ۱۲۔

غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے اسی خطرے کا ازالہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہو رہا ہے، اور کتنے تاکیدی الفاظ میں ارشاد ہو رہا ہے پہلے قسم کھائی جاتی ہے یعنی وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ (قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) فرماتے ہوئے اصل غلطی کا ازالہ ان الفاظ میں فرمایا جاتا ہے، یعنی دہن مبارک کی طرف انگلیاں اٹھی ہوئی ہیں، اور کہا جا رہا ہے۔

لایخرج منہ الا الحق (ابو داؤد وغیرہ) نہیں نکلتا ہے اس سے (یعنی دہن مبارک سے) مگر صرف سچی بات،

نبوت کے جو مذاق شناس نہ تھے ان کو پہلے حکم میں جس کی عام منادی کی گئی تھی، یعنی حدیثوں کی کتابت کی مخالفت والے حکم میں اور آج جو عبداللہ بن عمروؓ کو اکتب (لکھا کرو) کے لفظ سے ان ہی حدیثوں کے لکھنے کی جو اجازت مرحمت فرمائی جا رہی ہے دونوں میں وہی منفی و مثبت حکم والا تضاد نظر آیا، حالانکہ بات بالکل واضح تھی، مخالفت کے جس حکم کی منادی کی گئی تھی اس کا بالکلیہ رخ حدیث نبوی کی عام اشاعت کے رواج کے انسداد کی طرف تھا، لکھنے والوں نے ایک میدان میں جمع ہو کر سب کو آگ میں جھونک دیا تھا، اس سے اس رواج کے دروازے پر قفل پڑھ چکا تھا، اور آج جس اجازت کے ایک خاص آدمی کو رضا و غضب ہر حال کی باتوں کے لکھنے کی جو اجازت دی گئی تھی اس سے اس خطرناک غلط فہمی کی بیخ کنی مدنظر تھی، جو کتابت حدیث کی ممانعت کے عام حکم کی وجہ سے بعض دلوں میں پیدا ہوئی تھی یعنی باور کر لیا گیا تھا کہ بشر ہونے کی وجہ سے نبی کی ہر گفتگو کا وہ حصہ جو غصہ کی حالت میں جو کچھ وہ بولتے ہیں اس کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے، ممانعت کے حکم سے بھی آئندہ پیدا ہونے والی غلطی کا انسداد ہی مقصود تھا اور اب اجازت جو دی گئی اس کی غرض بھی اسی غلطی کا ازالہ تھا جس کے پیدا ہونے کا صرف اندیشہ ہی آئندہ زمانہ میں نہ تھا، بلکہ عبداللہ بن عمروؓ کی رپورٹ سے تو آپ کو یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ اس غلطی کا

میں مبتلا بھی ہو چکے ہیں، اس کے سوا کہ رضا و غضب دونوں حال کی گفتگو کے لکھنے کی اجازت ان کو دے دی جائے۔ خود ہی سوچا جائے کہ غلطی کے ازالہ کی عملی شکل اور کیا ہو سکتی تھی چوں کہ ایک شخص واحد کو انفرادی طور پر لکھنے کی یہ اجازت دی گئی تھی اس لئے اس سے اس کا اندیشہ بھی نہ تھا کہ ان مکتوبہ حدیثوں میں وہی عمومی رنگ پیدا ہو جائے گا، جسے آپ صرف ان چیزوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے جن کا ہر مسلمان تک پہنچانا فرائض رسالت میں داخل تھا۔

اور یہ تھی پیغمبرانہ تدبیروں کی وہ داستان جن کی بدولت تیرہ سو سال سے یہ عجیب و غریب صورت مسلمانوں میں قائم ہے کہ ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو احاد یا خبر الواحد بعد الواحد یا خبر الخاصہ عن الخاصہ کی راہوں سے منتقل ہونے والی نبوی حدیثوں کے متعلق اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے متعلق یہ خیال رکھتا ہو کہ گرفت اور مطالبہ میں ان کی قوت قرآنی مطالبوں، اور دین کے ان مطالبوں کی قوت کے مساوی ہے جو قرآن ہی کی طرح نسلاً بعد نسل جیلاً بعد جیل عمومیت کی راہوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں، اس سلسلہ میں علماء مذہب کے جو فیصلے ہیں، ان کا ذکر کر چکا ہوں، مگر اس کے ساتھ ہر زمانہ میں ان بلند نظروں، عالی حوصلہ رکھنے والوں کے لئے بھی ہمیشہ اس کی راہ کھلی رہی اور اس وقت تک کھلی ہوئی ہے انشاء اللہ قیامت تک کھلی رہے گی جو چاہتے ہیں کہ ممکنہ حد تک پیغمبر کی زندگی اور اس زندگی کے نمونوں کے مطابق جینے کا اگر موقعہ ملے تو اس میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے[1]۔

یہی "گنج دار و حرنیہ" ہی کی تو پیغمبرانہ حکمت عملی تھی اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، آپ کے خلفاء برحق نے بھی اسی حکمت کی نگہداشت میں پورا زور صرف کر دیا، اسی کا یہ نتیجہ

---

[1] حضرت بایزید بسطامی کا مشہور واقعہ ہے کہ عمر بھر خربزہ آپ نے اس لئے نہیں کھایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس کو کھاتے تھے اس کی ان کو تحقیق نہ ہو سکی ۱۲۔

کہ جہاں ان شاہ بازوں کی بلند پروازیوں کے لئے جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی یحببکم اللہ (خدا تم کو اپنا محبوب بنائے گا) کا اعلان قرآن میں ہر اس شخص کے لئے کر دیا گیا تھا، جو پیغمبر کے نقش قدم پر قدم رکھتا ہوا جہاں تک بڑھ سکتا ہو بڑھتا چلا جائے پھر بڑھنے والے بڑھتے چلے گئے اور جن حدیثوں کا ہر شخص تک پہنچانا مقصود نہ تھا، ان کی روشنی ان لوگوں تک پہنچتی رہی جو دین کے اسی نفلی حصہ سے اس مقام تک پہنچتے رہے جس کے متعلق یہ بشارت سُنائی گئی ہے کہ پہنچنے کے بعد جو بندہ اور مخلوق ہے وہ عروج اور ارتقاء کی اس کیفیت کو پاتا ہے جس کی تعبیر خالق ہی کے الفاظ میں یہ سُنائی گئی ہے کہ

کنت سمعہ الذی یسمع بہ	میں اس بندے کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے
وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ	وہ سُنتا ہے اور اس کی بینائی جس سے وہ دیکھتا
التی یبطش بھا ورجلہ التی	ہے اور اس کے ہاتھ جن سے وہ پکڑتا ہے اور
یمشی بھا (صحاح بخاری وغیرہ)	اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے

لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ "طبیعت ہی جن کی ادھر نہیں آتی" یہ تو خیر بجائے خود ان غریبوں کی مستقل بدبختی ہے مگر سوچئے تو سہی کہ ان حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ میں عمومیت کی کیفیت پیدا کر کے اگر ان کے مطالبوں کو بھی ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کر کے اسی طرح قطعی اور یقینی بن جانے کا موقعہ دے دیا جاتا جیسے دین ہی کے ایک شعبہ میں اسی رنگ کو پیدا کیا گیا ہے تو عجب " پر طبیعت ادھر نہیں آتی " کی معذرت کو معصیت بلکہ تمرد و بغاوت بن جانے سے کون روک سکتا تھا، آج تو ان کی یہ معذرت اسی لیے

میرا اشارہ اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے ہوتا چلا جاتا ہے تا آنکہ میں اس بندے کو چاہنے لگتا ہوں" اسی کے بعد اس حدیث قدسی میں وہ بشارت سنائی گئی ہے جسے میں نے بجنسہ عربی الفاظ میں درج کر دیا ہے ۱۲

معذرت ہے کہ جن چیزوں کی طرف ان کی طبیعت نہیں جاتی، ان کے مطالبہ میں اتنی قوت ہی نہیں ہے جو معذرت کو معصیت اور بغاوت بنا دیتی ہے اور کیا اس طول کلامی کے بعد بھی مزید صنرورت اس کی باقی رہ گئی ہے کہ میں لوگوں کو پھر یہ سمجھاؤں کہ یہ سارا کرشمہ اسی مہیج دار و مربیانہ کی حکمت عملی اور ان نازک تدبیروں کا نتیجہ ہے جن کے حدود کی پوری نگرانی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں نے فرمائی۔

بہر حال عبداللہ بن عمرو ایک خوش قسمت آدمی تھے، اگر ٹوکنے والے صاحب ان کو مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ نہ ٹوکتے۔ بلکہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ میاں! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھتے ہو کیا اس کا علم تمہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کردی گئی ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اتنی سی سیدھی سادی صاف بات وہ کہہ دیتے اور ان کے دماغ نے پیغمبر کے حکم کا جو فلسفہ پیدا کیا تھا یعنی بشری اغلاط کی گنجائش انھوں نے یہ باور کرلیا تھا کہ اس حکم کے دینے کی یہی وجہ ہے قریشی صاحب اپنے اس خود تراشیدہ فلسفہ کا اگر ذکر نہ کرتے تو عبداللہ کو اتفاقاً جس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ مل گیا، شاید نہ ملتا، گویا اس فلسفہ کے شر سے خیر کا ایک پہلو یہ پیدا ہوگیا، اور یہی کیا اگر اسی زمانہ میں پیدا ہو کر اس فلسفہ کی بنیاد ہی کے کھود دینے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ نہ مل جاتا، تو صرف قرآن کی ایسی آیتوں سے مثلاً

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ	پیغمبر نہیں بولتے "الھوی" (یعنی اپنی ذاتی خواہش سے) نہیں ہے وہ (یعنی پیغمبر کا بول)، مگر وحی جس کی وحی ان پر کی جاتی ہے۔

وغیرہ سے مغالطہ کی ان گتھیوں کا سلجھانا کیا آسان تھا، جن میں دعویٰ اسلام کے باوجود اس زمانہ میں حدیثوں کی ان ہی تحدیدی روایتوں کی بنیاد پر لوگ مبتلا ہوگئے ہیں، اور کہتے ہر

کہ مذکورہ بالا آیت کا تعلق بھی صرف قرآن سے ہے۔ اسی لئے وہ پیغمبر کو صرف قرآن کی حد تک پیغمبر مانتے ہیں۔ قرآن سے الگ کر لینے کے بعد العیاذ باللہ پیغمبر کی زندگی میں اور جو پیغمبر نہیں ہیں ان کی زندگی میں ان پراگندہ باز آنکھوں کے نزدیک کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے مگر عبداللہ اس فلسفہ کے شر نے ایک ایسے خیر کو پیدا کیا جس نے ثابت کر دیا کہ مذکورۂ بالا قرآنی آیت کا واقعی مطلب بھی وہی ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے سمجھا جا رہا ہے یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ مطلقاً نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعاً "الھویٰ" (پیغمبر کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے بلکہ قرآنی نطق ہو، یا غیر قرآنی نطق، پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے، اور حضرت عبداللہ کو سمجھاتے ہوئے قسم کھا کر دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے بھی اسی مفہوم کی مزید تائید اور تاکید ہو گئی، اور محقق ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی ہر حال میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کی زبان کا ہر بول ذاتی فکر و نظر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سب وحی ہے خواہ خوشی کے حال میں بات کی گئی ہو یا غصہ کی حالت میں سچ پوچھئے تو اس قرآنی نص کی بنیاد پر پیغمبر کی معصوم زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے روشنی کا مینار ہے فرق آئندہ صرف ان ذرائع کی قوت و ضعف سے پیدا ہوتا ہے، جن کی راہ سے امت میں پیغمبر کی زندگی، زندگی کے آثار، گفتار و رفتار کے متعلقہ معلومات پہنچے ہیں، ان ہی کی قوت و ضعف کے ساتھ ان احکام و نتائج کی گرفت اور مطالبوں کی قوت و ضعف کا مسئلہ وابستہ ہے جو ان معلومات سے نکلتے ہیں یا نکل سکتے ہیں، یہی وجہ تو ہے جب ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک خاتون صاحبہ پہنچیں، اور حدیثوں میں عورتوں کو وشم یعنی گودنا گدانے سے جو منع کیا گیا ہے اس کا اور اسی قسم کی چند باتوں کا ذکر کر کے کہنا شروع کیا۔

بلغنی انك قلت ذبت وذيت والواشمه والمستوشمه وانی قرأت مابین اللوحین فلم اجد الذی تقول	مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم فلاں فلاں باتیں کہتے ہو اور کہتے ہو کہ گودنا لگانے والی اور جو اپنے بدن میں گودنا لگاتی ہے، ان پر لعنت کی گئی ہے حالانکہ میں نے قرآن کے دونوں لوحوں کے درمیان جو کچھ ہے سب کو پڑھا اس میں تو ایسی کوئی بات نہ ملی جو تم کہتے ہو۔

یہ عجیب وغریب مغالطہ جس پر اس زمانے میں تحقیق کے بڑے بڑے دعووں والے مردوں کو شاید ناز ہے۔ اسی مغالطہ کو عرب کی ایک عورت کی زبان سے سن کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بی بی صاحبہ کو پہلے تو کہا کہ جاؤ، پھر قرآن کو پڑھ کر آؤ، وہ تعمیل حکم کے بعد پھر حاضر ہوئیں اور بولیں کہ مجھے اب بھی قرآن میں وہ باتیں نہ ملیں جو تم سے مجھے پہنچی ہیں، تب ابن مسعود نے ان کو سمجھایا کہ

اما قرءت ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنه فانتھوا	کیا تم نے (قرآن میں) نہیں پڑھا ہے کہ جو کچھ دے تمہیں رسول تو اسے لے لیا کرو، اور جس سے تم کو روکیں اس سے رک جاؤ،

بی بی صاحبہ نے کہا کہ ہاں یہ تو میں نے قرآن میں پڑھا ہے، ابن مسعود نے فرمایا کہ

فھو ذاك[1]	تو بس یہی وہ بات ہے

چوں کہ وہ سمجھنے ہی کے لئے آئی تھیں اس لئے دوسرے دریدہ محرکات کے زیر اثر اس مناظرانہ گفتگو کو اپنی کامیابی کا انھوں نے ذریعہ نہ بنایا، یعنی بندوں کو خدا نے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ پیغمبر جو کچھ دیں اور جس چیز سے روکیں اس کو مان لینا چاہئے خواہ قرآن کے نام سے وہ چیز دی گئی ہو یا اس کو یہ نام نہ دیا گیا ہو قرآن کو بھی ماننے والے قرآن کے دینے

---

[1] الفاظ کے معمولی اختلاف سے اس روایت کا صحاح کی مختلف کتابوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ نیز مسند احمد میں بھی ہے۔

والے پر اعتماد ہی کی بنیاد پر تو مانتے ہیں، اس لحاظ سے قرآنی اور غیر قرآنی مطالبات میں خود ہی سوچنا چاہیے کہ کیا فرق ہے۔ ہاں پیغمبر کی عطا کی ہوئی چیزوں میں امتیاز در حقیقت ان راہوں کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جن سے گذر کر امت تک وہ چیزیں پہنچی ہیں، اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ توارث و تواتر کی عمومیتِ عامہ کی راہ سے جو چیزیں پہنچی ہیں، خود ان کی اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی قوت مطالبہ اور گرفت میں ایک ہوگی، خواہ قرآن کے نام سے وہ پہنچی ہوں یا یہ نام ان کو نہ دیا گیا ہو، بلکہ اس راہ سے ان چیزوں کا پہنچنا یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک سے چوں کہ ان کا مطالبہ مقصود تھا اسی لئے ان کے پہنچانے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ پیغمبر کی طرف اُن کے انتساب میں قطعاً کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، بخلاف ان چیزوں کے جو امت میں خبر الواحد بعد الواحد کی خصوصی راہوں سے پہنچی ہیں، اس نوعیت کے ساتھ ان کی منتقلی ہی دلیل ہے اس بات کی کہ پیغمبر ان کو پہنچانا تو چاہتے تھے لیکن ہر شخص تک اس طریقے سے ان چیزوں کا پہنچنا مقصود نہ تھا کہ ان سے گریز قطعی طور پر اللہ اور اس کے رسول سے گریز کی شکل اختیار کر کے بھاگنے والوں کو معصیت اور بغاوت کا مجرم ٹھہرا دے۔

فلسفہ کے اس شر سے خیر کا یہ پہلو جو پیدا ہوا وہ تو اتنا اہم ہے کہ رہتی دنیا تک اسی سے قرآن کے اجمالی آیات کا مطلب متعین کیا جائے گا یعنی مذکورہ بالا آیات مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى یا مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے سوا قرآن ہی میں بار بار پلٹ پلٹ کر اس قسم کی آیتوں کا جو اعادہ کیا گیا ہے مثلاً قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى	بس کچھ بھی نہیں تیرے رب کی قسم ہے وے ہرگز
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	ایمان نہ لائیں گے۔ جب تک تجھے (اے پیغمبر)
لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	ان تمام باتوں میں حکم اور فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں

مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء)

جو ان کے باہمی جھگڑوں میں پیدا ہوئی ہیں، پھر اپنے اندر کسی قسم کی تنگی اس فیصلہ کے متعلق نہ پائیں جو تم نے کر دیا ہو اور کلیۃً اس فیصلہ کے آگے جھک جائیں

یا ارشاد ہوا ہے

مَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اسی لیے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے

یا دھمکایا گیا ہے

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (نور)

پس چاہیئے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ وہ مبتلا ہو جائیں یا ان کو دُکھ بھرا عذاب پکڑ لے۔

یا صلائے عام دیا گیا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہت اچھا نمونہ ہے جو اللہ کی اور پچھلے دن کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

یہ یا اسی نوعیت کی دوسری آیتیں جن سے خواص کیا عوام مسلمین بھی شاید نا واقف نہیں ہیں اب ان اطلاقی آیات پر تحدید عائد کرنے کی راہ ہی کیا باقی رہی، صاف معلوم ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی کے مثبت و منفی، ایجابی و سلبی غرض ہر پہلو میں مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے رضا اور غضب کی تقسیم کرنے والے دراصل اپنے ایمان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

"اعاذنا اللہ والمسلمین من هذه الهفوات"

خیر میں مطلب سے ذرا کچھ دور ہو گیا بجائے تدوین حدیث کے تدوین فقہ کے بعض تفصیلات

میں مشغول ہوگیا، موقعہ آگیا تھا قلم روکنے کے باوجود رکنے پر آمادہ نہ ہوا چھوڑ دیا گیا۔ ورنہ مسئلہ تو یہ تھا کہ اس شر سے علاوہ اس "خیر عظیم" کے "تدوین حدیث" کی تاریخ میں اس انکشاف کے اضافہ کا یعنی عہد نبوت ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور حکم سے بعض صحابیوں نے حدیثوں کو قلم بند کیا تھا، سچ پوچھئے تو اس کا موقعہ حضرت عبداللہ کی اسی رپورٹ کی وجہ سے مل گیا، ورنہ کتابتِ حدیث کی عام ممانعت کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے مسودوں کو جب نذر آتش کر دیا تھا، اس کے بعد پھر لکھنے کی ہمت کون کرتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کتابت کی ممانعت سے ناواقف رہ جانے کی وجہ سے عبداللہ بن عمرو نے حدیثوں کے لکھنے کا کام جو شروع کیا تھا، اگر ان کو ٹوکنے والے صاحب یوں ہی سادہ طور پر منع کر دیتے یعنی صرف اتنا فرما دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عام ممانعت کا اعلان ہوگیا ہے اور ممانعت کے خود آفریدہ فلسفہ کو نہ پیش فرماتے تو بارگاہ رسالت میں عرض کرنے کے بعد بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اجازت ملتی بھی یا نہیں، وہ تو خدا بھلا کرے قریش کے ان بزرگ کا، اللہ ان سے راضی ہو، کہ ان کی غلطی ایک اہم تاریخی غلطی کی تصحیح کا ذریعہ بن گئی، خیال تو یہی ہے کہ ان کی خود آفریدہ توجیہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچتی تو جیسے سب کو کتابتِ حدیث سے منع کر دیا گیا تھا۔ عبداللہ کو بھی منع کر دیا جاتا، لیکن جن الفاظ کے ساتھ ان کے ٹوکنے کے قصہ کو بارگاہ نبوت میں حضرت عبداللہ نے پیش کیا، ان کے سننے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کی زبانی تصحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ سے رضا و غضب ہر قسم کی گفتگو کو لکھوا کر گویا اس زبانی تصحیح کو عملی قالب بھی عطا فرمایا اسی لئے حضرت عبداللہ سے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ لکھنے کی اجازت کے بعد میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تاکیداً پھر دریافت کیا

فی الرضاء والسخط — کیا عالت رضا و خوشی کے ساتھ غصہ اور عتاب کی حالت کی گفتگو قلم بند کر سکتا ہوں

(باقی آئندہ)

قرآنِ حکیم کے لفظی و معنوی حقوق

(۴)

تلاوت، فہم، عمل

(۲)

(جناب خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب اسحاقی رحمانی، سہارنپوری)

اس کے علاوہ تفسیر و تاویل اور فہم و تدبر کا جو بھی طریقہ ہوگا وہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہوگا
تفسیر تو محض اس لئے کی جاتی ہے کہ متکلم کی مراد کے موافق اس کے کلام کا مفہوم
و مقصد معلوم و متعین کر کے اس پر آسانی کے ساتھ عمل کر سکیں نہ یہ کہ اس کی غلط ترجمانی
اور اس کے کلام پہ بیجا حاشیہ آرائی یا اضافہ و ترمیم کی جائے اپنی رائے اور عقل و قیاس کا
اسی حد تک کسی کے کلام میں دخل ہو سکتا ہے جس حد تک کہ فہم و تدبر اور نقل و روایت
کے اصول اجازت دیں ورنہ اگر قائل و متکلم کے قول و کلام کا رخ کسی طرف ہو اور اس
کا ترجمان اور مفسر کوئی اور رخ متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی نہ ہوگی۔ بلکہ تفسیر القول بما
لا یرضیٰ بہ قائلہ۔ تحریفِ معنی۔ اور تبدیلِ مراد ہوگی۔

جس طرح سے حق تعالیٰ نے قرآن پاک کے نظم اور الفاظ اور متن و عبارت کے
محفوظ رہنے اور بجنسہٖ ان کو لوگوں تک پہنچا دینے کی کفالت اپنے ذمہ لی ہے بعینہٖ اسی طرح
اس کے مطالب و مفاہیم اور معانی و مقاصد کی حفاظت و تبلیغ کی بھی کفالت اور ذمہ داری
فرمائی ہے تاکہ تمام عرب و عجم مسلم و غیر مسلم عالم و جاہل اور بلا تخصیص ہر فرد بنی آدم اس
کی تلاوت و قراءت اور پھر فہم و تدبر اور تعمیل و متابعت سے اپنے معاش و معاد کے ہر کلی و
جزوی امر کی اصلاح چاہے اور اپنے توہمات و خیالات کو اس میں دخل نہ دے کر آزاد خیالی کے

ساتھ اس میں اپنی رائے زنی سے اجتناب کرے۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں

"وحی الٰہی یعنی قرآن و حدیث کہ جن کے ساتھ دین اسلام کا وجود و عدم وابستہ ہے دانا دشمن اور ناداں دوستوں نے یا یوں کہو کہ دشمنانِ اعیانی اور بیہنالی نے طرح طرح سے اس کے ساتھ وہ سفاکانہ اور بیباکانہ کارروائی کی ہے کہ جس پر اسلام کا اصلی صورت پر باقی رہنا ایک حیرتناک قصہ ضرور ہے، انصاف سے ایک تحریفِ معنوی ہی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمائیے۔ جو اس وقت وباء کی طرح پھیل رہی ہے کہ اس کے مقابلہ میں یہود کی وہ تحریف کہ جس کی برائی کلام الٰہی میں جگہ جگہ مذکور ہے کم نظر آتی ہے۔

تورات میں جو تحریف کرتے تھے وہ کسی وجہ سے عالم تورات تو سمجھے جاتے تھے الفاظ تورات کی تلاوت سے متنفر، اور اس کی عبارت کے لفظی ترجمہ سے تو بے خبر نہ تھے۔ یہ تو نہ تھا کہ محض بضرورت تحریف ہی تورات کو دیکھتے ہوں۔

اب تو یہاں تک نوبت آگئی کہ کتب تاریخ دیکھ لو اور کلام الٰہی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف شروع کر دو۔ یا جغرافیہ پڑھ لو اور تحریف کرنے لگو، یا زبان انگریزی یا ڈاکٹری یا ریاضی و ہیئت یا کوئی معزز عہدہ یا وکالت و مختارکاری وغیرہ کا پاس حاصل کر لو اور وحی الٰہی میں تحریف و خود رائی کی سند دبا بیٹھو۔ قرآن و حدیث کو کبھی نہ دیکھو بلکہ دوسروں کو بھی تضیع اوقات کا فتویٰ سنا دو اور جب کوئی ضرورت یا جدید خیال پیش آئے تو نہایت آزادانہ رائے زنی کر دو۔ خالق و مخلوق کسی کی موافقت کا انتظار اور مخالفت کی پروا نہ کرو۔ زبان عربی سے ناواقفیت ہو تو ترجمہ دیکھ لو یا کسی سے پوچھ لو۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علاوہ ازیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے تو اہل کتاب اپنی کتابوں میں انھیں مواقع میں تحریف کی نجاست میں ملوث ہوتے تھے جہاں اپنی اغراض فاسدہ کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نظر آتی تھی۔ جیسے زنا،

کی سزا رجم۔ اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور ان کے اتباع کا حکم۔
اور اب ہم اہل اسلام کے اندر یہ مرض مہلک ایک دریائے شور کی طرح ایسا پھیلا ہوا ہے کہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور اوضاع سے لے کر عادات تک کوئی اس کی تلخی سے بدشواری خالی رہ سکے گا گویا وحی الٰہی میں ایسی آزادگی کے ساتھ رائے زنی کرنا مدارِ لیاقت اور معیارِ عقل و کمال ٹھہر گیا ہے۔ ضرورت کی بھی ضرورت نہیں ؎

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　سعدی از دست خویشتن فریاد

اور اسی پر بس نہیں بلکہ مقام ترقی میں احادیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات پر ایک طرف سے غیر معتبر ہونے کا فتویٰ لگایا جاتا ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ارشاد (انتم اعلم بامور دنیاکم) کی وجہ سے تمام احکام متعلقہ معاملات کو امور دنیا میں شمار کر کے ہر ایک خود رائے، ہوا پرست خاتم المرسلین اور قائل (اوتیت علم الاولین والآخرین) کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اعلم کہنے کو تیار ہے۔ حضرات صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین اور جملہ صلحاء و صدیقین کی تو اب حقیقت ہی کیا رہ گئی۔ افسوس ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے　　پیدا کئے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

اب انصاف و فہم سے کام لیجئے تو اسلام کی ضرر رسانی میں دونوں فریق مذکور برابر ہیں، فریق اول نے جو وحی الٰہی کی صاف صاف تکذیب کی۔ اور فریق دوم نے جو اپنی ہوشیاری اور دینداری سے تاویلات و تحریفات کر کے نصوص کا وہ مطلب نکالا جو اغراض شارع کے بالکل خلاف ہے یہ دونوں امر اسلام اصلی کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ایک دوسرے کی نظیر ہیں ؎

تفاوتِ قامت یار و قیامت میں ہے کیا مومن　　وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

بلکہ چشم بصیرت ہو تو دوستوں کے یہ عنایات دشمنوں کے ستم سے بدرجہا زائد ہیں۔ اور گوش حقیقت نیوش ہو تو اسلام زبان حال سے بآواز بلند کہہ رہا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نمی نالم کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد
بلا ہائے کہ شد نازل ز دست دوستاں آمد

منصف فہیم بالبداہت سمجھتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تعلیم زبان و لغات کے لئے تشریف نہیں لائے بلکہ امتیوں کو انھیں کے محاورات میں ہدایت اور تعلیم احکام فرماتے ہیں جو زبان ان کے اندر پہلے سے شائع ہوتی ہے اور سیدھے سادھے طرز میں جو کہ تعقیدات اور تکلفات کے اسلوب سے بمراحل دور ہے وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ خود ارشاد صریح موجود ہے اور قرآن شریف کو مواقع کثیرہ میں (مبین) فرمایا ہے تو اب قرآن مجید کے معنی خلاف لغت و استعمال عرب لینا یا خلاف صحابہ تابعین اور دیگر عرب العرباء کے اس کے مطلب کو چیستان بنانا بیشک اسی نظر سے دیکھا جائے گا جیسے کوئی ہندی، یورپی کابلی صرف و نحو کے دو چار رسالے دیکھ کر امرء القیس اور لبید کو اصلاح دینے کے لئے بیٹھ جائے۔ بلکہ اس سے بھی کمتر۔

اہل اہواء کو اس خطاب کا مستحق صرف اتنی ہی بات نے بنایا ہے کہ انھوں نے اپنی رائے کو امام بنا کر اور اپنی اغراض کو نصب العین۔ کر کر احکام وحی کو اس کے ساتھ کھینچنا چاہا اور کسی کے وفاق و خلاف کی پرواہ نہ کی اور نقل و عقل میں جب کشمکش پیدا ہوئی تو انھوں نے بزدل عقل اپنی ناقص عقل کو سب پر دور رکھا اور نصوص یقینیہ میں تاویلات ناروا اور طرح طرح کی حیلہ سازی سے کام لیا۔ (افادات محمود صـ ۱۲ و ۱۳ و ۱۴) ثم کلامہ[1]۔

کتب تفسیر و حدیث اور تجوید و قراءت سے قرآن پاک کی قراءت و تلاوت کے بارے میں اختلاف روایات کے متعلق چودہ قراءتیں ثابت ہوتی ہیں جن میں سے سات قراءتیں (قراءات سبعہ) متواتر ہیں قرآن پاک کا نزول ان سبعہ قراءات پر ہوا ہے = اِنَّ ھٰذا

---

[1] شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کے دو متبرک علمی بلند پایہ مضمون کے نام سے (عظمت وحی اور لا ایمان لمن لا امانۃ لہ) افادات محمود کے نام سے حضرت شیخ الہند کے جانشین استادنا المحترم مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے ایک رسالہ کی شکل میں شائع فرماتے تھے مندرجہ بالا سطور پہلے مضمون سے اخذ کی گئی ہیں۔ اور درحقیقت میرا یہ تمام مضمون بھی ان ہی کے انفاس طیبہ و انوار قدسیہ کے حسنات و برکات کا ایک شمۂ فیض ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیمِ صبح تیری مہربانی ہے

الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ۔ وَعَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍؓ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ یحب ان یقرء القرآن کما انزل اخرجہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ۔ وَیُؤَیِّدُہٗ قولہ تعالے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ

(ملا علی قاری مصری ص۲۱)

ان ساتوں قراءتوں کے تواتر و قراءت اور قرآنیت پر اجماع امت ہے اور یہ ساتوں قراءتیں بالاتفاق قوی ہیں اور جمہور امت کا معمول بہا ہیں۔

یہ ساتوں قراءتیں سات اماموں سے جن میں سے ہر امام کے دو راوی اور شاگرد ہیں بطریق تواتر مروی ہیں۔ گویا قراءاتِ سبعہ سات اماموں کے چودہ راویوں سے منقول ہیں

ان سبعہ قراءات میں سے ہندوستان اور اکثر اسلامی ممالک میں صرف ایک بزرگ امام عاصمؒ کوفی کی قراءت بروایت ان کے ایک شاگرد امام حفص کوفیؒ کے مشہور و مروج ہے باقی تیرہ اماموں کی قراءات کے جاننے اور قرآن شریف کو ان تیرہ روایات کے مطابق پڑھنے والے ہم مسلمانوں کی قرآن پاک کی طرف سے غفلت کے سبب بہت کم ہیں۔ حالانکہ ان کا جاننا اور ان کے مطابق قرآن شریف پڑھنا بالاتفاق جائز و صحیح اور قرآن پاک کے پڑھنے کا ارادہ کرنے والے کے لئے ضروری اور مُتحتّم ہے۔

چودہ قراءتوں میں سے تین قراءتوں کے تواتر میں ضعف و اختلاف ہے اور یہ تین قراءتیں قراءات سبعہ کی طرح مشہور نہیں ہیں لیکن پڑھنا ان کا بھی بہرکیف جائز و صحیح ہے۔ اور یہ سب قراءات عشرہ کہلاتی ہیں ان میں کسی ایک قراءت یا روایت کا انکار قرآن کا انکار ہے۔

غیث النفع ص۶ میں ہے وَھٰذِہِ الْاَحْرُفُ السَّبْعَۃُ دَاخِلَۃٌ فِی الْقِرَاءَاتِ الْعَشَرَۃِ الَّتِیْ بَلَغَتْنَا بِالتَّوَاتُرِ۔

اور چودہ قراءتوں میں سے چار قراءتوں کا درجہ روایتِ احاد سے زیادہ نہیں

ہے اور ان کا پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ ان کی قرآنیت قطعی نہیں ہے قرآن شریف کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ قراءت و تلاوت کے اسی انداز اور کیفیت کے ساتھ ہر زمانہ میں بطریق تواتر نقل ہوتا چلا آیا ہے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر بتایا اور سنایا تھا اسی کیفیتِ ادا کا کامل اتباع قرآن شریف پڑھنے کا ارادہ کرنے والے ہر مسلمان پر واجب ہے ورنہ کیا عرب اور کیا عجم اپنی زبان کو قرآن پاک میں غلطی اور خطا سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

قراءاتِ عشرہ جن کا پڑھنا جائز اور درست ہے اور جن کا انکار قرآن کا انکار ہے ان میں سے صرف امام عاصم کوفیؒ کے شاگرد و راوی امام حفص بن سلیمان کوفیؒ کی روایت پر ہندوستان میں قرآن شریف پڑھنے کا معمول ہے

امام عاصم ابن ابی النجود جلیل الشان تابعی ہیں آپ نے زر بن حبیش اسدی اور عبداللہ ابن حبیب سلمی سے اور ان دونوں نے سیدنا عثمان۔ سیدنا علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے اور ان سب صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم پڑھا، سیکھا اور یاد کیا ہے اور پھر بعینہ اسی طرح طبقۃً بعد طبقۃٍ ہم تک پہنچا ہے قراءات متواترہ کی قراءت اور ان کے ثبوت وصحت کا دارومدار تین ارکان پر ہے۔

(۱) عربیت یعنی عربی کے صرف ونحو، بلاغت ومعانی لغت وغیرہ کی مطابقت

(۲) رسم خط عثمانی کی موافقت۔

(۳) صحیح اور متواتر اسناد سے ان کا ثبوت۔

طیبۃ النشر میں امام جزریؒ نے لکھا ہے۔

فکل ما وافق وجہ نحو ۔۔۔ وکان للرسم احتمالا یحوی

وصح اسنادا ھو القرآن ۔۔۔ فھذہ الثلاثۃ الارکان

اس مضمون کی تمام تفصیلات کو ذہن نشین کرنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت اور اس کا مطالعہ کیجئے۔ مطالعہ کہتے ہیں واقفیت پیدا کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی چیز کو دیکھنا قرآن پاک کو کسی وجہ سے بھی مثلاً اس کے الفاظ وعبارت یا اس کے مطالب ومضامین کی وجہ سے یا اس پر نکتہ چینی اور اعتراض کے خیال سے کھولئے بلکہ اس کو صرف اس لئے مطالعہ کیجئے یا تلاوت کیجئے اور پڑھئے کہ وہ ہم پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور ہمارے اندر کیا اثر پیدا کرتا ہے، الفاظ میں جو تاثیر ہے وہ تلاوت اور مطالعہ سے معلوم ہوگی اور یہ تلاوت ومطالعہ ممد ومعاون ہوگا تدبر وفہم معنی کے لئے اور معانی کی تاثیر سے تعمیلِ احکام کی قوت حاصل ہوگی اگر ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ہم قرآن کے اثر کی کیفیتیں حاصل کریں اور اس کے علم وہدایت کی تاثیریں اپنے اندر بسائیں تو اس کی تلاوت (اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ) اور اس کے فہم وتدبر (اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ) اور اس کے ہدایات واحکام کی تعمیل (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ) (فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ) کے لئے اس کی اثر اندازی اور اپنی اثر پذیری سے ظاہر وباطن کو نورانی بنائیں۔ توفیق ربانی خیر رفیق اور شامل حال ہوگی۔

مجذوب سندھی کی چند الہامی باتیں

(سعید احمد اکبر آبادی)

کسی قوم یا ملک کے معاملات و مسائل پر جو لوگ غور کرتے اور اس کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو پیش نظر مشکلات و معاملات کا حل سوسائٹی کے عام قوانین اور مروجہ عوائدِ رسمیہ کی حد بندیوں کے اندر محصور رہ کر سوچتے ہیں اور اس بنا پر ان کی زبان و قلم سے کبھی کسی ایسے فکر کا ترشح نہیں ہوتا جو لوگوں کے عام معتقداتِ مذہبی و افکارِ قومی کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا کر سکے اس قسم کے حضرات سچ مچ غالب کے اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں　　　پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اس کے برخلاف مفکرین کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو انقلابی ذہن سے ان مسائل کا حل سوچتا ہے اور اگر اس حل کی راہ میں پرانے اور مروجہ رسوم کی کسی خاص ہئیت یا وضع کو صدمہ بھی پہنچتا ہے تو وہ اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتا چونکہ بہرحال اپنے ماضی کا قدرتی اور طبعی نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس قسم کا مفکر ماضی کا مطالعہ بے تعصبی سے غور و خوض کے ساتھ کرتا ہے، اس کی تحلیل کر کے چند اصول متعین کرتا ہے اور پھر ان اصول کی روشنی میں حال اور اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کے معاملات و مسائل پر نگاہ ڈالتا ہے اس سلسلہ میں وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ماضی کی تعمیر کے اصل خد و خال کیا ہیں اس کی ہئیت کذائی میں کن عناصر کو عناصر حقیقی کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں کون سی اور کتنی چیزیں ایسی ہیں جو کسی عمارت میں موسمی تغیرات کی مانند کسی خاص خارجی سبب کے باعث پیدا ہو گئی

ہیں پھر اس دیدہ وری کے ساتھ اُس میں اتنی جرأت و جسارت بھی ہوتی ہے کہ وہ درخت کی غیر ضروری اور فضول شاخوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقت شناسی واقعیت پروری کے چہرہ کو رسم پرستی کے داغ سے محفوظ کر لیتا ہے اُس کی طبیعت کی یہ افتاد اور اُس کے فکر کا یہ طریق اس کو اس درجہ روشن دماغ۔ عالی حوصلہ اور وسیع النظر بنا دیتا ہے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کا فکر بھی بدلتا رہتا ہے اس کی طبیعت میں جمود نہیں ہوتا اُس کا ذہن رجعت پسندی کے عیب سے پاک ہوتا ہے وہ پرانی لکیر کا فقیر نہیں بنا رہتا بلکہ اس کی مثال اس طبیب حاذق کی سی ہوتی ہے جو مرض کی نوعیت اور موسم کے اثرات کے بدلنے سد لنے کے ساتھ نسخہ کے اجزاء میں بھی ترمیم و تنسیخ کرتا ہے اور ہر مرض کے لئے ایک ہی نسخہ اور ایک ہی دوا تجویز نہیں کرتا۔ اس دوسری قسم کا مفکر ہی درحقیقت انقلابی مفکر کہلاتا ہے اور پہلی قسم کے مفکر کو رجعت پسند کہنا چاہئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں اسی دوسری قسم کے واحد انقلابی مفکر تھے اور اپنی اس حیثیت میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کے علاوہ اس دور میں جتنے مسلمان زعما اور مفکر پیدا ہوئے وہ سب مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر خداوندان جمعیت علما تک اپنے علمی و عملی کمالات و اوصاف کے باعث مسلمانوں کے خواہ کتنے ہی لایق تعظیم و احترام رہنما ہوں لیکن افسوس ہے انھیں انقلابی مفکر نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا چونکہ انقلابی مفکر کے ذہن میں جمود نہیں ہوتا اور وہ عوائد رسمیہ کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر معاملات و مسائل پر غور کرتا اور اُن کا حل سوچتا ہے اس لئے ابتداءً سوسائٹی کا مزاج اس کے فکر کو قبول کرنے سے عمومی طور پر انکار کرتا ہے اور رجعت پسند و قدامت پرست طبائع اس پر سب و شتم کی بوچھار شروع کر دیتی ہیں۔ مذہب کی زبان میں گفتگو کرنے والے اس کو ملحد اور زندیق کہتے ہیں، سماجی آداب کی اصطلاح میں اس کو رند مشرب یا آزاد خیال کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی عظمت کا انکار نہیں

دوسرے لفظ یہ بودو تو ... باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ کبھی دبے دبے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے مجذوب یا دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو ان کے سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و عملی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں نے بھی کبھی اُن کو مجذوب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی اس مقالہ کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذوب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے انکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی قریب کی تاریخ کے تمام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح ایک کامیاب ترین بین الاقوامی دستورِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظامِ زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیرِ تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہوگئی تو اس پر خاکسار مؤلف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذوب یا دیوانہ کہا تھا آج اس کی پیشین گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک "مجذوب کی بڑ" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں کس کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں انھیں کیوں کر اپنے مقصدیوں میں ناکامی ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی ذہن کا مفکر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے ساتھ قدم اٹھانے کے ساتھ اپنے فکر کا طریق اور فکر کا ذہن بدلتا رہتا ہے واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس کے

فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے کراچی اُترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلق خاطر کے باعث ندوۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لاتے تھے اور مختلف عنوانات و مباحث پر گفتگو فرماتے تھے، ایک دن ارشاد ہوا "میرے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی" میں نے کہا "مولانا! جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کرسکیں گے؟" مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا "ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا" پھر پوچھا گیا مگر مولانا امریکہ اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا "آئڈیا لوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شاطرانہ چالبازی کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملالیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا "ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قایم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہرحال

...بے ہودہ ... کے باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ
دبے دبے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے مجذوب یا دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا عبید اللہ
سندھی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو ان کے
سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و عملی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں نے
بھی کبھی اُن کو مجذوب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی
اس مقالہ کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذوب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی ...
قریب کی تاریخ کے تمام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی
حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح ایک
کامیاب ترین بین الاقوامی دستورِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے
زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظامِ زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان سب
سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیر تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہو گئی
تو اس پر خاکسار مؤلف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذوب یا دیوانہ کہا
تھا آج اس کی چند پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک "مجذوب کی بڑ" سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتی تھیں کس کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم
ہوگا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں انھیں
کیوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی
ذہن کا مفکر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کو دیکھ لینے کی
حیثیت سے فکر کا طریق اور محاذ بھی بدلتا رہتا ہے۔ واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس...

فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے کراچی اترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلق خاطر کے باعث ندوۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لاتے تھے اور مختلف عنوانات و مباحث پر گفتگو فرماتے تھے ایک دن ارشاد ہوا "میرے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی" میں نے کہا مولانا! جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟" مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا "ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا" پھر پوچھا گیا مگر مولانا امریکہ اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا "آئڈیالوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شاطرانہ چالبازیوں کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملالیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا "ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قائم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہرحال

فاشزم کے مقابلہ میں بہتر ہے روس کا نظام کمونزم ہے جو آئندہ چل کر تاریخ اور وقت کے طبعی تقاضہ کے باعث ساری دنیا کا نظام بننے والا ہے اس ترتیب کے اعتبار سے ہونا یہ چاہئے کہ پہلے فاشزم ختم ہو جو ان تینوں میں سب سے زیادہ برا نظام ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمونزم میں جنگ ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں جو صالح تر نظام ہوگا وہ باقی رہ جائے گا اور اس کا حریف ختم ہو جائے گا۔

یہ گفتگو عصر اور مغرب کے درمیان شام کی چاء پر ہو رہی تھی جو کچھ دیر کے بعد رفت گذشت ہوگئی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی جنگ شروع ہوتی۔ ہٹلر کی فوجیں طوفانی برق دباراں کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ مشرقی یورپ کے جس ملک کی طرف اس نے رخ کیا وہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس کے قدموں پر گرتا چلا گیا۔ صبح ایک ملک کی باری تھی اور شام دوسرے کی۔ دنیا کے بچہ بچہ کے دل پر ہٹلر کی عظمت اور اس کی ناقابل شکست طاقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ ۲۲ رجون ۱۹۴۱ء کو اتوار کے دن صبح کے تین بجکر ہ منٹ پر ہٹلر نے خود اپنی اور نازی فلسفہ کی موت کی دستاویز پر دستخط کیے اور سوویٹ روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس پر دھاوا بول دیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکر اور فوجی ماہر اس وقت جرمنی کی طاقت سے کس درجہ مرعوب تھے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "۲۵ رجون کے نیوز کرانکل" اخبار نے امریکہ کے مشہور فوجی ماہر میجر فیلڈنگ الیٹ کا ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ سوویٹ روس کی فوجی اور دفاعی طاقت جو کچھ ہے ہم کو معلوم ہے اس کے پیش نظر ہرگز اس بات کی توقع نہیں ہو سکتی کہ روس کی سرخ فوج جرمنی کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکے گی" پھر اسی اخبار میں اس صفحہ پر جو لیڈنگ آرٹیکل نکلا اس میں بھی ایڈیٹر نے لکھا تھا "جرمنی کے مقابلہ میں روس کی شکست یقینی ہے یہ جنگ زیادہ سے زیادہ موسم خزاں تک چلے گی" فوجی ماہرین و مبصرین کے علاوہ خود انگلینڈ میں رائے عامہ کیا تھی؟ ڈین آف کینٹربری اپنی مشہور کتاب

(The Socialist Sixth of world) میں لکھتے ہیں "روس پر جرمنی کے حملہ کے وقت انگلینڈ میں ہر شخص گورنمنٹ اور محکمہ خارجہ کے ذمہ دار افسروں اور عہدہ داروں سے لے کر نیچے طبقہ کے مزدوروں تک ہر اخبار نویس۔ ہر فوجی ماہر اس بات کی توقع کرتا تھا کہ سُرخ فوج کو مکمل شکست ہوگی اور سوویٹ یونین بالکل تباہ و برباد ہو جائیگی

شروع شروع میں ان لوگوں کا یہ خیال جو ایک طرف جرمنی طاقت سے غیر معمولی مرعوبیت اور دوسری جانب روس اور فن لینڈ کی طوالتِ جنگ کے باعث روس کی طاقت کی طرف سے غلط فہمی پر مبنی تھا صحیح ثابت بھی ہوا چنانچہ جرمنی نے روس کے علاقوں کو پامال کرتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۶ ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو جرمنی فوجوں نے ماسکو کے دروازہ پر دستک دی اور ماسکو گورنمنٹ کو وہاں سے منتقل ہو جانا پڑا۔ اب کسی کو شبہ نہیں تھا کہ نپولین بوناپارٹ بھی جس معرکہ کو سرانجام نہیں کر سکا تھا جرمنی کا فیوھرر چند دنوں میں اسے ختم کر کے رکھ دے گا۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مولانا سندھی دفتر برہان میں تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ کا یہ خیال تو صحیح نکلا کہ امریکہ اور برطانیہ کی شاطرانہ چال کامیاب ہوئی اور اُس نے روس کو بھی جرمنی کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا۔ لیکن آپ جو روس کی طاقت کی طرف سے اس درجہ خوش گمان تھے وہ تو واقعات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہا ہے سُرخ فوجیں ہر مورچہ پر پٹ رہی اور پسپا ہو رہی ہیں اور ہٹلر کی فوج اُن کے علاقوں کو روندتی ہوئی بڑھی چلی جا رہی ہے! مولانا کو اپنے دل و دماغ کے مشاہدہ پر ایسا جزم و یقین تھا کہ یہ سُنتے ہی بپھر پڑے۔ اور شیر کی طرح گرج کر بولے "تم بکتے ہو دیکھ لینا روس کو ہرگز شکست نہیں ہوسکتی غریب ہٹلر کو یا کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ روس کی رزرو فوج کتنی کچھ اور کہاں کہاں ہے سائبیریا کے پہاڑوں میں ان کے میگزین ہیں جن کی کسی کو ہوا تک بھی نہیں پہنچی ہے یہ پسپائی تو روس کا خاص طریقۂ جنگ ہے اور ایک فوجی چال کے ماتحت ایسا ہو رہا ہے، جرمن فوجیں

اسٹالن گراڈ تک اسی طرح بڑھتی جاویں گی لیکن پھر وہاں سے پسپا ہونی شروع ہوں گی
سیدھی برلن میں ہی جا کر رکیں گی اور وہاں ہٹلر اور اس کی حکومت کی موت کی آخری رسم
ادا ہو جائے گی" مولانا نے یہ الفاظ اس زور اور جوش و خروش سے ارشاد فرماتے کہ ہم سب
سُن کر چُپ ہو گئے لیکن دل کہہ رہا تھا کہ مولانا کو واقعات و حقایق کے خلاف خواہ مخواہ اپنی
پر اصرار ہے۔ اور اپنی رائے کے سامنے کسی کی کچھ سُنتے ہی نہیں ہیں۔"

بات آئی گئی ہو گئی لیکن معلوم ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد جو کسی وحی یا الہام پر مبنی نہیں تھا
جس کی بنیاد اُن کی عمیق قوتِ مشاہدہ اور گہری بصیرت پر قایم تھی کس طرح حرف بحرف صحیح
ثابت ہوا اگر مولانا انگلینڈ یا امریکہ میں ہوتے اور اُن کا یہ بیان وہاں کے اخبارات میں شائع
ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ لائڈ جارج اور بیون
اونچا تسلیم کر لیا جاتا۔

جنگ میں شرکت اور حکومت کی فوجی مدد

جنگ شروع ہوئی تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں۔ کانگریس مسلم لیگ
جمعیۃ العلماء نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں حکومت کی کوئی مدد نہ کی جائے
نہ اس میں چندہ دیا جائے اور نہ فوج میں بھرتی کے لئے آدمی جائیں لیکن مولانا اس رائے
سخت مخالف تھے وہ برملا اور بڑے زور کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ پالیسی بالکل غلط ہے
اس جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہمارے فاضل اور عزیز ترین دوست
(لفٹننٹ کرنل) خواجہ عبدالرشید صاحب جو مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور شاگرد
بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں جنگ میں جانا نہیں چاہتا لیکن مولانا نے مجھ کو مجبور کیا
فرمایا کہ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔ اگر تم نے تعمیل نہیں کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ دہلی میں ایک
مرتبہ مولانا سے ذکر آیا اور ہم نے پوچھا کہ آپ آخر انگریزوں کی اس ظالم حکومت کے ساتھ
کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں تو فرمایا "میں حکومت کا ہمدرد نہیں بلکہ خود اپنا اور اپنے ملک
کا ہمدرد ہوں لو سنو! بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا

کیونکہ اگر انگریز جیت بھی گئے تب بھی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اور انٹرنیشنل معاملات
وجہ سے وہ اس درجہ کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی ملوکیت قایم نہ رکھ سکیں گے
ر انھیں مجبور ہو کر ہمیں خود مختاری و آزادی دینی ہوگی پس اگر یہ یقینی ہے تو ہمیں ابھی سے نیشنل
ج اور قومی سول اڈمنسٹریشن کا انتظام کرنا اور ان کے لئے نوجوانوں کو تربیت دینا ہے
جی ٹریننگ کی صورت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا
زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوج میں بھرتی کرائیں فرض کرو اگر اس طرح ہم نے ایک لاکھ نوجوان
ج میں بھیجے اور ان میں سے پچاس ہزار کھپ بھی گئے تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے
ہ نو آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے
س کے برخلاف اگر ہم نے جنگ میں عدم تعاون کی منفی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ اس کے
سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لئے ہمیں انھیں زنگ
لودہ کل پرزوں سے کام لینا ہوگا جن سے آج انگریزی اقتدار کی مشین چل رہی ہے اور
س کا جو کچھ انجام ہوگا وہ یہی ہوگا کہ عنوان بدل جائیگا مگر معنون وہ ہی رہے گا۔ قالب مختلف
ہوگا مگر اڈمنسٹریشن کی روح وہ ہی رہے گی اس بنا پر ضرورت ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر فوج
میں بھرتی ہونے والے ہندوستانی نہیں بلکہ ملک کے سچے ہمدرد اور محب وطن اور صحیح الخیال
ہندو مسلمان نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبہ سے ملٹری تعلیم حاصل کریں
کہ اب انھیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کرنی ہوگی۔

اس خیال اور رائے کے اظہار پر ہمارے مجاہدین آزادی نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔
ن کو ٹوڈی کہا، رجعت پسند بتایا۔ حکومت کا پٹھو کہا یہاں تک کہ انھیں دنوں میں جمعیۃ علما ہند
اجلاس لاہور میں ہوا اور مولانا وہیں شیرانوالہ میں قیام پذیر تھے تو ان لوگوں نے مولانا سے
ات کرنی تک گوارا نہیں کی۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر کانگرس کے رزولیوشن۔ جمعیت کے
نتوے۔ اور مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ نوجوان

بھی فوج میں شریک ہو کر ملٹری ٹریننگ نہ لیتا تو آج ہماری جمہوری حکومت کیا کاٹ کی پتلی سے کچھ سوا ہوتی۔

ڈومینین اسٹیٹس | مولانا شروع میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور اس وقت تھے جبکہ کانگرس کے شعور آزادی کے ناخن میں زندگی کے خون کی جھلک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی وہ اسی مشن پر کابل گئے اور دنیا جہان کی خاک چھانتے پھرے لیکن روس، ترکی اور دوسرے ترقی یافتہ آزاد ملکوں کو دیکھنے کے بعد انھوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی رائے بدل لی اور بجائے مکمل آزادی کے ابتداءً آزادی زیر سایہ برطانیہ کے قائل ہو گئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کا بچہ بچہ مکمل آزادی کے جذبہ سے سرشار ہو رہا تھا اور کانگرس کا ہر کھدر پوش اور جمعیۃ و مسلم لیگ کا ہر کارکن سیاست دانی میں اپنے آپ کو چرچل و چیمبرلین سے کم نہیں جانتا تھا اس بنا پر ظاہر ہے مولانا کی اس رائے کو کیا درخور اعتنا سمجھا جا سکتا تھا۔

مگر مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریز دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ قوم ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندوستانی انتہائی پست ماندہ ہیں ان میں نہ تعلیم ہے، نہ سیاسی شعور اور اس کی اہلیت ہے اور نہ عوام میں شہری زندگی کے فرائض و واجبات کا احساس ہے علاوہ بریں ہندو مسلم تعصبات و اختلافات اور دوسرے اسباب کی بنا پر ہمارے قومی کیرکٹر میں چند در چند ایسی خرابیاں اور نقائص ہیں جن پر ایک اجنبی حکومت کے قیام کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے ان حالات میں اگر ہم نے مکمل آزادی حاصل کی تو یک بیک ہمارے کاندھوں پر ایک ایسا بھاری بوجھ آپڑے گا جس کو ہمارے کاندھے اٹھا نہ سکیں گے اور اس سے ملک کی سماجی حالت ابتر ہو جائے گی۔ مولانا کو کانگرس سے اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ اس نے اپنی کوششوں کو صرف انگریزوں کے یہاں سے نکال دینے پر مرکوز رکھا ہے اور اس کے علاوہ ملک کی تعمیر کے اہم کام اس نے پس پشت ڈال رکھے ہیں مولانا فرماتے تھے کہ آزادی کے بعد

یہاں جمہوریت یا عوامی حکومت قایم ہوگی لیکن جس ملک کے عوام شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس نہ رکھتے ہوں وہاں جمہوریت سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ملک میں لبسا اوقات اختلال و خلفشار پیدا ہو سکتا ہے اس بنا پر مولانا کی رائے تھی کہ ہم کو شروع میں آزادی زیر سایہ برطانیہ لینی چاہیئے تاکہ اس مدت میں ہم اپنے عوام کو تعلیم یافتہ کردیں ملک کو صنعتی و حرفتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنا دیں یہاں کی اقتصادی حالت قابل اطمینان ہو جائے اور ملک کے ذرائع پیداوار کا صحیح استعمال کرنا ہم سیکھ جائیں اور رگائے اور سا جھ پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنا بھول جائیں تو پھر اس وقت بیشک ہم کو مکمل آزادی لینی چاہیئے اور ہم اس آزادی کے بہمہ وجوہ محافظ اور نگراں ہو سکیں گے مولانا کا یہ خیال صحیح تھا یا غلط ؟ اور اگر صحیح تھا تو کس حد تک ؟ واقعات کی روشنی میں آپ خود سوچیئے اور غور کیجیے۔

تقسیم ہند | جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے مولانا کٹر کانگرسی تھے اور سب سے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند کی زیر ہدایت افغانستان میں کانگرس کی ایک شاخ قایم کی اور وہاں کی پبلک تک اس جماعت کی آواز پہنچائی۔ وہ متحدہ قومیت کے بھی قائل تھے اور ہندوستان کی وحدت کے معترف بھی تھے لیکن جب ۱۹۳۹ء میں ہندوستان آئے اور یہاں کی سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہندو مسلم عوام کے جذبات و رجحانات کو دیکھا ان کے دلوں کو ٹٹولا اور پرکھا تو وہ تقسیم کے قائل ہو گئے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ تقسیم فی نفسہٖ کوئی اچھی یا ضروری چیز تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات اور ان کی باہمی نفرت و عداوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا کے نزدیک اب اس سے انحراف کرنا ایک اور بڑے فتنہ کو دعوت دینا تھا لیکن اس میں مولانا اس ترمیم کو ضروری قرار دیتے تھے کہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہرگز نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان میں ہندوؤں اور ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنے ملک کے شہری اور شریک حکومت کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہو جائیگا

اور اس سے جو عظیم بربادی آئیگی ایک مدت دراز تک اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ معاشرہ درہم برہم ہو جائیگا اس ملک کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر جائیگا بلکہ مولانا کی رائے تھی کہ تقسیم علاقائی کلچر کی بنیاد پر ہونی چاہیئے جو ہندو اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے اس سلسلہ میں آپ کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ شمالی ہندوستان کا کلچر ہندو مسلمانوں دونوں کا ایک ہے یعنی ایک ہی لباس، ایک سی زبان۔ ایک ہی اندازِ معاشرت۔ لیکن اس میں مسلمانوں کا کلچر غالب ہے۔ اسی طرح جنوبی اور مشرقی ہندوستان کا کلچر ہے جو اگرچہ دونوں فرقوں کا مشترک کلچر ہے لیکن ہندو تہذیب کے عناصر اس میں غالب ہیں مولانا کا خیال یہ تھا کہ اگر اس طرح تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان پورا ہو جاتا ہے اور پھر آپس میں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی نہیں پیدا ہوتی، اپنے اس مخصوص نظریہ کے ماتحت حضرت مرحوم کانگرس کے بھی مداح تھے اور لیگ کے بھی۔ اور ساتھ ہی دونوں کے مخالف بھی۔ کانگرس کے اس لیئے کہ وہ تقسیم منظور نہیں کرتی، اور لیگ کے اس لیے کہ وہ تقسیم بر بناء مذہب کا مطالبہ کرتی ہے اس بناء پر کلچرل اشتراک و مجانست کو بنیاد قرار دیکر آپ نے ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی "سندھ ساگر نربدا ......" کے نام سے بنائی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ اس پارٹی کے ذریعہ کانگرس اور لیگ دونوں سے لڑیں۔ ہا افسوس! کہ ابھی اس ملک کے آسمان پر آزادی کا سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مولا کو پیارے ہو گئے ورنہ آج وہ زندہ ہوتے تو کانگرس لیگ اور جمعیت تینوں کو مخاطب کر کے فرماتے کہ "کفی بنفسك اليوم حسيبا" اور ہم کو یقین ہے کہ کسی کے پاس ان کی بات کا جواب نہ ہوتا۔

مغربی نیشنلزم اس سلسلہ میں ایک اور بات جو مولانا فرمایا کرتے تھے اور جس کو انھوں نے لکھا بھی ہے اور جس کو سن کر ملک کے عوام و خواص ان کو برا بھلا کہتے تھے وہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ٹرکی کی طرح اپنی معاشرت کے پرانے چولے کو اتار کر رکھدے اور مغربی کلچر جس سے وہاں کی قومیت کا خمیر تیار ہوا ہے اسے

اختیار کرے اس بارہ میں آپ کا خیال یہ تھا کہ کلچر خواہ کہیں کا اور کسی ملک کا ہو وہ بہرحال کسی کی میراث اور جائداد نہیں ہوتا۔ اس کی ایجاد کسی نے کی ہو لیکن اگر اس میں کچھ خوبیاں ہیں اور وہ زمانہ کے تقاضہ کے مطابق ہے تو دنیا کی ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے اختیار کرے اور اپنائے اور ایسا کرنے سے کسی قوم کی قومیت فنا نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑی ہو کر اجنبی اور بے میل نظر نہیں آتی۔ چنانچہ آج ایرانی مصری شامی۔ عراقی۔ چینی اور ترکی ہر جگہ کے لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں لیکن پھر بھی ایرانی اور مصری وغیرہ ہی رہتے ہیں کچھ اور نہیں ہو جاتے۔

علاوہ بریں آپ فرماتے تھے کہ اٹھارہویں صدی سے قبل یورپ میں ہندوستان کی طرح ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے جاتے تھے لیکن جب وہاں صنعت وحرفت کی ترقی کا دور شروع ہوا تو اس کی مناسبت سے زیادہ چست اور مستعد لباس پہنا جانے لگا جو آج ہر جگہ رائج ہے پس اگر ہندوستان کو بھی صنعتی ملک بننا ہے اور لازمی طور پر بننا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے پرانی وضع کے ڈھیلے ڈھالے لباس کو خیرآباد کہے اور یورپ کا لباس پہنے حضرت مرحوم اور بھی بہت کچھ فرماتے تھے اور اس ذیل میں ڈاڑھی اور پردہ وغیرہ کے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے جو سوچنے والے دماغ کے لئے کچھ کم اہم نہیں ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں نہ ان کے بیان کرنے کی گنجائش ہے اور نہ مناسب ہے البتہ اپنی کتاب میں ان سب چیزوں پر نہایت مفصل گفتگو کروں گا۔ البتہ موقع کی مناسبت سے اس سلسلہ میں مولانا جو ایک اہم نکتہ بیان کرتے تھے اس کا ذکر ضروری ہے فرماتے تھے کہ ”مغربی نیشنلزم کا اختیار کرنا خاص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اور بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد ہندو مسلمانوں کے تہذیبی تعصبات مٹ جائیں گے اور دونوں ایک دوسرے سے دست وگریباں نہیں ہوں گے۔ ورنہ اگر ایسا نہیں ہوا تو آزادی کے بعد دونوں فرقوں میں تہذیبی جنگ شروع ہو جائیگی اور چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے ان کو شکست

ماننی پڑے گی۔ ہندو کہیں گے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب اور کلچر اختیار کرنا چاہئے۔ اسی وقت وہ صحیح معنی میں ہندوستانی ہو سکتے ہیں مسلمان کچھ اس کی مخالفت کرینگے لیکن آخر انھیں شکست ہو گی اور پھر وہ ہندو کلچر اور تہذیب کو اختیار کر کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائینگے جس سے ان کی خودی فنا ہو جائے گی۔ اس لئے دھوتی اور پاجامہ۔ چپل اور جوتہ کرتہ اور شیروانی کے نزاع کو حل کرنے کی بہتر صورت یہی ہے کہ دونوں کو ہی خیر آباد کہہ دیا جائے اور ٹرکی کی طرح اپنا قومی لباس بھی مغربی لباس بنالیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلمان معاشرت اور لباس کے اعتبار سے ایک ہوں گے اور متحدہ قومیت کی وجہ سے انھیں ایک ہونا بھی چاہئے اور اس کے باوجود ان کو یہ خیال نہیں ستائیگا کہ ہندوؤں نے تہذیبی اعتبار سے مسلمان کو فتح کر لیا اور اس پر اپنے کلچرل اقتدار کی گرفت کو سخت کر دیا ہے مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان اسلامی آداب معاشرت کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے مغربی کلچر کو بآسانی کسی قدر تراش خراش کے ساتھ اختیار کر سکتے ہیں۔ رومن کیرکٹر ان کا یہی خیال زبان کے رسم الخط کی نسبت تھا۔ فرماتے تھے کہ ہندو مسلمان کا جھگڑا بولی پر ہرگز نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں لیکن اصل نزاع رسم الخط کا ہے مسلمان ہندوستانی کو فارسی رسم الخط میں لکھنا چاہتے ہیں اور ہندو دیوناگری میں اس لئے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آزادی ملنے سے قبل ہی رومن رسم الخط کو رواج دیا جائے ورنہ آزاد ہونے کے بعد اکثریت کی طاقت کے گھمنڈ میں ہندو رومن کیرکٹر کو بھی قبول نہیں کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ اردو رہے گی اور نہ اس کا رسم الخط۔

اب آپ مولانا کے ان ارشادات پر غور کیجئے اور جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی روشنی میں سوچئے کہ آج یہ باتیں کس طرح حرف بحرف الہامی باتیں معلوم ہوتی ہیں اس کے باوجود مولانا کے ساتھ اپنوں اور پرایوں نے جو معاملہ کیا تھا اس پر ذرا حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ جس ملک میں سیاسی لیڈر شپ کے لئے سب سے بڑی سند جیل جانا ہو اور جہاں پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر گلا پھاڑنا حریت کوشی و تدبر سیاسی کا سب سے بڑا ثبوت ہو وہاں مولانا اسے حقائق آگاہ و حق شناس مفکر کے لئے اور توقع ہی کس برتاؤ کی ہو سکتی تھی!

اُردو ہی ہندوستان کی زبان ہوسکتی ہے

از

(جناب محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ)

"بہن حمیدہ سلطان سے اردو ادب کا کون طالب علم واقف نہیں ہے گھر کے لٹنے پر بھی اُردو کے مریضِ نیم جاں کی سیوا کے لئے اپنے آباء واجداد کی راجدھانی دہلی میں پڑی ہوئی ہیں اور اس کے لئے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جو موجودہ حالات میں شاید مرد بھی نہیں کر سکتے ابھی حال میں انھوں نے اُردو مجلس دلی لٹریری سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے اس انجمن کے صدر پنڈت دتاتریہ کیفی ہیں اور سکریٹری خود ہیں خوشی کی بات ہے کہ انجمن کو با اثر اور ممتاز ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اس انجمن کے ہفتہ وار جلسے ہوتے ہیں اور مختلف قسم کے ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے ہیں مشاعرے بھی ہوتے ہیں محترمہ بہن نے یہ مقالہ اسی انجمن کے اجلاس مورخہ یکم اکتوبر ۴۹ء میں پڑھا تھا جو اب برہان میں شائع کیا جا رہا ہے اب اگرچہ زبان کی بحث لیداز وقت ہے تاہم اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور ایک حقیقت کو جب بھی کہا جائے وہ بہرحال حقیقت ہی رہتی ہے وقت کے بدلنے سے بدل نہیں جاتی! (اڈیٹر)

جس زمانے میں ہم سانس لے رہے ہیں اسی میں ایک تہذیب ٹوٹ رہی ہے اور ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔

لیکن یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ جو گذر رہا ہے اور جو آرہا ہے اُسے بجا طور پر سمجھا نہیں جا رہا ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بس تنقید کیے چلے جاتے ہیں، ماضی کو چھوڑ کر ہمیں مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے یہ بات ہمارے ذہنوں میں بہت کم آتی ہے۔

پہلے کیا تھا اس کا خیال چھوڑ کر آئندہ کیا ہونا چاہئے یہ سوچنا ہمارا فرض ہے کسی
مریض ذہنیت کے انسان پر غصہ کرنا یا اس کے چڑچڑے پن پر ناک بھوں چڑھانا اسی طرح
بیجا اور غلط ہے جیسے کسی جسمانی مرض میں مبتلا انسان پر غصہ کرنا یا اس سے نفرت کرنا خود
بیماری سے بچنے کی کوشش کرنا الگ چیز ہے جس طرح انسان پیدا ہوتے تندرستی کا سکھ اٹھا
بیمار پڑتے اور مرجاتے ہیں اسی طرح قومیں بھی تندرستی کا سکھ اٹھاتی بیمار پڑتی اور مرتی ہیں
جو حالت جسمانی بیماریوں کی ہے وہی اخلاقی بیماریوں کی بھی ہے ہمارا ملک اس وقت تعصب
کے خطرناک مرض میں گھر گیا ہے اور یہ دبا اس بُری طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے کہ
دل سے صاف دل انسان اس اخلاقی مرض سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا تعصب کے جذبے
نے ہر چھوٹے بڑے امیر و غریب پر قبضہ جما لیا سکھ کسی کو بھی نہیں ہر ایک دکھ اور نفرت
آگ میں جل رہا ہے اور اپنی برائی کا بوجھ دوسرے کے سر پر تھوپ رہا ہے یہ صورت حال
ترقی کی نہیں کہی جا سکتی ہمارے اخلاقی سرمائے کا شیرازہ بکھر کر رسوائی کی حد تک پہنچ گیا
دوسرے آزاد ممالک ہماری اس تباہ حالی متعصب ذہنیت اور تنگ نظری کو دیکھ کر ہنس
بھی ہیں اور متاسف بھی لیکن ہم خود کو اوروں کی نظروں میں گرا ہوا محسوس نہیں کر رہے۔

ایک زبان کے مسئلے کو ہی لیجئے کچھ ہی دن ہوئے اس پر اسمبلی میں گرما گرم مباحثے ہوئے
اور خوب ایک نے دوسرے کی پگڑی اُچھالی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی اکثریت کی جیت
اور اقلیت کی ہار لیکن یہ جیت اکثریت کی نہیں اسی تعصب کی ہے جو ہمارے ملک کی جڑ
میں لگا ہوا دیمک کے مانند اس کو کھوکھلا کر رہا ہے آپس کے ان چھوٹے چھوٹے جھگڑوں
بیجا نفاق نے ملک کو تقسیم کرا دیا مگر پھر بھی ہمیں عبرت نہ ہوئی اور ہم پھر لڑنے جھگڑنے لگے

ان جھگڑوں کا بیج اس وقت پڑا جب کہ پچھلی صدی کا آخر اور موجودہ صدی کا شروع
تھا سب سے زیادہ خوفناک صورت اس رجحان نے اس وقت اختیار کی جب کہ چند
دل مگر نا عاقبت اندیش محبان وطن نے ہندی کے نام سے ایک ایسی زبان بنانے کی

رشش کی جو ابھی تک ہندوستان کے کسی ضلع یا حصے کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے
وراس تفریق نے عوام کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکادی جس وقت سے ان لوگوں نے
ن کے ہاتھ میں ملک وقوم کی باگ ڈور ہے اپنا رجحان اس طرف ظاہر کیا ہے اس وقت
سے تو صورت حالات بہت نازک ہوگئی ہے اس زبان کے قضیے نے حالات کے بگاڑنے
ور ملک کے تقسیم کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور اگر آج یہ کہا جاتا ہے "کہ
صاحب لیجئے دیکھئے بھلا ایسے ملک میں پھولنے پھلنے کے کیا ذرائع ہیں جہاں زبان بھی
دونوں فرقوں کی علیحدہ کر دی گئی تو ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہندی اردو کو الگ
رکھے گویا دو قوموں کا وجود الگ تسلیم کر لیا گیا جو کانگریس کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔

اردو جو عرب یا ایران و کابل سے ٹٹو پر لد کر نہیں آئی بلکہ ہندو مسلمانوں کے باہمی
یل جول، رابطہ و محبت کی سب سے بڑی یادگار ہے جس کی ایک ماں سنسکرت بھی ہے
س کو اس کے ملک سے کان پکڑ کر نکالا جا رہا ہے صرف اس لئے کہ یہ ہماری مشترکہ سماجی
زندگی کے مشترکہ کلچر کا سب سے بڑا ستون ہے اس ملک کے رہنے والے مذہبی اختلاف
کے علاوہ اپنے اور تمام معاملات میں اک عام مشترکہ سماجی زندگی رکھتے تھے، یہی مشترکہ زبان
بازاروں میں، میلوں میں، کھیلوں کچہریوں میں تعلیم میں، صنعت و حرفت میں، علم و فن میں،
باس میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں اک قوم کے نظریے کو واضح کرتی تھی اب
یا چیز ہے جو ہمیں مشترک رکھ سکتی ہے ہمارے مذہب الگ، ہمارا کلچر جدا، ہماری زبان
الگ یہ ملک جو اک زبان ہونے کے باعث عہد مغلیہ سے لے کر اس وقت تک اپنے
مدارک شان اور خوبصورتی کے ساتھ اک مشترکہ سماجی زندگی رکھتا تھا وہ دراندازوں نے
زبان کی تقسیم کے بعد ختم کر دی ہیں یہ تو نہیں کہتی کہ زندگی اور ادب کا مجھے ایسا خاص تجربہ حاصل
ہے جس کی بنا پر کوئی حکم لگا سکوں ملک میں بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو زبان کے
سئلہ پر مجھ سے بہتر طریقہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن کچھ تجربہ گردوپیش کے حالات اور

تقاضوں کا مجھے ضرور ہے میں نے ہندی کے ادیبوں اور شاعروں میں سے چند کو قریب سے دیکھا ہے ہندی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے پڑھے ہیں ہندی کی کوتائیں سنی ہیں یہی نہیں بلکہ مجھے ہندی ادب سے محبت ہے ہندی کے گیتوں کا لوچ اور نسائی محبت محبت سے بھرپور ترنم مجھے بہت پسند ہے ہندی کے مدھم اور ہلکے ہلکے بولوں کو میں اکثر اپنی کہانیوں میں جگہ دیتی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ اک شاندار قوم محض زبان کے مسئلے پر الجھ کر رہ جائے اس طرح ہمارا مستقبل کبھی سدھر نہ سکے گا میں ہندوستان کے تمام فرزندوں کو ایک قوم کی حیثیت میں دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ زبان کی تفریق ختم کردی جائے جو لوگ اردو کے خلاف ہیں وہ ہماری قومی وحدانیت پر ایسی کاری ضرب لگا چاہتے ہیں جس سے پھر کبھی پنپنا مشکل ہوگا یہ مرا کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے اردو کے بجائے ہندی کرنے میں آج کل زمین و آسمان ایک کردیئے ہیں وہ حالات کے رخ کو نہیں پہچانتے اپنی ان الٹی سیدھی لن ترانیوں سے انھوں نے ملک کو سخت نقصان پہنچانے پر کمر باندھ لی ہے اردو جیسی قوت آخذہ ہندی میں کیسے اور کہاں سے آجائے گی اور کس جادو کی چھڑی سے ہندی کے دامن کو بھی ان خزانوں سے بھر دیا جائیگا جن سے اردو کا دامن مالامال ہے۔

کسی کا دل دکھانا مقصود نہیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اردو کی برابری ہندی ابھی کبھی بھی نہ کر سکے گی یہ بات دوسری ہے کہ اردو شعراء کے تمام پاکیزہ خیالوں کو اور بلند تصورات کو ہندی کا جامہ پہنا کر پیش کیا جائے مقابلے کا سوال نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار کرنا ہے اقبال اور جوش کو چھوڑ کر اردو زبان کے نئے دور نے جو شاعر پیدا کیئے جن کی آتشیں نظموں سے آگ کا طوفان اٹھ رہا ہے ان کا مقابلہ بھی ہندی شاعری ابھی نہیں کر سکتی۔

یہ میں مانتی ہوں کہ موجودہ دور کی ہندی شاعری میں تلاش، تجربہ، تصادم، بغاوت، بندش، مصیبت وہ تمام جذبات پائے جاتے ہیں جو آج کل ملک کے ہر انسان کے دل

ہیں مگر وہ طاقت اور جوش اس میں نہیں جو آج کل کی اُردو شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔

ہر عہد کا شاعر و ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس دور کے اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نظم و نثر سے ہندوستانی قوم کو موت سے دست و گریباں ہونے کی تعلیم دے کر ان کی نزاکتوں اور نڈھال زندگی کو جو طاقت بخشی وہ سیاست والوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ہندوستانی ذہنیت کے تبدیل کرنے میں اردو کے مشہور شعرا نے جو خدمات انجام دی ہیں اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان شعراء نے آزادی کی راہ میں اس طرح قدم بڑھایا جس طرح ہمارے قومی رہنماؤں نے۔ چند شعرا کے اشعار پیش کرتی ہوں۔ اقبال نے نعرہ لگایا۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوشؔ نے حکم دیا۔

کلاہِ خواجگیٔ کائنات کج کر کے — نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر

فراقؔ نے پیغام دیا:

اٹھ پڑے ہو تو اہلِ ہند — بڑھتے ہی چلو صبح و شام
بڑھتے ہی رہنا کام ہے — نام قیام کا نہ لو
کھوٹی نہ ہو رہِ حیات — تم ہو مسافرِ دوام
تم سے یہی پیام ہے

دراصل اُردو زبان نے انھی اجزا کو قبول کیا جو اس کی زندگی کے لئے ضروری تھے جو لوگ سنسکرتی عناصر کی زبان میں بھرمار چاہتے ہیں اس سے کوئی زندہ زبان نہیں پیدا ہو سکتی۔

میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جس زبان کو رائج کیا جارہا ہے اس میں ہرگز وہ وسعت نہیں پیدا کی جاسکتی جو ایک زندہ اور کارآمد زبان کے لئے بے حد ضروری ہے ہندی کے لئے سنسکرت کو سرچشمہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے خود سنسکرت ہزار ہا سال سے مردہ زبان چلی آرہی ہے اس دور میں انسانی سماج نے جو کچھ ترقی کی ہے اور زبانوں میں جن ذخیرں کا اضافہ ہوا ہے ان سے سنسکرت یکسر محروم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی زبان کو سرچشمہ بنا کر جس کی ناداری کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کیونکر کوئی اچھی قابل قبول زبان بنائی جاسکے گی پہلے ہندی اس معیار تک تو پہنچے جو دور حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہو اس کے بعد پھر کہیں اس کی تعمیر سنسکرت کے ستونوں پر قایم کی جاسکتی ہے۔

اس کے جواب میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ انقلابی تصورات کو کتنے ہندی شعرا نے اپنے کلام میں جگہ دی اور کن ہندی شعرا کا کلام حکومت برطانیہ نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ضبط کیا یہ فخر بھی اردو ادبا و شعرا کو حاصل ہے ایک جانب انھوں نے عوام کو آزادی کا راستہ دکھایا دوسری جانب خود قید و شدائد کے مصائب بھگتے۔

یہ شعر اردو کے ایک شاعر ہی نے کہا تھا۔

طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی   مشق سخن بھی جاری ہے چکی کی مشقت بھی

آج آزاد ہندوستان اپنے ان بہادروں پر ناز کرتا ہے اردو ادب کی ہر دلعزیزی شہروں اور پڑھے لکھے لوگوں تک ہی نہیں کسانوں، مزدوروں تک ہے۔ انقلاب اور وطن پریم کے پیغام دیہاتوں تک پہونچانے کا سہرا بھی اردو کے سر پر ہی ہے۔ سید مطلبی فریدآبادی کی وہ نظم جس کا عنوان "کسان" ہے اس کے دیباچے میں ڈاکٹر عبدالحق تحریر فرماتے ہیں۔

"پوری کتاب خالص دیہاتی زبان میں ہے نئی ہندی کے جو حامی یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ زبان اس لیے ہم نے اختیار کی ہے کہ ہماری آواز دیہاتوں تک پہنچے، اسے پڑھیے اور دیکھیے ان کی زبان نہ دیہاتیوں کی ہے نہ شہریوں کی۔ مطلبی کی شاعری ایسی دیہاتی زبان میں ہے جسے گاؤں والے سمجھ سکتے ہیں"

دیکھئے دیہاتی زبان میں پنگھٹ کی پنہیاری کی تصویر یہ شاعر نے اپنی نظم میں کتنی اچھی کھینچی ہے۔

پنگھٹ کی پنہاری چالی ۔۔۔ باندھے سیلی ساری جالی
سر پہ کلسہ کلسے پہ گاگر ۔۔۔ ہاتھ میں نیجو مونجھ کی بابر
گھونگٹ میں مکھڑا یوں دمکے ۔۔۔ بادل میں جوں چندا چمکے
مرگ سی نینوں میں ڈوری کالی ۔۔۔ ہونٹوں پہ ناگر پان سی لالی
ناگوری نا کالی ابلا ۔۔۔ کبوری تیلی بالی ابلا
تیلی کمر لچکاتی جاوے ۔۔۔ کمر تلک ناگنی لہراتی جاوے
کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ۔۔۔ لپک جھپک پنگھٹ پر آئی

اس بولی ہی کو جنتا کی بولی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ شہروں کی زبان نہیں یہ متمدن شاعری اور علمی تحریروں کی زبان نہیں بن سکتی سخت فارسی آمیز یا سنسکرت ملی ہوئی بولی اگر دیہاتوں میں بولی جائے تو وہاں کے رہنے والے دونو کے سمجھنے سے محروم رہیں گے لیکن اردو کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ داغ کی غزلیں کبھی کبھی چوپالوں میں بھی گائی جاتی ہیں گاؤں کی بہو بیٹیاں شادی بیاہ برسات میں ہر خوشی کے موقعہ پر اردو کے گیت گاتی ہیں تانگے والے ہر راہ چلنے لڑکے کی زبان پر اردو شعرا کا کلام ہوتا ہے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بات کا تبنگڑ بنا کر یہ اردو ہندی کا قصہ ہی کیوں کھڑا کر دیا گیا دو سگی ماجائی بہنوں میں لوگوں نے جوڑ توڑ لگا کر زمین و آسمان کا فرق کر دیا تھوڑا سا جو باہمی اختلاف تھا اس کو تو آپس کے میل جول سے دور کیا جا سکتا تھا اردو کے وجود میں آنے کے متعلق کیفی صاحب نے اپنی مشہور کتاب کیفیہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"محمود غزنوی اور اس کے پہلے اور عین بعد کے تاریخی سوانح سے قطع نظر جو مسلمان فاتح ۱۱۹۱ء میں اور اس کے بعد آئے وہ ہندوستان میں قبیلے اور حسب و نسب کے اعتبار

میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جس زبان کو رائج کیا جا رہا ہے اس میں ہرگز وہ وسعت نہیں پیدا کی جا سکتی جو ایک زندہ اور کارآمد زبان کے لئے بے حد ضروری ہے ہندی کے لئے سنسکرت کو سرچشمہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے خود سنسکرت ہزار ہا سال سے مردہ زبان چلی آ رہی ہے اس دور میں انسانی سماج نے جو کچھ ترقی کی ہے اور زبانوں میں جن ذخیرل کا اضافہ ہوا ہے ان سے سنسکرت یکسر محروم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی زبان کو سرچشمہ بنا کر جس کی ناداری کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کیونکر کوئی اچھی قابل قبول زبان بنائی جا سکے گی پہلے ہندی اس معیار تک تو پہنچے جو دور حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہو اس کے بعد پھر کہیں اس کی تعمیر سنسکرت کے ستونوں پر قایم کی جا سکتی ہے۔

اس کے جواب میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ انقلابی تصورات کو کتنے ہندی شعرا نے اپنے کلام میں جگہ دی اور کن ہندی شعرا کا کلام حکومت برطانیہ نے ڈیفنیس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ضبط کیا یہ فخر بھی اردو ادبا و شعرا کو حاصل ہے ایک جانب انھوں نے عوام کو آزادی کا راستہ دکھایا دوسری جانب خود قید و شدائد کے مصائب بھگتے۔

یہ شعر اردو کے ایک شاعر ہی نے کہا تھا۔

مشق سخن بھی جاری ہے چکی کی مشقت بھی طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

آج آزاد ہندوستان اپنے ان بہادروں پر ناز کرتا ہے اردو ادب کی ہر دلعزیزی شہروں اور پڑھے لکھے لوگوں تک ہی نہیں کسانوں، مزدوروں تک ہے۔ انقلاب اور دیش پریم کے پیغام دیہاتوں تک پہونچانے کا سہرا بھی اردو کے سر پر ہی ہے۔ سید مطلبی فریدآبادی کی وہ نظم جس کا عنوان "کسان" ہے اس کے دیباچے میں ڈاکٹر عبد الحق تحریر فرماتے ہیں۔

"پوری کتاب خالص دیہاتی زبان میں ہے نئی ہندی کے جو حامی یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ زبان ان کی لیے ہم نے اختیار کی ہے کہ ہماری آواز دیہاتوں تک پہنچے۔ سے پڑھے اور دیکھے ان کی زبان نہ دیہاتیوں کی ہے نہ شہریوں کی مطلبی کی شاعری ایسی دیہاتی زبان میں ہے جسے گاؤں والے سمجھ سکتے ہیں"

دیکھئے دیہاتی زبان میں نیگھٹ کی پنھیاری کی تصویر شاعر نے اپنی نظم میں کتنی اچھی کھینچی ہے۔

نیگھٹ کی پنہاری چالی	باندھے سیلی ساری جالی
سر پہ کلسہ کلسے پہ گاگر	ہاتھ میں نیجو موتجھ کی بابر
گھونگٹ میں مکھڑا یوں دمکے	بادل میں جوں چندا چمکے
مرگ سی نینوں میں ڈوری کالی	ہونٹوں پہ ناگر پان سی لالی
ناگوری نا کالی ابلا	کبوری تیلی بالی ابلا
تیلی کمر لچکاتی جاوے	کمر تنک ناگنی لہراتی جاوے
کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی	لپک جھپک نیگھٹ پہ آئی

اس بولی ہی کو جنتا کی بولی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ شہروں کی زبان نہیں یہ متمدن شاعری اور علمی تحریروں کی زبان نہیں بن سکتی سخت فارسی آمیز یا سنسکرت ملی ہوئی بولی اگر دیہاتوں میں بولی جائے تو وہاں کے رہنے والے دونوں کے سمجھنے سے محروم رہیں گے لیکن اردو کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ داغ کی غزلیں کبھی کبھی چوپالوں میں بھی گائی جاتی ہیں گاؤں کی بہو بیٹیاں شادی بیاہ برسات میں ہر خوشی کے موقعہ پر اردو کے گیت گاتی ہیں، ہر تانگے والے ہر راہ چلتے لڑکے کی زبان پر اردو شعرا کا کلام ہوتا ہے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بات کا تبنگڑ بنا کر یہ اردو ہندی کا قصہ ہی کیوں کھڑا کر دیا گیا دو سگی ماجائی بہنوں میں لوگوں نے جوڑ توڑ لگا کر زمین و آسمان کا فرق کر دیا تھوڑا سا جو باہمی اختلاف تھا اس کو تو آپس کے میل جول سے دور کیا جا سکتا تھا اردو کے وجود میں آنے کے متعلق کیفی صاحب نے اپنی مشہور کتاب کیفیہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"محمود غزنوی اور اس کے پہلے اور عین بعد کے تاریخی سوانح سے قطع نظر جو مسلمان فاتح ۱۱۹۱ئہ میں اور اس کے بعد آئے وہ ہندوستان میں قبیلے اور حسب و نسب کے اعتبار

سے آرین تھے یا زیادہ محتاط رہ کر کہئے وہ ایران کی شائستگی اور تمدن و معاشرت کے رنگ
میں رنگے تھے اور ایرانی اسی تنے کی ایک شاخ تھے جس کی دوسری شاخ ہندی آرین تھے
اسی کلچر کی یگانگی نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاتح اور مفتوح کی مغائرت کو محو کر دیا جب
دو مختلف قوموں کو ایک ملک میں رہنا ہوا تو وہ معاشرتی اور لسانیاتی لین دین کے بغیر ناممکن
تھا اور اس لین دین میں اور اسی یگانگی اور یکجہتی میں جو ہندو مسلمان کی روزمرہ زندگی اور سب
سے زیادہ اردو کی پیدائش میں کار فرما ہوئی کس نے زیادہ فراخ دلی سے کام لیا اس تفصیل پر
جانے کی ضرورت نہیں اس کا تاریخی نظر سے شاندار نتیجہ آپ کے سامنے اردو موجود ہے
اردو کی پیدائش کے ذمہ دار ہندو مسلمان دونوں ہیں اردو کی تدوین اور تنظیم دہلی میں ہوئی
اور یہیں اس کو ادبی حیثیت ملی اردو کو ہندو مسلمان دونوں سمجھتے ہیں اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو
اور پہلا ناشر حضرت گیسو دراز ہیں اردو کی سب سے پرانی غزل جو ملتی ہے وہ ایک ہندو شاعر
تخلص برہمن کی ہے۔ کیفی صاحب کے فرمانے کے مطابق اردو کی ہمہ گیری سے ہی اندازہ ہوتا
ہے کہ اس کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے جن بزرگوں
کی کوشش سے یہ بنی اور پروان چڑھی ہے انھوں نے کچھ اس اٹھان پر اس کو اٹھایا ہے
کہ ہر زبان کے لفظ اس میں آکر اس طرح رچ جاتے ہیں گویا اس کے لئے ہی بنے تھے سماج
اور سامراج دونوں سنسکرت کے لفظ ہیں لیکن اردو دنیا نے ان کو ایسا اپنایا ہے کہ اب یہ
ہمارے لئے بیگانے نہیں رہے اس ملک کے رہنے والوں پر تقریباً ایک ہزار سال سے
اجنبی کا غلبہ تھا اس غلبے کی تاریخ افغانوں سے لے کر انگریزوں پر ختم ہوتی ہے ہندوستان
میں مغل حکومت کی تباہی کے بعد اک نیا عہد غلامی شروع ہوا جس میں ہندو مسلمان دونوں
کے غلام تھے۔ ایک پنجرے میں دو چڑیاں تھیں جنھوں نے اپنے مشترک کلچر مشترک زبان سے
اک نیا پریم کا شوالہ سجایا تھا۔ خیالات دونوں کے ایک۔ اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے ایک زبان ایک
اور آزادی کی راہ میں جب یہ دونوں ایک ہو کر اُٹھے تو ایوانِ سیاست برطانیہ کے ستونوں

بلا ڈلا اگر ایک جانب تلک، گوکھلے، موتی لال، گاندھی جی، جواہر لال، سبھاش چندر بوس تھے تو دوسری جانب علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، نصدق احمد خاں شیروانی تھے ان دونوں فرقوں کے خیالات کو لفظی جامہ پہنانے والی زبان اُردو تھی ہمارے اس عہد کے کارناموں کی امانت دار اردو ہی ہے ایک نیا ڈھانچہ بن رہا تھا جس میں محبت اور خلوص کی بنیاد تھی اور اشتراک عمل کا ساز و سامان لیکن ہندوؤں کو یہ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا اور انھوں نے جوڑ توڑ کر کے اس میں تعصب کا گھن لگا دیا اور جو ڈھانچہ ہمارے قومی راہ نماؤں اور اس ملک کے بہترین دماغوں نے سالہا سال کی محنت کے بعد مل جل کر تیار کیا تھا جس کی بنیادوں میں سیکڑوں جانبازوں نے اپنا مقدس خون دیا تھا اور جس عمارت کے تیار کرنے کے لئے ہمارے لیڈروں نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ جیلوں میں گذارا تھا اس کی آخری اینٹ اب افسوس ہے زبان الگ کر کے نکال دی گئی۔

لیپا پوتی دوسری چیز ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اب پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ملک کی تقسیم کے بعد درا ندازوں نے زبان کی تقسیم بھی کر دی۔

سانس دیکھا تن بسمل میں جو آتے جاتے اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

ہمارے ملکی بھائی ان دنوں کس درجے متعصب ہو گئے ہیں اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے اتحاد و یگانگت کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب ایک دل ہوں اور اردو اس اتحاد کی نیو ہے جن لوگوں نے اس زبان کو ختم کرنے کی نیت باندھ لی ہے انھوں نے ہماری قومی طاقت کو ختم کرنے کی بھی ٹھان لی ہے یہ کوئی عقل کی بات ہے کہ ۶ ہزار سال پہلے کے کلچر کو اس بیسویں صدی میں رائج کیا جائے اور انسانوں کو رشی منی بنا دیا جائے اس فلسفے کی بلندی سے تو انکار نہیں مگر اس کا تجربہ کرنا بہت نقصان دہ ہوگا اس کلچر اور اس زبان کے زمانے میں ملک جس طرح آپس کے نفاق کی بدولت غلام رہا ہے اور فاتح آتے رہے ہیں اس سے ہم میں سے کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔

کلچر، دو زبانیں دو قومیں، دو بھدی سیاسی اور معاشرتی وحدت کہاں تلاش کی جائے جو ہندوستانیوں کی ذہنی پستی دور کرنے کا کارگر نسخہ ہو سکتی ہے۔

ہندی دنیا کا یہ اعتراض کہ اردو شعرا اپنے کلام میں ہندوستان کی روایات کا خیال بالکل نہیں کرتے بالکل بیجا ہے نظیر اکبر آبادی سے لے کر موجودہ دور کے شعرا کے کلام تک ہندی ساز و سامان کی اردو شاعری میں کمی نہیں ہے جوش جن کے کلام میں موجودہ دور کے تمام شعرا سے زیادہ فارسیت ہوتی ہے ان کے یہاں بھی آفاقیت کافی پائی جاتی ہے۔

"پیمان محکم" میں جوش صاحب کہتے ہیں۔

قسم اس عزم کی ساونت جب میدانیں آتے ہیں ۔ دم رخصت عروس نو کا جب گھونگٹ اٹھاتے ہیں
قسم ان قوتوں کی جو ملی تھیں رام و لچھمن کو ۔ قسم اس آگ کی جو کھا گئی تھی ملک راون کو
قسم اس نور کی روشن تھی جادے جس سے صحرا کے ۔ جھلکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے سے سیتا کے
قسم اس تیر کی چلتا تھا جو چلّے سے ارجن کی ۔ قسم میدان میں گاتی ہوئی تلوار کی دھن کی
قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھار یگا ۔ کہ اے ہندوستاں جیسے ہی تو مجھ کو پکار یگا
مری تیغ رداں باطل کے سر پر جگمگائے گی ۔ ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائیگی

اردو شعر و ادب نے ہندوستانی سماج کے بنانے میں وہی حصہ لیا جو کسی ترقی کرنے والے ملک کا ادب لیا کرتا ہے اس زبان کو جس میں میر و غالب و اقبال کا کلام ہے اور جس کے سر پر ابھی حسرت، جگر، جوش اور فراق موجود ہیں کون ختم کر سکتا ہے اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی وہ حکومت کی زبان نہیں عوام کی زبان ہے اس لئے اردو دنیا کو مایوس ہونے کے بجائے زیادہ ہمت اور جوش سے اس کے لئے کام کرنا چاہئے اب میں دو اور اردو کے بہی خواہ ہندو بزرگوں کے خیال اردو کے متعلق پیش کرتی ہوں اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اس زمانے میں بھی جب ہر طرف بغض و حسد کی آندھیاں چل رہی ہیں، نفاق کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ کچھ ایسے ایماندار لوگ بھی ہیں جو صلح و آشتی کی شمع جلاتے

ہوئے اس راستے پر گامزن ہیں جو حق وانصاف کا ہے مجھے امید ہے ان چند برگزیدہ ہستیوں کے دم سے اُردو زبان کی ناؤ ان مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں کے باوجود ٹھیک راستے پر چلتی رہے گی ان دونو بزرگوں میں سے پہلے صاحب ہیں ڈاکٹر تاراچند اور دوسرے ہیں پنڈت کشن پرشاد کول :

ڈاکٹر تاراچند صاحب اپنے ایک مقالے میں جو اردو ہندی کے عنوان سے ایشیا مئی ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا فرمایا تھا۔

"لوگ اُردو کے متعلق کچھ کہتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوانی زبان کا شاید ہی کوئی رُخ اور پہلو ایسا ہو جسے اُردو زبان میں پیش نہ کیا گیا ہو اُردو میں اپنشدوں کے ترجمے موجود ہیں بھاگوت گیتا کا ترجمہ ہو چکا ہے سمرتیوں، مہابھارت، رامائن اور بہت سے پراتوں کے ترجمے اردو میں مل سکتے ہیں ہندو مذہبیات اور فلسفۂ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصانیف موجود ہیں جن میں ہندو دیو مالا ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے ان کے علاوہ ہندو آرٹ خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں سنسکرت کے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں اردو ادب میں جگہ پاچکی ہیں ہندوؤں کے علوم ریاضی، کیمیا وغیرہ کے تذکرے اردو کتابوں میں ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے تھے اور شمالی ہند کے بہتیرے پڑھے لکھے ہندو نہ صرف معلومات بڑھانے کے بلکہ ذوق سلیم کے تقاضے سے اردو کتابیں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ہندو بے جا تعصب کی بدولت ہندو رفتہ رفتہ اردو کا دامن چھوڑ رہے ہیں اردو نے ہندوؤں کی خدمت کی اور ان کی ضروریات پوری کیں ساتھ ہی ساتھ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ضروریات کو زیادہ تر پورا کیا جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونو پر فخر ہے بے شمار ہندو اہل قلم نے شاہجہاں کے زمانے سے لے کر اب تک اردو کو اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ

بنایا یہ الزام کہ اردو میں باہر کی بو باس زیادہ ہے محض مبالغہ ہے یہ صحیح ہے کہ بہت سا اردو ادب مسلمان فرقے کی روایات سے رنگا ہوا ہے لیکن مسلمان فرقہ بھی تو ہندوستانی ہے اور یہ تو فطری بات ہے کہ اس کے افراد جو پیش کریں گے اس میں کسی حد تک اُن کی آرزوں اُن کے خیالات اُن کی روایات کا ذکر ہوگا ایسا نہ ہونا غیر فطری تھا ہندوستان کے وہ فرقے جو ایسے مذہبوں کے سپرد ہیں جن کی ابتدا ہندوستان سے باہر ہوئی ہے ان کو محض اس وجہ کی بنا پر اجنبی یا پردیسی نہیں خیال کیا جا سکتا کہ ان کے مذہب دیسی نہیں ہیں جو لوگ ایسے خیالات رکھتے ہیں وہ اصل میں ملک کی تقسیم کرنے والی اسکیموں کی تائید کرتے ہیں۔"

پنڈت دیا کشن صاحب کول نے فرمایا ہے " ہندوستانی زبان اس پانچسو برس پرانے زمانے کی جیتی جاگتی یادگار ہے جب پہلے پہل زندگی کی ضرورتوں کی مجبوریوں نے ہندو مسلمانوں کے میل جول اور اپنایت کے شاہی درباروں میں نہیں بلکہ فوج لشکر گاؤں شہروں ہاٹوں اور بازاروں میں گہری بنیاد ڈالی تھی اور جیسے زندگی کے مکروہ حادثے اور خونی وارداتیں جو زندگی میں ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں ہلا نہیں سکیں اس سیدھی سادھی ہندوستانی زبان کو جس نے شاہی لشکر اور ہاٹ بازاروں میں جنم لیا دکن پہنچ کر جو سادھو سنتوں اور درویش قلندروں کی گودیں پلی دلی واپس بلا کر جسے پہلے مظہر جان جاناں نے کنگھی چوٹی سے سنوار کر اور پھر ناسخ نے لکھنؤ میں اس کے سولہ سنگار کر کے دُلھن بنایا راج محلوں اور درباروں میں رانی بنا کر رکھا جو ریختہ اور اُردو کے نام سے پکاری گئی جس نے غالب کے زمانے میں اردوئے معلّے کا خطاب پایا۔

اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی جہاں اردو اسلامی روایتوں کے رنگ میں رچی ہوئی تھی وہیں اس میں اُپنشد، بھاگوت گیتا، سمرتیوں، رامائن، مہابھارت اور پرانوں کے ترجمے بھی ہو چکے تھے اردو نظم و نثر لکھنے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں ہندو بھی چوٹی کے لکھنے والے ملتے ہیں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، سرور جہاں آبادی اور چکبست

لہ ڈاکٹر صاحب کے فرمان کے مطابق زبان کا جھگڑا بھی ملک کی تقسیم کا اک ذریعہ بن گیا۔

ایسے نام ہیں کہ اردو زبان پر جن کے نام کا سکہ بیٹھا ہوا ہے بقول ڈاکٹر تارا چند کے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اردو یا ہندوستانی ہی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی نہ صرف ڈاکٹر تاراچند بلکہ بھارت بندو ہرلش چندر نے بھی جو ہندی کے بڑے نامی لکھنے والے ہوتے ہیں اس بات کو مانا ہے اور اقرار کیا ہے کہ کشمیری پنڈت اور کایستھ ہی نہیں بلکہ اگروالوں میں بھی پڑھے لکھے شریف گھرانوں کی زبان اردو ہی مانی جاتی تھی گارسان دتاسی اور راجہ شیو پرشاد وغیرہ نے بھی کہا ہے کہ اس وقت اگر کوئی زبان جائز طور پر سارے دیس کی زبان ہو سکتی ہے تو بلاشبہ وہ ہندستانی ہے۔

شری سمپورنانند جی اور ڈاکٹر جھا کا اسے بدیسی زبان بتانا اصلیت پر خاک ڈالنا ہے پروفیسر امرناتھ جھا نے فرہنگ آصفیہ کی جلدوں کو چھان کر ہمیں یہ تو بتایا کہ اس میں تیرہ[۱۳] ہزار لفظ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن مصلحتاً یہ کہنا بھول گئے کہ اس ڈکشنری میں کل لفظوں کی تعداد ۵۴ ہزار ہے اگر اردو میں چوتھائی لفظ عربی و فارسی کے ہیں تو اس بنا پر اس کو کوئی بدیسی زبان کہنے کا حق نہیں رکھتا لہذا ہمارا یہ کہنا کہ سیدھی سادھی ہندوستانی جو آسانی سے جنتا میں بولی اور سمجھی جا سکے اور جسے فارسی اور ناگری دونوں حرفوں میں رواج دیا جائے سارے دیس کی زبان ہونی چاہئے کس طرح بیجا ہے؟

مہاتما گاندھی نے بھی ہندی اور اردو کے جھگڑے کا یہی سمجھوتہ کیا تھا انڈین نیشنل کانگرس نے بھی اس کو مانا ہے ڈاکٹر تاراچند صاحب اور پنڈت کول صاحب نے اپنے مقالوں میں فرمایا اور جس سلجھے ہوئے انداز سے زبان کے مسئلے پر غور کیا ہے بالکل صحیح ہے جو لوگ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ ہندی کا پرچار کر کے اور حکومت سے اس کو منوا کر ہماری جیت ہوئی وہ بالکل غلطی پر ہیں یہ جیت ان کی سب سے بڑی ہار ہے اردو جو عوام کی زبان ہے مٹانا آسان نہیں ہے چند سرمایہ دار ذہنیت کے لوگ جو چاہیں من مانی کارروائیاں کر لیں لیکن اردو میں جب تک عوام کو پیغام پہنچانے کی طاقت ہے اس کو

کوئی مٹا نہیں سکتا۔

بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ پریم چند سے لے کر کرشن چندر تک ترقی پسند افسانوی ادب کے ہیرو ہندو ادیب ہی ہیں۔

ع جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے

اس وقت پارٹی بازی چھوڑ کر تمام اردو کے شیدائیوں کو ایک جگہ متحد ہو کر کام کرنا اور اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو کام انسان دل سے کرنا چاہے وہ خواہ کتنا ہی ناممکن ہو ہو کر رہتا ہے یہ سبق ہمیں گاندھی جی دے گئے ہیں۔ ان کی ہی طرح ہمت سے صبر سے سکون سے کام لے کر ہم اردو کی تحریک کو لے کر آگے بڑھیں گے۔

---

[۱] اس مقالہ پر تنقید کرتے ہوئے چند اصحاب نے اردو مجلس میں فرمایا کہ اردو اور ہندوستانی دو مختلف چیزیں ہیں ہندوستانی صرف وہ زبان ہے جس کو عوام بولتے ہیں اور اردو وہ کلاسیکل زبان ہے جو خواص کی بولی ہے اور علم و ادب کی زبان ہے مگر ایسا سمجھ لینا غلطی ہے میں نے جو جواب دیا ان حضرات کے اعتراض کا وہی یہاں بھی لکھتی ہوں تاکہ جن صاحب کو اس پر اعتراض ہو وہ مطمئن ہو جائیں۔

اردو کے نام دہلوی زبان ہندوستان ہندوی ہندی ریختہ اور ہندوستانی ہیں ہر دور میں اردو مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

کیفی صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستانی کو ہی لیجئے آج کل ہماری زندگی کے ہر شعبے میں انتہائی گڑبڑ ہے مجبوری دور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک انتہائی ناصبوری کے دور سے گذر رہے ہیں اس لفظ کو آج کل کیا معنی پہنائے جاتے ہیں اس سے سروکار نہ رکھئے اور دیکھئے کہ سرکاری تحریر اور عام انگریز اس لفظ سے کیا مراد لیتے تھے میر امن باغ و بہار کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"اب خداوند نعمت جان گلکرسٹ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ بولتے چالتے ہیں ترجمہ کردوں" دیکھئے کیفیہ مصنفہ کیفی صاحب ص۳۲

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اردو کو ایک ہی شخص نے کئی نام دیئے ہیں مرزا غالب کی تصانیف میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو دیوان میں تو کئی جگہ صرف ریختہ کا لفظ اردو کے لئے انھوں نے استعمال کیا ہے جیسے۔ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

آج گاندھی جی کی سالگرہ کے دن ہم سب ان کے ایک آدرش یعنے اردو یا ہندوستانی
زبان کی ترقی کا اور ملک میں اس کو پھیلانے کا کام اپنے سر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔
زندہ باد گاندھی پائندہ باد ہندوستانی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار اس کو ذرا دیکھا کہ یوں
فارسی کلام میں لفظ اردو استعمال کیا ہے۔
فارسی تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست
ایک قطعہ عارف کی طرف ہے جس کا شعر ہے
اے کہ میراث خوار من باشی اندر اردو کہ آن زبان من ست
در خطوں میں اپنے اردو کلام کو ہندی نام دیتے ہیں چنانچہ مرزا یوسف علیخاں عزیز کو ایک خط میں لکھتے ہیں
" مگر مرا کلام مرے پاس کب تھا کہ نلتا؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناصر حسین مرزا صاحب
ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے "
مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔
اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنے ایک مقطع اور ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔
دیکھیے خطوط غالب مرتبہ منشی مہیش پرشاد ۱۲۹ ص

سلسلۂ تاریخ ملت نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لیے سیرت
سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے،
جدید ایڈیشن جس میں اخلاق سرور کائنات ؐ کے اہم باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں ملک کے
مشہور شاعر جناب ماہر القادری کا سلام بہ درگاہ خیر الانام بھی شامل کر دیا گیا ہے کورس میں داخل
ہونے کے لائق کتاب ہے۔ قیمت ۱۲ مجلد ۱۲ بقیہ حصص خلافت راشدہ ہے، خلافت بنی امیہ
عہ

امیر الامراء نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ

اور

جنگ پانی پت

(۷)

(مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

ہر دو لشکر میں توپخانہ سپاہ کی صفوں کے آگے تھا اس کے پیچھے شتر سوار مع بندوق اور زنبورک اور درانیوں کی فوج میں بعد شتر سواروں کے ایرانی بندوقچی تھے اور دونوں لشکروں کی صف باہم متوازی نہ تھی بلکہ ایک جانب جھکی ہوئی تھیں اس لئے برخوردار خاں اور امیر بیگ اور دوندے خاں کے گروہ بہت جلد ابراہیم خاں گاردی کی فوج کے قریب پہنچ گئے۔

۷ رجنوری ۱۷۶۱ء کا دن قیامت خیز تھا گولہ اور بان تیر و تفنگ ہر دو فوجوں کے چلنے لگے۔

گولہ اندازی | مرہٹوں کی توپیں زیادہ پلے کی تھیں اس لئے ان کے گولے صف فوج درانی سے ایک میل پیچھے جا کر زمین پر گرتے تھے اور فوج میں کچھ نقصان نہ آتا تھا اور مسلمانوں کے لشکر سے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کے غول کے سوا دوسرے گروہ سے گولا نہیں چلتا تھا جس عرصہ میں کہ دونوں صفیں مقابلہ پر بڑھتی چلی آتی تھیں ابراہیم خاں گاردی گھوڑے پر سوار اپنے غول سے جدا ہو کر بھاؤ کے پاس گیا اس کا لنگوٹیا یار تھا پہلے سلام کیا اور عرض کی کہ آپ بہ سبب تقاضائے تنخواہ کے مجھ سے مدت سے ناراض ہیں اس مہینے میں خزانہ

لٹ جانے کے باعث میری فوج نے طلب نہیں پائی لیکن مضائقہ نہیں اج آپ دیکھیں گے کہ ہم نے آپ کا نمک مفت نہیں کھایا یہ بات کہہ کر گھوڑے کو ایڑ دی اور اپنے گروہ میں پہنچ کر فوراً حکم دیا کہ نشان آگے بڑھادیں دوسو توپیں ساتھ، دس ہزار جوان جلو میں ایک نشان اپنے ہاتھ میں لے کر حکم دیا کہ توپ اور بندوق موقوف کرو بعد اس کے دو پلٹنیں برخوردار خاں اور امیر خاں کے مقابلہ پر متعین کیں تاکہ وہ لوگ بازو پر حملہ نہ کریں اور خود سات پلٹنوں سے شمشیر برہنہ دوندے خاں اور حافظ رحمت خاں کی فوج پر قیامت خیز حملہ بول دیا۔[۱]

اس حملہ سے حافظ الملک کی فوج تباہ ہوئی پھر شاہ ولی خاں کی طرف یعنی قلب پر ٹوٹ پڑا۔

سیندھیا اور ہلکر	سیندھیا اور ہولکر نے مل کر مسلمانوں کے بائیں بازو یعنی نجیب الدولہ پر حملہ کیا

نجیب الدولہ اور جھنکوجی سیندھیا کی آویزش	نجیب الدولہ نے اپنے پیادوں کے ساتھ جھنکوجی سیندھیا کی فوج پر دباؤ ڈالا اور بیک وقت دو دو ہزار گولے ان کے سپاہیوں نے مرہٹوں پر پھینکے ان کی آواز سے دل دہلتے تھے اور دھوئیں کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا تھا

اس دھوئیں کی آڑ میں نجیب الدولہ کے آدمی آگے بڑھتے رہے اور مرہٹے بوجہ تاریکی ان پر گولیاں چلانے یا بھالوں سے حملہ آور ہونے کا پورا موقعہ نہ پا سکے اس کے بعد پیادوں نے دو طرفہ ہٹ کر توپوں کو آگ برسانے کا موقعہ دیا جس سے جھنکوجی سیندھیا کی فوج اور ہولکر کے دستوں کو پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا اور مرہٹہ لائن میں اس طرف خمیدگی واقعہ ہوئی"۔

شاہ پسند خاں اور ہنواڑ	نجیب الدولہ کی بائیں طرف شاہ پسند خاں افغانوں کا مشہور سردار معہ فوج کے بڑھتا آیا۔ یہ دلاور و آزمودہ کار سردار ایسی قوت کے ساتھ لڑ رہا

[۱] ذکر پانی پت کی لڑائی دمعلم العلمہ جلد اول ص۲۴ نمبرہ مئی ۱۹۵۹ء)

تھا کہ مرہٹوں کو اس کے سامنے دم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی اور ہنواڑ کے جو دستے اس
کے مقابل تھے ان کی قوت برابر گھٹتی جاتی تھی۔"

نجیب الدولہ ہولکر | نواب نجیب الدولہ مثل شیر کے ہلکر پر جھپٹا نجیب آبادی پٹھانوں نے اس
موقعہ پر وہ جوہر شمشیر زنی دکھائے کہ چشم فلک نے اس سے پہلے نہ دیکھے تھے۔ ہلکر کی
فوج مثل ککڑی کے کٹنے لگی۔ تھوڑے عرصہ میں میدان جنگ میں کشتہ کے پشتہ لگ گئے
ہلکر نے یہ رنگ جو دیکھا راہ فرار اختیار کی سیندھیا کسی قدر جم کر لڑا بالآخر لنگڑا ہو کر وہ
بھی بھاگا نجیب الدولہ کی فوج کے دو دستوں نے دونوں کا کئی کئی میل تک تعاقب کیا

ابراہیم کا قید ہونا | ابراہیم خاں گاردی جب قلب پر حملہ آور ہوا ہے تو ہنگامہ رستخیز برپا ہوا
عطائی خاں جو بڑا بہادر اور نامور سردار تھا۔ اور شاہ ولی خاں اشرف الوزرا کا برادر زادہ
تھا وہ اس ہنگامہ میں کام آیا۔ بشواس راؤ نے چالیس ہزار سواروں سے قلب پر
حملہ کیا۔ ابراہیم خاں نے بشواس راؤ کو فارغ کر کے خود قلب پر اپنا پورا آخری زور ڈالا
مگر اس موقعہ پر اشرف الوزرا نے پوری داد شجاعت دی اور ان کے ہمراہیوں نے ڈٹ
کر مقابلہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا افغانی فوج کے ہاتھوں ابراہیم خاں گاردی کی فوج کل کی کل
ختم ہوئی اور ابراہیم گرفتار کر لیا گیا پابہ زنجیر کر کے خیمہ شاہ ولی خاں میں پہنچا دیا گیا۔
مگر قلب کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی افغانی بہت سے کام آئے۔ اور کچھ پیچھے
ہٹے شاہ ولی خاں پھر اپنی صفوں کو درست کرنے میں مصروف ہوئے اور ابھی
صفیں درست بھی نہیں ہونے پائیں تھیں کہ بسواس راؤ نے شجاعانہ انداز سے زور
ڈالا جس کا بڑا اثر فوج پر پڑا ان پیہم سخت حملوں نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ شاہ درانی
کے پاس خبر پہنچی کہ فوجی بھاگنے لگے ہیں۔"

(باقی آئندہ)

تبصرہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی دہلی کالج، دہلی

"اور انسان مرگیا" راما نند ساگر کا ناول ہے۔ جسے نو ہند پبلشرز لمیٹڈ بمبئی نے شائع کیا ہے اس ناول کا موضوع وہ فرقہ وارانہ فسادات ہیں جن کی آگ میں ہماری زندگی کی اعلیٰ قدریں جل کر رہ گئی تھیں۔ انسانیت سرنگوں ہوگئی تھی اور تہذیب اور شائستگی شرمندہ و محجوب تھیں اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان میں بعض چیزیں سستی جذباتیت کی حامل ہیں بعض اتہامات و الزامات کا مجموعہ ہیں۔ بعض میں عدل اور توازن قایم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ بعض حزن و یاس کی بھیانک تصویریں ہیں۔ بعض اجنتا و تاج محل کا نوحہ و مرثیہ — غرض ان کی خاکستر میں انسانیت کی وہ چنگاریاں کم ملتی ہیں جو نفس گرم سے فروغ جاوداں پیدا کرسکیں۔ ساگر کے اس ناول کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں یہ نقائص نہیں ہیں، بعید از حقیقت ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں یہ نقائص اتنے کم ہیں کہ یہ ناول فساداتی ادب میں ہتم بالشان حیثیت کا مالک ہے ساگر کی ٹکنیک صاف اور واضح ہے۔ وہ ہمیں ایک ایسے آئینہ خانہ میں لے جاتا ہے جہاں ہم اپنے شیطانی خط و خال دیکھ کر شرما جاتے ہیں۔ وہ انسانیت اور شرافت کا جنازہ نکالتا ہے اور ہم اس تصور سے کانپنے لگتے ہیں کہ اس کے کندھا دینے والوں میں ہم سب شریک ہیں بہیمیت اور درندگی کا ایک سیلاب اُمڈا ہوا ہے، جس میں ہماری انسانیت، ماضی، حال اور مستقبل، خس و خاشاک کی طرح بہے جارہے ہیں۔ بعض مناظر اتنے دردناک ہیں کہ کتاب خود بخود ہاتھ سے گرجاتی ہے اور آنکھیں اشکبار ہوجاتی

ہیں - یہ تصویر کشی اور اثرانگیزی محض تخیل کے زور سے ممکن نہیں ہے اس کے لئے ضرورت ہے قلزمِ خون کی شناوری کی۔ اس آگ میں کود کر اسے گلزار بنانے کی۔ راما نند ساگر پر گہرے بننے تک کیا گزری ہوگی۔ اس کے تصور سے روح کانپنے لگتی ہے۔ وہ ہر مقتول کے ساتھ قتل ہوا ہے اور اس نے ہر مظلوم کے ساتھ ظلم سہے ہیں اس نے انسانیت کے درد کو اپنا درد بنا لیا ہے اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ناول لکھنے پر مجبور ہے اس لئے کہ یہ آبگینۂ تندیٔ صہبا کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ناول میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جب انسانیت کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں اور ہمارے چاروں طرف یاس و حرمان کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس بے آب و گیاہ سرزمین میں جتنے نخلستان ہیں، سب نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی جتنی روشنیاں ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے گل ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ آگ جو راما نند ساگر نے الفاظ کے شراروں سے روشن کی ہے معمولی آگ نہیں ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو خلیل کو پیدا کر سکتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو سمندر کا مسکن بن سکتی ہے ظاہر ہے کہ اس قسم کی چیز ہنگامی لٹریچر میں شامل نہیں ہو سکتی۔

اس ناول کے تمام افراد فرضی ہیں لیکن پھر بھی اصلی ہیں۔ ادشا، آنند، مولانا، کشن چند اور نرملا سب مر جاتے ہیں لیکن وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اس لئے کہ انسانیت ان کے کارناموں سے زندہ ہے۔ شائستگی کی روشنی ان کے پاکیزہ جذبات کی وجہ سے قائم ہے۔ آنند، نفرت اور تشدد کے مناظر دیکھ دیکھ کر چلا اٹھتا ہے "اگر انسان خودکشی نہ کرے تو میں اسے مار ڈالوں گا"۔ یہ کیفیت، یہ جذبہ حالات کے عین مطابق ہے۔ اس کا کردار ہمدردی کا پیام ہے اور عمل کی آواز — ادشا تمام ناول پر چھائی ہوئی ہے لیکن بمشکل ایک دو باب میں اپنی صورت دکھاتی ہے۔ وہ علامت ہے اس آدرش کی جو فن کار کو ذوقِ عمل بخشتی ہے، وہ نشانی ہے، اُس سوزِ آرزو اور محبتِ بے پایاں کی جو پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے شیر نکال لاتی ہے۔

ساگر کے اس ناول میں یاس ہے، تلخی نہیں، جذباتیت ہے، آہ و بکا ہے، نالہ و شیون ہے لیکن غم و اندوہ کے اس طوفان میں بھی اس نے ہماری توجہ بعض اہم مسائل کی طرف مبذول کرائی ہے۔ آزادی کے بعد بھی عشق کے بہت سے امتحان باقی ہیں اس کٹھن منزل کو طے کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا زادِ راہ ہے؟ ہمارے سامنے قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا سوال درپیش ہے۔ اس کے لئے ہم کیا اخلاقی سرمایہ رکھتے ہیں؟ فطرت کی تعزیریں بہت سخت ہوتی ہیں۔ وہ بدعملی اور بے راہ روی کو معاف نہیں کر سکتی بلکہ اس کا تاوان وصول کرتی ہے۔ رامانند ساگر نے یہ نکتہ اچھی طرح واضح کر دیا ہے اور یہ بلاشبہ بڑی خدمت ہے۔

اس ناول کا مقدمہ خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے اس میں چند باتیں بحث طلب ہیں۔ انھوں نے فسادات کے اسباب و وجوہ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ ناول نگار کے سامنے یہ سوال کبھی زیادہ اہم نہیں بن سکا اس کا نقطہ نظر نہ سیاسی ہے نہ اقتصادی اس نے ہر چیز کو انسانیت کی ترازو میں تولنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اپنے فن کو کانٹوں سے بچا لیا ہے عباس صاحب کا خیال ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج انگریزوں کے زمانہ میں نہیں بلکہ مغلوں کے اس آخری دور میں بویا گیا جب اکبر کی رواداری کے بجائے اورنگ زیب کی سخت گیر مذہبی پالیسی شروع ہو گئی۔ اس مقام پر عباس صاحب نے بالکل غیر شعوری طور پر ان ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے جو الفنسٹن، اسمتھ اور مارسیڈن اپنی درسی کتابوں میں کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند اور دوسرے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب انتظامی اور اقتصادی تھے لیکن مذہبی ہرگز نہیں تھے اسی طرح جتنی بغاوتیں ہوئیں وہ قطعی سیاسی تھیں مذہب سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی لئے سرپی سی رائے نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلہ کا کہیں وجود ہی نہیں تھا عہد وسطی کی

پوری تاریخ اتحاد پسندی کے رجحانات کی آئینہ دار ہے، ہمارا لٹریچر، ہماری موسیقی ہماری مصوری، ہماری عمارتیں، اور ہماری مذہبی تحریکیں سب اتحاد و اختلاط کی مظہر ہیں۔ یہ اختلاط واتحاد بغیر زمان و مکان کے قوی موثرات کے ممکن ہی نہیں تھا غیر ملکی اور سفید حکمرانوں کا یہ قصور ہم کبھی معاف نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اتحاد پسندی کے اس تاریخی رجحان کو اہتمام کے ساتھ ختم کیا۔ مسلمان کو یہ بتایا کہ تمہاری تاریخ محمود غزنوی سے شروع ہوتی ہے اور ہندو کو یہ سمجھایا کہ تمہاری تاریخ ہرش پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ ہندی غلام اس پوری وراثت کے مالک تھے جس کا آغاز موہنجوداڑو سے ہوتا ہے اور جس کا سلسلہ عہد وسطیٰ میں بھی اسی شان و شوکت سے جاری رہتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب دلچسپ ہے اور اس کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہیے جو اعلیٰ اقدارِ حیات کو عزیز رکھتا ہے اور جو انسانیت کے احترام کو زندگی کا بہترین مقصد سمجھتا ہے۔

خلافت عباسیہ

جلد دوم ۔ تاریخ ملت کا چھٹا حصہ جس میں اٹھائیس[۲۸] حکمرانوں متوکل سے لے کر مستعصم تک کے تمام تاریخی حالات بڑی کاوش سے جمع کئے گئے ہیں اس حصے میں بھی پہلے حصے کی تمام خصوصیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے واثق باللہ کے زمانے تک ایک صدی کو چھوڑ کر عباسی خلافت کے چار سو چوبیس[۴۲۴] سال کے دورِ حکومت کی تاریخ آپ کو اس میں ملے گی جس سے اندازہ ہوگا کہ بغداد جو مسلمانوں کی عظمت واقتدار کا گہوارہ اور مشرقی ملکوں کا سرتاج تھا کس طرح ویران و پراگندہ ہو کر ان متفرق جماعتوں کا مسکن ہو کر رہ گیا جو ہلاکو خاں کی فوج کے ساتھ آئی تھی سلاطین بویہ، سلاجقہ، زنگی، ایوبی، علوئین، باطنیہ وغیرہم عصر دول اسلامیہ کے حالات کا جامع خلاصہ بھی آپ کو اس کتاب میں ملے گا کتاب کے آخر میں عباسی خلافت کے تمام دوروں پر ایک سیاسی اور تاریخی نظر ڈالی گئی ہے جو کم و بیش ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے صفحات ۷۶۴ قیمت غیر مجلد چار روپے بارہ آنے قیمت مجلد پانچ روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

ادبیات

غزل

(علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی)

وہ ستاروں میں نہ پیشانی کی تحریر میں ہے
رازِ تقدیر تو پنہاں تری تدبیر میں ہے

ہے سوا جوشِ عمل اور بھی ناکامی سے
جو خرابی ہے معاون مری تعمیر میں ہے

لن ترانی سنے کیوں طور پہ جا کر کوئی
جلوۂ حسنِ ازل قلب کی تنویر میں ہے

کتنا ہی خوار ہوں۔ کہلاؤں گا بندہ تیرا
اے خدا کیا تری عظمت مری تحقیر میں ہے

دل جو آزادی پہ قرباں ہوا اس کو غم کیا
کہ گلا طوق میں اور پاؤں بھی زنجیر میں ہے

کام کر جاتی ہے دل پر جو کبھی ایک نظر
کاٹ وہ تیغ میں۔ وہ توڑ کہیں تیر میں ہے

جو ہے پہناتا ہے من مانتے معنی اس کو
کوئی جادو کا اثر آپ کی تقریر میں ہے

مسکراتی ہے کبھی آنکھ دکھاتی ہے کبھی
ایک اعجازِ نظر آپ کی تصویر میں ہے

یوں صنایع سے، بدایع سے سجا لو۔ لیکن
شعر بے مثل ہے۔ بے مثل جو تاثیر میں ہے

عارضی چیز ہے تسخیرِ ممالک اے دوست
فتح کہتے ہیں جسے قلب کی تسخیر میں ہے

برہمن کہتا ہے کیفی کو بتوں سے کیا کام
فیصلہ شیخ کا اس شخص کی تکفیر میں ہے

"نیا انسان"

جناب شمس نوید

مندرجہ ذیل نظم پارہ میری ایک طویل نظم کا اقتباس ہے جو بجائے خود نا تمام و تشنہ نہیں ہے یہ نظم سادھو، قلندر اور سائنس داں کے کرداروں پر مشتمل ہے حسب ذیل ٹکڑا وہ مقام ہے جبکہ سائنس داں کے ترقی پسند دعووں کی تردید میں سادھو نے قلندر کو مخاطب کرتے ہوتے سائنس داں کے برخود غلط جذبات پر طنز کیا ہے۔ اگر ناظرین و مدیر محترم نے حکم دیا تو پوری نظم "برہان" میں پیش کر سکونگا۔

تو نے نئے انسان کو دیکھا؟

روحانی بندوں سے نکل کے زیست نے جسمانی کروٹ لی
نور سے آگے میلوں چل کے دوزخ کے شعلوں سے لپٹ لی
دیکھ! نئی قندیل ہے روشن جس میں چھپی "بجلی" کی چمک ہے
پھولوں سے بھرپور ہے دامن دل میں مگر کانٹوں کی کھٹک ہے
ساحل میں طوفان کو دیکھا؟
تو نے نئے انسان کو دیکھا؟

نظمِ جہاں تو خود ہی ازل سے انسانوں کے زیر اثر تھا
فطرت نے ضو دی مشعل سے زیست کا جتنی دور گزر تھا
پھر ان سیدھے انسانوں پر شیطانوں نے کرنیں پھینکیں
دورِ نو نے نور سمجھ کر ان شعلوں سے جیبیں بھر لیں
طاغوتی سامان کو دیکھا
تو نے نئے انسان کو دیکھا؟

مرگھٹ میں خوابیدہ گُن ہے دہر میں باقی پاپ رہے ہیں
روح کی قوت برف میں سُن ہے جسم کو انساں تاپ رہے ہیں
دیکھ! اُفق پہ آگ کا طوفاں! بمباری! گولوں کے دھماکے!
انساں ہے انساں سے ہراساں! جسم ہیں آدم خور بلا کے!
خونخوارانہ شان کو دیکھا!
تو نے نئے انسان کو دیکھا!

۱۹۴۲ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب طبع دوم قیمت للعہ، مجلد صہ،

سرمایہ۔ کارل مارکس کی کتاب "کیپٹل" کا ملخص شستہ

رفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن۔ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطہ

حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث زیرِ طبع

خلافتِ بنی اُمیّہ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت

مجلد عہ، مضبوط اور عمدہ جلد

۱۹۴۳ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

و تربیت۔ جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید

کتاب قیمت للعہ، مجلد صہ،

نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق و تفصیل

کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت

سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و

تربیت کیا رہا ہے قیمت للعہ، مجلد صہ،

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ، مجلد ستے،

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی

قیمت للعہ، مجلد صہ،

۱۹۴۴ء قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف

اور مباحثِ تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت

عا، مجلد سے،

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ اور رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات

کا بیان ——— زیرِ طبع

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر بلند پایہ تاریخی

کتاب قیمت سے،

۱۹۴۵ء ترجمان السنہ۔ ارشاداتِ نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹ جلد اول

قیمت عہ، مجلد ستے،

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید و تحقیق

از ترجم و نقشہائے سفر قیمت سے،

جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ

کی آزادی اور انقلاب پر نہایت دلچسپ کتاب قیمت عہ،

۱۹۴۶ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مصر کے مشہور مصنف

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب

"النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ قیمت صہ، مجلد صہ،

مسلمانوں کا عروج و زوال طبع دوم قیمت صہ، مجلد صہ،

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

قیمت صہ، مجلد صہ،

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔ قیمت ۶،

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے جس سے

آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اُردو بازار جامع مسجد دہلی

REGISTERED No. D 148

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبار۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبار میں ہوگا ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان وادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں اُن کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

۹۴/۵

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد بست وچہارم — شمارہ (۵)

مئی ۱۹۵۰ء مطابق رجب المرجب ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں!

یہ مصرعہ حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک نہایت بلند غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ ہے پورا شعر یہ ہے۔

بیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اگر آپ لفظ "مومن" سے شاعر کا تخلص نہیں بلکہ اس سے مراد اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لیں تو دیکھئے آج یہ مصرعہ کس طرح ان مسلمانوں پر صادق آرہا ہے جو بدحواس ہو کر پاکستان بھاگ رہے ہیں

جن بھائیوں کے گھر اور کاروبار فسادات میں برباد ہو گئے ہیں یا ان کے کسی عزیز و قریب کو جانی نقصان پہنچا ہے اور اب بظاہر اسباب ان کے لئے دوبارہ یہاں زندگی کا نیا تجربہ شروع کرنے کا سامان بھی نہیں ہے اگر وہ ترک وطن کر رہے ہیں تو انھیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جنھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے وہ بھی اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہے ہیں یا جانے کے لئے پر تول رہے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

یہ صورتِ حال انتہائی افسوسناک اور خاص طور پر مسلمان کہلانے والی قوم کے لئے حد درجہ شرم اور ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ جس قوم سے اجتماعیت کی روح مفقود ہو جاتی ہے اس کا حال یہی ہو جاتا ہے کہ جہاں کسی نے ہش کیا اور جہاں جس کا سینگ سمایا چلا گیا قرآن مجید نے اس کو فتذھب ریحکم یعنی ہوا اکھڑنے سے تعبیر کیا ہے۔

ایک مسلمان کا بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی پتہ بھی بغیر حکم خدا کے نہیں کھڑکتا بس اگر یہ صحیح ہے تو انھیں سمجھنا چاہئے کہ کسی مسلمان کے لئے خدا کا جو حکم مقدر ہو چکا ہے وہ اس سے کہیں بھی نہیں بچ سکتا جو لوگ فسادات میں برباد ہو گئے ہیں ان کے لئے حکم خدا یہی تھا اگر

وہ بجائے بھارت کے پاکستان میں ہوتے تو یہ بربادی ان کو وہاں بھی پہنچتی اور اسی طرح جو لوگ پاکستان میں محفوظ ہیں ان کے لئے قدرت کا فیصلہ یہی تھا اگر وہ بجائے پاکستان کے بھارت میں ہوتے تو یہاں بھی اسی طرح محفوظ رہتے فسادات ایک طرح کی آفت آسمانی ہیں۔ دبائیں پھیلتی ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ سیلاب اُمنڈتے ہیں جن کی قسمت میں بربادی ہوتی ہے وہ ان کا شکار بن جاتے ہیں اور ہزاروں لاکھوں جن کی تقدیر میں سلامتی ہوتی ہے وہ بچ رہتے ہیں "جس کو مولا راکھے وہ رہے کیلی لاگ" ان کا نتیجہ یہ تو کہیں نہیں ہوتا کہ طاعون آگرہ میں پھیلا ہوا ور شہر چھوڑ چھوڑ کر دہلی والوں نے بھاگنا شروع کر دیا ہو، سیلاب جمنا میں آیا ہوا ور گنگا کے کنارہ پر رہنے والوں نے رخت سفر باندھ لیا ہو

اگر مسلمانوں کو اپنے حی و قیوم خدا پر بھروسہ اور اسلام کی حسن تقدیر کا یقین ہو تو انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ موجودہ دور ابتلاء و آزمائش ان کی ملی زندگی کا کوئی انوکھا اور نرالا حادثہ نہیں ہے ملت بیضاء کے کاروان کو اپنی پورے چودہ سو سال کی زندگی میں اس جیسے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بھیانک، خونیں اور ہولناک سینکڑوں انقلابات کے دروازہ سے گذرنا پڑا ہے اور اس قسم کے مواقع پر جب کبھی انھوں نے اللہ پر بھروسہ کر کے پورے عزم و ہمت کے ساتھ ان حوادث کا مقابلہ کیا ہے وہ ہمیشہ اس میں کامیاب رہے ہیں اگر یہ سچ ہے کہ اسلام اس عالم آب و گل میں رب السمٰوٰت والارض کا آخری فرمان ہے اور مسلمان اس کے حامل اور علم بردار ہیں تو دنیا کی ہر فتنہ پرور طاقت کو یقین رکھنا چاہیئے کہ جب تک یہ آسمان روئی کے گالوں کی طرح فضاؤں میں نہیں اڑتا۔ اور زمین شق نہیں ہوتی اس وقت تک نہ اسلام فنا ہو سکتا ہے اور نہ مسلمان!

کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ انسان خواہ کہیں اور کسی ملک میں رہے بہرحال کامیاب زندگی بسر کرنے کے صرف دو ہی اصول ہیں ایک خدا پر کامل بھروسہ اس سے دلی لگاؤ اور دوسرے اس کے سب بندوں کے ساتھ بلا تفریق مذہب و ملت محبت اور ان کی خدمت و خیر خواہی کا جذبہ۔ اگر یہ اوصاف پائے جائیں تو ایک شخص اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عزت سے رہ سکتا ہے ورنہ دوستوں اور ہم مذہب لوگوں کے ساتھ بھی سکھ کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ نفرت اور

بغض و عداوت رکھنے کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنے اس جذبہ کی تسکین میں کامیاب ہوتا ہے تو بعد میں جب اس کے ہوش و حواس ٹھکانہ ہوتے ہیں وہ اپنی حرکات پر خوش ہونے کے بجائے نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور اگر اس جذبۂ نفرت کی تسکین میں اسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ بزدل اور ڈرپوک بن جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے سایہ سے بھی ڈر کر بھاگنے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف محبت۔ خلوص اور جذبۂ خدمت و خیر خواہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی پر اس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے اور ناکام رہنے پر دل شکستہ نہیں ہوتا اور شکست کھا کر بھی اُس کے دل میں بزدلی اور کم ہمتی راہ نہیں پاتی اس کا ضمیر اور اس کا دماغ بہرحال مطمئن رہتا ہے :

خدا پر بھروسہ اور خلق خدا کی خیر خواہی، اور ان سے محبت۔ صرف یہی دو ہتھیار تھے جن سے مسلمانوں نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل فتح کئے اور جو ان کی جان کے درپے تھے وہ ان پر اپنی جان چھڑکنے لگے چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک نعمتِ عظمیٰ کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب کہ تم آپس میں دشمن دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کے کرم سے بھائی بھائی ہو گئے

اگر مسلمان بجائے گھبرانے اور بدحواس ہونے کے ان دونوں اوصاف کو اپنے کیرکٹر کا جزبنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جو اب تک ہوتا چلا آیا ہے وہ آج پھر نہ ہو۔

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوَدَّةً وَاللَّهُ قَدِيرٌ

قریب ہے کہ اللہ تم میں اور تمہارے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے اور اللہ بڑی قدرت والا ہے

جن لوگوں نے مغربی بنگال کے گذشتہ فسادات میں سکھوں اور بہتیرے ہندوؤں کو اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی مدد کرتے دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دلوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی اور اگر اس ملک اور اس قوم کو زندہ رہنا ہے تو لازمی طور پر انھیں دل بدلنے اور دماغ صاف کرنے ہی ہوں گے پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دلوں کو مضبوط رکھیں اور خواہ مخواہ اپنے وطن عزیز سے بھاگ کر پناہ گزینی کی الم انگیز زندگی اختیار نہ کریں زندگی کہیں بھی پھولوں

کی سبح نہیں ہے"

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی

گذشتہ مہینہ کے معزز "معارف" سے یہ معلوم کرکے بے حد افسوس ہوا کہ لاہور کا کوئی ناشر دار المصنفین کی تمام کتابیں چھاپ رہا ہے اخلاقی زبوں حالی و خود غرضی کے اس دور میں جو کچھ بھی ہو حیرت انگیز نہیں لیکن دو مملکتیں بننے سے اندیشہ ہے کہ یہ مرض اور متعدی ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو کم از کم بھارت کے اردو ناشرین تو سب ختم ہو جائیں گے کیونکہ اب اردو کتابوں کا بڑا بازار پاکستان ہی بن سکتا ہے اس بنا پر بھارت اور پاکستان کے تمام ناشروں کو مل کر دونوں حکومتوں سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وہ اس غیر انسانی بداخلاقی کو روکنے کے لئے آپس میں کوئی ایسا مشترکہ قانون بنالیں کہ یہاں کی کتاب وہاں اور وہاں کی یہاں مصنف یا ناشر کی اجازت کے بغیر نہ چھاپی جا سکے۔

خلافت عبّاسیہ

جلد اوّل۔

تاریخ ملّت کا پانچواں حصّہ جس میں نو عبّاسی خلفاء سفّاح، منصور، مہدیؔ، ہادیؔ، ہارونؔ، امینؔ، مامونؔ، معتصمؔ اور واثقؔ باللہ کے سوانح حیات ایک خاص اسلوب سے جمع کئے گئے ہیں، خلافت عباسیہ کا یہی دور حقیقت میں دور عروج تھا اور اس دور میں عباسی خلفاء کی قوت و اقتدار کا رعب تمام ہمسایہ سلطنتوں پر چھایا ہوا تھا کتاب کے اس حصّے میں آپ کو نہ صرف ان عظیم الشان خلافتوں کے جامع مستند حالات و واقعات ملیں گے بلکہ ہر خلیفہ کے عہد حکومت اور اس کے علمی و مذہبی تمدنی اور اصلاحی کارناموں پر دلپذیر تبصرہ بھی ملیگا جس سے مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے مرکز بغداد کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے صفحات ۲۴۴ قیمت غیر مجلد ۱۲/ روپے، مجلد للعہ، جلد دوم صفحات ۲۷۰ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد صہ۔

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

اور

اس میں غیر مسلموں کا درجہ و مقام

(سعید احمد اکبر آبادی)

پچھلے دنوں نہرو لیاقت معاہدہ کے موقع پر وزیر اعظم پاکستان نے پنڈت نہرو سے کہا اور پھر پریس کانفرنس میں بیان دیتے ہوئے بھی انھوں نے اس کی تصریح کی کہ پاکستان ایک عہد حاضر کی قسم کی جمہوریت (modern Democratic state) ہے اور اس بنا پر اس میں غیر مسلموں کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو وہاں کے مسلمانوں کو ہیں۔ سول اور ملٹری کے تمام محکمے اسمبلی کی ممبری۔ ووٹ دینے کا حق عقیدہ و عمل کی آزادی۔ ان سب چیزوں کے دروازے ان کے لئے اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح وہ مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یاد ہوگا کہ بعینہٖ یہی بات پاکستان کے مرحوم مؤسس اول نے اس وقت کہی تھی جبکہ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے پہلی تقریر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی بلکہ اپنے مقصد کو زیادہ مؤکد کرنے کے لئے انھوں نے یہاں تک فرمادیا تھا کہ "اب پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہوگا اور نہ کوئی مسلمان بلکہ پاکستان کا ہر باشندہ بلا تفریق مذہب و ملت صرف پاکستانی ہوگا اور اس کے ساتھ اسی حیثیت سے معاملہ کیا جائیگا"

لیکن پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اپنے بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دے چکی ہے۔ تو اب غور اس پر کرنا چاہئے کہ بانیِ پاکستان اور

وزیر اعظم پاکستان کے یہ اعلانات "اسلامی حکومت" کے اعلان کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر رکھتے ہیں تو اس چیز کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صاف اور واضح ہونا چاہیے۔ ورنہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ قسم کی چند پارٹیاں ہیں جن کے نزدیک یہاں ہندو راج یا رام راج قائم ہونا چاہیے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے۔ باقی ان کے علاوہ دوسری قومیں یہاں کی شہری نہیں ہو سکتیں، اسی طرح پاکستان میں کچھ جماعتیں ہیں جن کے خیال میں اسلامی حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ جو غیر مسلم وہاں رہیں گے تو اگرچہ ان کی جان ومال کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہوگا لیکن ان کو وہ تمام شہری حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو مسلمانوں کو ہوں گے اس بنا پر اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ نے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یہاں کی اکثریت کے غلط مذہبی تصورات کو آلۂ کار بنا کر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ اب یا الکشن کے موقع پر اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان کی یہ جماعتیں گورنمنٹ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں اور وہ اسلامی حکومت کے غلط تصور کو پیش کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

علاوہ بریں اس مقالہ کا ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ حالیہ فسادات کے باعث اشتعال پذیری کے عالم میں چند گستاخ و بدزبان اخبارات و رسائل نے پاکستان کو برا کہتے کہتے اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں بھی حد درجہ مکروہ وناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں جہاں تک ان کی بدزبانی اور دریدہ دہنی کا تعلق ہے تو ہم اس کے جواب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ ایک بھاری اور مقتدرہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہوئے کسی زیردست یا شکستہ اقلیت کے مذہب اور اس کے پیغمبر کی شان میں اس طرح گستاخ زبانی کرنا کمینہ پن کی وہ آخری منزل

ہے جہاں انسانیت لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے اور اگر ہم چاہیں تو جواب ترکی بہ ترکی دے
کر اپنے ان حریفوں کو برسوں انگاروں پر لٹا بھی سکتے ہیں

تم کو بھی ہم بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

بہر حال جہاں تک اصل مسئلہ کی وضاحت کا تعلق ہے۔ ہم اسے بیان کرتے ہیں تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں سمجھ سکیں کہ اگر پاکستان واقعی اسلامی حکومت ہے بھی تو اس کے غیر مسلموں کا وہاں کی حکومت میں درجہ و مقام کیا ہے؟ اور وزیر اعظم پاکستان نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس میں اسلامی حکومت کے تصور کے لحاظ سے کس درجہ واقعیت اور سچائی ہے؟

دینی حکومت اور اسلامی حکومت میں فرق

شروع میں اس غلط فہمی کا دور کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دینی حکومت اور اسلامی حکومت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ عنوان مختلف ہے مگر معنون ایک ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے ان دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے جو حکومت اسلامی آئیڈیالوجی کے مطابق دینی ہو گی وہ اسلامی ضرور ہو گی لیکن جو حکومت کسی خاص اعتبار سے اسلامی ہو اس کا دینی ہونا ضروری نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دینی حکومت کا ہر عمل دینی ہو یا دنیوی بہر حال اس میں تعبد اور تقرب الی اللہ کا پہلو غالب رہتا ہے پھر یہ حکومت کسی انسان کی۔ فرد ہو یا جماعت نہیں ہوتی بلکہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے مطابق صرف خدا کی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس کو حکومتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ اس حکومت کا صدر جو امام کہلاتا ہے اسے لوگوں پر مذہبی سیادت بھی حاصل ہوتی ہے اور سیاسی بھی اسی لئے اس کا متقی اور پرہیزگار ہونا ضروری ہے۔ وہ گویا خدا کی طرف سے اس کے احکام کے اجرا و تنفیذ کا ذمہ دار ہوتا ہے اس حکومت میں آج کل کی جمہوریتوں کی طرح کی نہ دستور ساز اسمبلی ہو سکتی ہے اور نہ کونسلیں اور نہ پالیمنٹ۔ قانون سازی کا حق سوائے علمائے ربانیین کے کسی اور

د نہیں ہو سکتا - پھر اس میں نہ حلقہ وار انتخاب ہے اور نہ آبادی کے تناسب سے نمائندگی اس بنا پر یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ پاکستان گورنمنٹ کسی طرح بھی دینی حکومت نہیں کہلائی جا سکتی اور ایک یہ ہی کیا۔ خلافت راشدہ کے بعد یہ دینی حکومت رہی ہی کہاں ہے ؟ خود غرض بادشاہوں نے اپنے لئے "ظل اللہ علی الارض" اور "خلیفۃ اللہ علی الناس" ایسے کیا کچھ القاب اختیار نہیں کئے۔ لیکن تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ خود ان کی اور ان کی مزعومہ خلافت کی حقیقت کیا تھی ؟ جن لوگوں نے بنوامیہ کی نعشوں پر بیٹھ کر جشن دعوت منایا تھا خطبوں میں منبر پر بیٹھ کر دہی اپنے آپ کو اللہ کے دین کے سب سے بڑے حافظ کہتے تھے تیمور لنگ جو سفاکی و بے رحمی کے میدان کا تامور ہیرو تھا وہ بھی اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میں ہندوستان اسلام کے سرنگوں علم کو اونچا کرنے گیا تھا۔ بہر حال دعاوی خواہ کچھ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور کے بعد امامت - خلافت یا دینی حکومت صحیح معنیٰ میں کبھی قائم نہیں ہوئی - عبدالملک بن مروان جو خلیفہ ہونے کے ساتھ بڑا عالم اور فقیہ بھی تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تم حضرت ابوبکر و عمر کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے تو اس نے کہا کہ ان کے زمانہ میں لوگ بھی تو تم جیسے نہیں تھے واقعہ یہ ہی ہے کہ کسی حکومت کی نوعیت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ کیسے ہیں؟ اس بنا پر خلافت راشدہ بھی اگر خیر القرون سے آگے نہیں بڑھ سکی تو اچنبھے کی کیا بات ہے ؟ اسی بنا پر ہم کو خوشی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم نے بڑی جرأت سے اپنے بیان میں صاف صاف کہہ دیا کہ ان کی حکومت دینی (Theocratic) نہیں ہے۔

اسلامی حکومت اب رہی اسلامی حکومت ! تو اگر ہم اسلام سے مراد ایک مخصوص قسم کا نظام زندگی لیں ــــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کمونزم وغیرہ دوسرے قسم کے نظام ہائے زندگی رائج ہیں ـــ تو اس نظام کو جس حد تک کوئی حکومت اختیار کرے گی

وہ اسی درجہ تک اسلامی کہلائے گی۔ جہاں تک اس نظام کے معاشی۔ معاشرتی ا
مادی مسائل کا تعلق ہے اس نظام کو مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اختیار کر سکتے ہی
اور پھر بھی وہ نظام اسلامی نظام ہی کہلائے گا۔ کسی غیر مسلم کے اپنانے سے وہ غیر ا
نہیں ہو جائیگا۔ مثلاً اقوام متحدہ کی کونسل نے آج انسانی حقوق کا جو چارٹر بنایا ہے
ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی چارٹر ہے۔ اسی طرح ہماری پارلیمنٹ میں آج جو ہنا
کوڈ بل پیش ہے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بل اپنی متعدد دفعات کے اعتبار سے اسلامی
قانون ہے، دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح سمجھئے کہ مثلاً اگر ایک غیر مسلم کسی
کی مدد کر رہا ہے یا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچا رہا ہے تو ہم کہہ سکتے
ہیں کہ اس کا یہ فعل اسلامی ہے لیکن ہم اس کو دینی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دینی فعل پر ا
تعبدی مرتب ہوتے ہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ فاعل مسلمان ہو لیکن
دینویہ کے اعتبار سے جس طرح جزوی طور پر زندگی کے کسی ایک شعبہ میں اسا
کی تعلیمات پر عمل کرنا اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ملک خواہ وہ مسلمانوں
ہو یا غیر مسلموں کا۔ یا دونوں کا اپنی حکومت کے لیئے جو دستور مرتب کرتا ہے وا
نظام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور ملکی و وطنی معاملات۔ اقتصادی و معاشی
غیر قوموں کے ساتھ تعلقات صلح و جنگ کے قوانین وغیرہ ان سب چیزوں میں
اسلامی نظام کی پیروی کرتا ہے تو بے شبہ اس ملک کی حکومت۔ حکومتی امور کی
تک اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات وا
ہو گئی ہو گی کہ محض اسلامی حکومت کا نام سن کر یہ سمجھ لینا کہ یہ حکومت فرقہ وارانہ ہو
صحیح نہیں ہے اگر ایک کمونسٹ یا سوشلسٹ گورنمنٹ کا مفہوم فرقہ وارانہ گورنمنٹ
نہیں ہے تو اسلامی حکومت کہنا بھی فرقہ وارانہ گورنمنٹ کے مرادف نہیں ہو سکتا
ہاں اگر اس حکومت کے آئین میں کسی فرقہ کی حق تلفی ہوئی ہو تو بے شبہ اس پر ا

یا جا سکتا ہے۔ اسی لئے ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے مقالہ کا موضوع
محدود ہے اس لئے گفتگو صرف غیر مسلموں کے درجہ و مقام تک ہی رہے گی!!!

قیام پاکستان کی نوعیت

چونکہ کسی چیز کی نوعیت کے بدل جانے سے اس چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے
اس لئے سب سے پہلے ہمیں قیام پاکستان کی نوعیت معلوم کرنی چاہئے
ظاہر ہے یہ نوعیت اپنی حیثیت میں بالکل منفرد ہے۔ یعنی بعینہ اس کی کوئی نظیر تاریخ اسلام
میں نہیں ملتی۔ البتہ اس کے مختلف پہلو ہیں جن پر تاریخ کے بعض واقعات سے روشنی
پڑتی ہے اور اسی روشنی میں اس کے لئے احکام کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان
کے قیام کی صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ملک میں رہتے بستے ہیں
اس ملک پر ایک اجنبی طاقت کا قبضہ ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس طاقت کو ملک
سے نکال باہر کرنے اور اپنے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے مشترکہ جد وجہد کرتے ہیں
ایک عرصہ تک مشترکہ جد وجہد کرنے کے بعد چند ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی
باعث مسلمان تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں بڑی رد وکد کے بعد آخر ہندو اس تقسیم کو منظور
کر لیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک آزاد ہو کر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے ایک حصہ
میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ہندو اقلیت میں اور دوسرے حصہ میں ہندوؤں
کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں چونکہ ہندوستان کے ہندو پاکستان کے
ہندوؤں سے اور پاکستان کے مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں سے بے نیاز نہیں
رہ سکتے تھے اور پھر دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اطمینان دلائے بغیر ملک کی تقسیم عمل
میں نہیں آسکتی تھی اس بنا پر دونوں پارٹیوں میں جو ملک کی تقسیم کا معاملہ کر رہی تھیں
معاہدہ ہوا کہ ہر ملک کی اکثریت اپنی اقلیت کے ساتھ برابر کا معاملہ کرے گی اور اسے
مساوی درجہ کے شہری حقوق دے گی، یہ معاہدہ تقسیم کے وقت کاغذ پر ایک سیاسی
معاہدہ کی حیثیت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن کم از کم اخلاقی معاہدہ کی حیثیت سے

ضرور ہوا ہے اور اس کا ثبوت وہ بیانات و اعلانات ہیں جو اس زمانہ میں دونوں
کے ذمہ دار لیڈروں نے کئے اور دئیے تھے۔

پس یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کا قیام نہ مسلمانوں کی فوج کشی سے ہوا ہے اور نہ
سے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ باہمی سمجھوتہ اور معاہدہ کی رو سے ہوا ہے۔ علاوہ بریں
حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ساڑھے تین کروڑ
ایک ایسے ملک میں رہ جاتے ہیں جہاں اگرچہ اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے
اس ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کی عبادت گاہیں ہیں۔ مدارس ہیں۔ ملی ادارے
اور جابجا ان کے تاریخی و مذہبی مآثر بکھرے پڑے ہیں ان دونوں امور کو پیش نظر
کے بعد اصل مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے حسب ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے
اور انھیں کی روشنی میں موضوع گفتگو کا تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں۔

(۲) معاہدہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

(۳) ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری اور آئینی پوزیشن کیا ہے۔

(۴) اس پوزیشن کے پیش نظر پاکستان کا اپنی اقلیت کے ساتھ کیا معاملہ ہو

اب ہم ان امور تنقیح طلب میں سے ہر ایک پر نمبر وار گفتگو کرتے ہیں۔

مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں!

یوں تو تاریخ اسلام میں ہر قسم کے معاہدے ملتے ہیں یہاں تک
ہارون رشید نے شارلمان کے ساتھ اسپین کی اموی حکومت
کرنے کے ارادہ سے دوستانہ عہد نامہ کیا تھا۔ لیکن عہد نبوت
دو معاہدے ہیں جو اسی قسم کے مسائل کے لئے ایک بنیادی دلیل کی حیثیت رکھ
صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ سے جو معاہدہ کیا
اس درجہ مشہور ہے کہ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں البتہ یہ یاد رکھنے کے قابل

کہ اس معاہدہ میں بہ ظاہر مسلمانوں کا پلہ قریش مکہ کے مقابلہ میں کچھ بھاری نہیں تھا . . .
. . . . - چنانچہ قریش کے نمائندہ نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے اپنے نام مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر اعتراض کیا تو باوجود
بعض صحابہ کے احتجاج کے آپ نے اس کو خود اپنے دست مبارک سے مٹا دیا
اسی طرح معاہدہ میں ایک دفعہ تھی کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمانوں سے آملے گا تو اس کو مکہ
واپس کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی ادھر کا آدمی مکہ پہنچ جائے گا
تو قریش پر اس کا واپس کرنا لازمی نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر آپ سے تند لہجہ میں
احتجاج کیا جس کی ندامت ان کو مدت تک رہی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس دفعہ کو بھی منظور فرمالیا بہر حال صلح حدیبیہ کا واقعہ اس بات کا روشن
ثبوت ہے کہ اگر کسی وجہ سے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ ناگزیر ہو جائے اور اس میں
مسلمانوں کا پہلو مادی اور فوری نفع کے اعتبار سے کچھ دبا ہوا بھی نظر آئے تو مسلمانوں
کو اللہ کی مدد کے بھروسہ پر یہ معاہدہ ضرور کر لینا چاہیئے خدا نے چاہا تو یہی معاہدہ
ان کی آخری جیت کا سبب ہوگا۔

صلح حدیبیہ کے واقعہ کے علاوہ ایک اور معاہدہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد وہاں کے مختلف یہودیوں سے کیا تھا پاکستان
کی اقلیت کے شہری حقوق پر اس معاہدہ سے خاص طور پر روشنی پڑتی ہے سیرت
ابن ہشام اور کتاب المغازی وغیرہما میں اس کا مفصل تذکرہ ہے ہمارے موضوع
بحث سے اس معاہدہ کا صرف یہ حصہ متعلق ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول
ڈاکٹر محمد حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) یہودیوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی
وحدت بنائی تھی چنانچہ اس عہد نامہ کی پچیسویں دفعہ کا مضمون ہی یہ تھا کہ "بنو عوف
کے یہودی مومنوں کے ساتھ ایک امت (ایک قوم یا ایک سیاسی وحدت) تسلیم کئے

جاتے ہیں۔ یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین موالی ہوں کہ اصل ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کرے گا تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا پھر دفعہ ۳۷ الف میں ارشاد ہوا تھا کہ "جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان یہودیوں اور مسلمانوں میں باہم امداد عمل میں آئے گی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی سابق صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن اس معاہدہ کی نسبت بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر بڑی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت اس طرح دکھائی کہ آپ نے یہودیوں کے لئے ایک دستور مرتب فرمایا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہودی بھی نئی اسٹیٹ کے ایسے ہی شہری ہیں جیسے کہ خود مسلمان اور یثرب کے لوگوں کی دونوں شاخیں مل کر ایک قوم ہیں[1]"

معاہدہ کی ذمہ داریاں | اسلام کا اصل مقصد ہی تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن ہے اس بنا پر منافقت اور دل و زبان کی مخالفت سے بڑھ کر اس کے نزدیک کوئی اور گناہ نہیں ہے قرآن مجید میں ہے كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ اسی لئے معاہدہ پر قایم رہنے اور عہد و پیمان پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید جتنی اسلام میں ہے کہیں اور نہیں ملیگی۔ اسلام کے نزدیک شرک سے زیادہ قبیح اور کیا جنبر ہوگی لیکن اس کے باوجود حکم ہے کہ مشرکوں سے بھی اگر کوئی معاہدہ کر لیا گیا ہے تو جب تک وہ خود نہ توڑیں تم ہرگز نہ توڑو۔ سورۃ التوبۃ میں ہے

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ

---

[1] Muslim Political thought and administration P. 2

معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے مسلمانوں کی امداد سے اگر اس کا نقض لازم آتا ہو تو حکم ہے کہ معاہدہ کی پابندی کرو اور مسلمانوں کی مدد نہ کرو۔ چنانچہ سورۂ انفال میں ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا	جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ہجرت نہیں کی تم کو
مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ	ان کی کوئی ولایت (نگرانی) نہیں پہنچتی جب تک
حَتَّى يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ	کہ وہ ہجرت کریں اور اگر یہ لوگ دین کے معاملہ
فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى	میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد تم پر لازم ہے
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ	لیکن ہاں ان لوگوں کے برخلاف نہیں جن کے
	ساتھ کہ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔

غور کرو یہ آیت ہندوستان کے مسلمانوں پر جنہوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور پاکستان کی اقلیت جن کے ساتھ وہاں کی گورنمنٹ کا عہد ہے کس طرح منطبق ہو رہی ہے۔

چند فقہی جزئیات | قرآن مجید کی انہیں آیات اور بعض احادیث کو بنیاد بنا کر فقہا نے جزئیات مستنبط کئے ہیں ہم ذیل میں ان میں سے چند بیان کرتے ہیں۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے چلا گیا ہے اور اس نے وہاں کسی کا مال غصب کر لیا ہے یا کوئی نقصان پہنچا دیا ہے تو اگر اس کے بعد وہ مسلم حکومت میں پھر واپس آجائے اور جن لوگوں کا مال غصب کیا تھا وہ مسلم حکومت میں آکر اس مسلمان کے خلاف استغاثہ کریں تو مسلمان عدالت اس استغاثہ کو نہیں سنیگی۔ کیونکہ یہ واقعہ مسلم حکومت کے حدود کے باہر پیش آیا تھا چنانچہ اسی بنا پر اگر معاملہ برعکس ہو یعنی جو مسلمان غیر مسلم ملک میں چلا گیا تھا اس کے مال یا جائداد کو وہاں کے لوگوں نے کوئی نقصان پہنچا دیا ہے اور یہ شخص اپنے ملک میں واپس آکر ان غیر مسلموں کے خلاف کوئی استغاثہ کرے تو مسلم عدالت اس استغاثہ کو بھی نہیں سنے گی۔ البتہ ہاں جہاں تک

غیر مسلم حکومت میں رہ کر مسلمان کے کسی غیر مسلم کے مال کو غصب کرنے کا تعلق ہے تو چونکہ اس نے غیر مسلم حکومت کے ساتھ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے اس پر دباؤ ضرور ڈالا جائے گا کہ وہ مال اس کے مالک کو واپس کر دے اور کوئی مسلمان اس کو نہ خریدے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی شخص معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا قیامت کے دن اس کے سر پر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دھوکہ باز تھا۔[1]

اگر ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت سے اجازت لے کر چلا گیا ہے تو اسے جن شرائط پر یہ اجازت ملی ہے اس کا اسلامی فرض ہے کہ وہ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ان شرائط کو پورا کرے یہاں تک کہ اگر اس درمیان میں اسلامی ملک اور اس غیر مسلم حکومت میں جنگ چھڑ جائے تو اس مسلمان کا فرض ہے کہ غیر مسلم حکومت میں رہتے ہوئے اپنی اسلامی حکومت کی حمایت میں کوئی حرکت غیر مسلم حکومت کے خلاف ہرگز نہ کرے ورنہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔[2]

اسی سلسلہ میں علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ اگر دونوں ملکوں کی جنگ کی صورت میں اسلامی ملک کی عورتیں اور بچے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم (ذمی) گرفتار ہو کر غیر مسلم ملک میں جہاں وہ مقیم ہے لائے جا رہے ہوں اور وہ محسوس کرے کہ وہ ان عورتوں اور بچوں کی مدد کر سکتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ غیر مسلم حکومت نے اس کو جو امن دے رکھا ہے پہلے وہ اس سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دے اور پھر ان عورتوں اور بچوں کی مدد کرے، اس جزیہ میں دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) جب تک وہ غیر مسلم حکومت کے دیتے ہوئے امن کو رد کر دینے کا اعلان

---

[1] مبسوط ج ۱۰ ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۸

نہیں کرے گا خود اپنے ملک کی عورتوں اور بچوں کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ عہد شکنی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

(۲) ان عورتوں اور بچوں میں مسلمان اور غیر مسلمان کا کوئی فرق نہیں ہے دونوں کو جو اسلامی ملک کے باشندہ ہوں جہاں کا وہ خود بھی شہری ہے، ایک ہی حکم دیا گیا ہے

عدل گستری بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں انسان کو اپنے قول و قرار کا دھیان نہیں رہتا اور وہ ایسا کام کر بیٹھتا ہے جو اسے اپنے عہد و پیمان کے مطابق نہ کرنا چاہئے تھا۔ قرآن مجید میں اس پر بھی نہایت سختی سے متنبہ کیا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ	خبردار کسی قوم کا بغض تم کو اس پر آمادہ نہ کر دے
لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا۔ هُوَ اَقْرَبُ	کہ تم انصاف نہ کرو نہیں بلکہ تم انصاف ہی کرو
لِلتَّقْوٰى	یہی تمہارے لئے پاکی کا سب سے قریبی راستہ ہے

اسلام نے عدل کی اہمیت و عظمت مسلمانوں کے دل و دماغ پر کس درجہ حاوی کر دی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سیاست نامہ کا مصنف لکھتا ہے "حکومت کفر کے ساتھ رہ سکتی ہے لیکن ظلم اور ناانصافی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی"[1] مسلمان حکمرانوں نے عدل کی جو نادرۂ روزگار مثالیں قائم کی ہیں تاریخ کے صفحات ان سے بھرے پڑے ہیں خود ہندوستان میں دہلی سلطنت کے بعض واقعات ایسے ہیں جن پر آج یقین کرنا بھی مشکل ہے سلطان محمد بن تغلق کو کون نہیں جانتا کس قدر تند مزاج اور درشت طبع بادشاہ تھا لیکن اسلام نے جو ایک خاص ماحول پیدا کر دیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ ابن بطوطہ قیام دہلی کے زمانہ کا خود اپنا چشمدید واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ہندو نے قاضی کی عدالت میں فریاد کی کہ بادشاہ نے اس کے لڑکے کو بلا وجہ دخطا مارا ہے قاضی نے عدالت میں بادشاہ کو مدعی علیہ کی حیثیت سے طلب کیا۔ محمد بن تغلق

[1] ص ۸

عدالت میں آیا تو قاضی کو تاکید کی کہ وہ اس کے احترام کے لئے کھڑا نہ ہو۔ مقدمہ شروع ہوا اور قاضی نے دونوں طرف کے بیانات وغیرہ سننے کے بعد فیصلہ بادشاہ کے خلاف کیا۔ اس پر بادشاہ نے کوڑا خود ہندو لڑکے کے ہاتھ میں دیا اور باصرار کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی اسی طرح مار۔ یہ واقعہ ضیاء الدین برنی نے بھی بیان کیا ہے اور دوسرے مورخوں نے بھی اسے نقل کیا ہے لیکن ابن بطوطہ نے اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات محمد بن تغلق کے متعلق بیان کیے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ سلطان میرا مقروض ہے تو نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان خود قاضی کے سامنے مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے پیش ہوا اور عدالت کے فیصلہ کے مطابق اس نے قرض ادا کیا۔

غیاث الدین بلبن کو ایک گورنر کی نسبت معلوم ہوا کہ اس نے کسی شخص کو نشہ کے عالم میں قتل کر دیا ہے تو اس نے گورنر کو سخت ترین سزا دی۔ سلاطین دہلی نے "حسبہ" کے نام سے ایک مستقل محکمہ قایم کر رکھا تھا۔ اس محکمہ کا افسر محتسب کہلاتا تھا اور اس کا فرض عصامی کے بقول یہ تھا کہ وہ ملک میں کسی قسم کی اخلاقی بے عنوانی نہ ہونے دے اور کوئی طاقتور کسی کمزور پر دست درازی نہ کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن

اب آئیے یہ دیکھیں کہ بھارت میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن کیا ہے ؟ اور اس کے پیش نظر از روئے تعلیمات اسلام پاکستان میں وہاں کی اقلیتوں کی حیثیت (status) کیا ہونی چاہیئے ظاہر ہے کہ بھارت کے دستور نے یہاں کی حکومت کو غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ قرار دیا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو بھی بھارت کا ایسا ہی نیشنل مانا گیا ہے جیسا کہ خود ہندو ہیں اور شہری حقوق اور شہری آزادی کے لحاظ سے ان میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے ہر محکمہ اور ہر منصب کے دروازے ہندو اور مسلمان دونوں پر یکساں کھلے رکھے گئے ہیں اور پورے طور پر نہ سہی جو بعض ناگزیر اسباب کا نتیجہ ہے کسی نہ

ـسی شکل میں اس کا عملی ثبوت موجود بھی ہے۔ پس جہاں تک دستور ہند، گورنمنٹ کی پالیسی
ور ذمہ دارانِ حکومت کے اعلانات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ملک
یں مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو اکثریت کے برابر حقوق
یئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ فقہا نے لکھا ہے جس ملک میں ایسی صورت
حال ہو یعنی اس میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنے معاملات میں آزاد ہوں اور
حکومت میں کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کا بھی دخل ہو وہ ملک مسلمانوں کے لئے دارالاسلام ہی
کہلائے گا۔ چنانچہ درمختار میں ہے۔

ودار الحرب تصير دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیہا کجمعۃ وعید

اور غیر مسلموں کا ملک جمعہ اور عید ایسے احکام کے جاری ہو جانے سے دارالاسلام ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس مسئلہ کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

وبھذا ظھر بجبل اللاس دروز وبعض البلاد التابعۃ لہ کلھا دار اسلام لانھا وان کانت لھا احکام دروز او نصاریٰ ولھم قضاۃ علی دینھم وبعضھم یعلنون بشتم الاسلام والمسلمین لکنھم تحت حکم ولاۃ امورنا[1]

اور جبل دروز (شام) اور اس کے بعض ملحقہ شہروں میں ایسا ہوا بھی ہے۔ یہ تمام شہر دارالاسلام ہیں۔ کیونکہ یہاں اگرچہ دروز یا عیسائیوں کے احکام چلتے ہیں اور انھیں کے ہم مذہب جج بھی ہیں جن میں سے بعض بعض اسلام اور مسلمانوں کو کھلے بندوں سب و شتم بھی کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمارے حکام کے نیچے ہیں (یعنی یہاں مسلمان حاکم بھی ہیں جن کے ماتحت یہ لوگ بھی ہیں)

احسان کا بدلہ احسان | پس جب کسی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن یہ ہو تو اب

[1] الدر المختار ج ۳ ص ۲۵۰

اس کے ہمسایہ اسلامی ملک کا دینی اور مذہبی فرض ہے کہ بحکم ھل جزاء الاحسان الا الاحسان اپنے ہاں کے غیر مسلموں کو بھی یہی مرتبہ اور مقام دے۔ فقہ کی کتابوں میں عام طور پر یہ حکم پایا جاتا ہے کہ اگر دار الحرب کی حکومت مسلمانوں کے ساتھ کوئی مراعات کر رہی ہے تو اسلامی حکومت کو چاہیئے کہ اس کے جواب میں وہ بھی دار الحرب کے رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ اس جیسا بلکہ اس سے بھی اچھا معاملہ کرے۔ چنانچہ شرح وقایہ[1] میں ہے:۔

وان علم قدر ما اخذ منا اھل الحرب فعاشر نا یاخذ من الحربی مثل ذالک	غیر مسلم حکومت مسلمانوں سے جو کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے اگر اس کی مقدار ہم کو معلوم ہو تو ہماری اسلامی حکومت کا کسٹم آفیسر بھی غیر مسلم سے اتنی ہی کسٹم ڈیوٹی لے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجۂ بالا حکم صرف اس وقت ہے جبکہ غیر مسلم کا مال تجارت بقدر نصاب ہو اور غیر مسلم حکومت مسلمان سوداگر سے اس کے مال کا کچھ حصہ بطور کسٹم ڈیوٹی کے وصول کرتی ہو، ورنہ اگر غیر مسلم حکومت مسلمان تاجر کا پورا مال ہی قبضہ میں کر لیتی ہو یا غیر مسلم کا مال بقدر نصاب نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں اسلامی حکومت غیر مسلم حکومت کی پیروی نہ کرے گی بلکہ اس کے جبر و تشدد اور ظلم کے باوجود خود وہی کرے گی جو اسے از روئے انصاف کرنا چاہیئے، شرح وقایہ میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد ہی ہے۔

لو اخذوا کل اموالنا فعاشرنا لا یاخذ کُلَّ اموال الحربی المار ولا من قلیلہ وان اقرّ بباقی النصاب فی بیتہ	اگر غیر مسلم حکومت کے عمال مسلمانوں کے کل مال پر قبضہ کر لیتے ہوں تو ہمارا کسٹم آفیسر غیر مسلم مسافر کے کل مال پر قبضہ نہیں کرے گا اسی طرح اگر اس مسافر کا مال نصاب سے کم ہو تو اس وقت بھی وہ کسٹم ڈیوٹی نہیں لے گا اگرچہ یہ شخص ڈیوٹی دینے پر

[1] شرح وقایہ باب العاشر

مصر ہوا در کہتا ہو کہ اس کے گھر میں مال بقدر نصاب

موجود ہے۔

صاحب درمختار نے اس کی جو توجیہہ کی ہے ذرا وہ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں۔

لانہ ظلم ولا متابعۃ علیہ[1]

غیر مسلم حکومت میں مسلمان سوداگر کے پورے مال کے ہتیائے جانے کے باوجود اسلامی حکومت میں غیر مسلم مسافر کے پورے مال پر بطور جوابی کارروائی کے قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنا ظلم ہے اور پیروی ظلم میں نہیں ہوتی ہے

اس کے برعکس اگر غیر مسلم حکومت میں مسلمان تاجر سے ڈیوٹی بالکل نہ لی جاتی ہو تو اسلامی حکومت اس کے جواب میں غیر مسلم سوداگر سے بھی کچھ نہ لے گی خواہ اس کا مال کتنا ہی زیادہ ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ صاحب درمختار لکھتے ہیں۔

لیستمروا علیہ ولانا احق بالمکارم

ہم ایسا اس لئے کریں گے تاکہ غیر مسلم حکومت مسلمان تاجروں کے ساتھ اس اچھے معاملہ کو جاری رکھے اور پھر عمدہ اخلاق تو ہم کو بدرجہ اولیٰ دکھانے چاہئیں

جو لوگ بات بات میں انتقام انتقام کا نعرہ لگانے کے خوگر ہیں انھیں دل کی آنکھ کھول کر ان تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ اسلام کس طرح ہر حالت میں عدل وانصاف کے بلند مقام سے نیچے نہیں اترتا۔

سطور بالا میں جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس کی روشنی میں اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ

(۱) پاکستان کا قیام چونکہ ہندو مسلم سمجھوتہ سے ہوا ہے اور اس مفاہمت کے ساتھ ہوا ہے کہ پاکستان کی اقلیت کو وہاں کے مسلمانوں کے برابر شہری حقوق ملیں گے۔

---

[1] درمختار ج ۲ ص ۵۶

اس بنا پر اسلامی حکومت ہونے کا ہی تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مساوی درجہ کے شہری حقوق دے جائیں اور اس بارہ میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جائے۔

(۲) اگر قیام پاکستان اس سمجھوتہ کے ساتھ نہ بھی ہوتا تب بھی چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل ہیں اس بنا پر پاکستان گورنمنٹ کا یہ اسلامی فرض تھا کہ وہ بھارت کے مسلمانوں کی خاطر اپنے ہاں کی غیر مسلم اقلیت کو یہ حقوق و مراعات دیتے۔

دہلی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پاکستان کا قیام تو باہمی سمجھوتہ اور آپس کے معاہدہ کے ساتھ ہوا ہے یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مسلمانوں نے جس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا انھوں نے اس میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا ہے۔ پوری تاریخ کو چھوڑ دیجئے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سے بھی عہد مغلیہ پر صرف نظر کر لیجئے کہ مغلوں کا جو معاملہ رہا ہے سوائے اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے اور کسی بادشاہ سے ہندوؤں کو بھی شکایت نہیں رہی۔ صرف دہلی سلطنت کو لیجئے اس سلطنت کا معاملہ یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ یہ تھا کہ معز الدین کیقباد نے حکومت کے طلائی سکہ تک پر ہندو دیبی کی تصویر نقش کرا رکھی تھی۔[1] برہمنوں اور مندروں کے پجاریوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور ان کو ٹیکس سے آزاد رکھا گیا تھا ہندوؤں کی غیر انسانی رسم یعنی ستی تک کو ایک مذہبی رسم ہونے کی وجہ سے باقی رہنے دیا گیا تھا مذہبی آزادی کا یہ عالم تھا کہ فیروز خلجی خود اس کا اقرار کرتا ہے کہ "ہر روز ہندو میرے محل کے نیچے سے سنکھ اور گھنٹی بجاتے ہوئے گذرتے ہیں تاکہ جمنا کے کنارہ پر پہنچ کر اپنے بتوں کی پوجا کریں۔ میں اسلام کا محافظ ہوں لیکن اس کے باوصف یہ لوگ ڈھول پیٹتے ہیں۔ گاتے بجاتے ہیں، مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور خود میرے دارالسلطنت میں مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ شان و شوکت اور طمطراق سے رہتے ہیں ان کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔[2] دہلی کے پرانے قلعے سے ایک کتبہ جو فارسی اور

---

[1] The Foundation of Muslim Rule India P. 300 [2] ضیاء الدین برنی ص ۲۱۷

سنسکرت میں لکھا ہوا ہے دستیاب ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ بارہ بیگہ زمین حکومت کی طرف سے ایک مندر کے لئے عطا کی گئی تھی جو سری کرشن کے نام پر نیا نیا تعمیر ہوا تھا[1]
اس سلطنت میں ہندوؤں کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ برنی کو شکایت ہے کہ خاص دہلی شہر میں ہندو بڑے بڑے شاندار محلات میں رہتے ہیں، اعلیٰ قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر طمطراق سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مسلمان نوکر اُن کے گھوڑوں کے آگے دوڑے دوڑے چلتے ہیں۔ ان ہندوؤں کو جب مسلمان خطاب کرتے ہیں تو رائے ۔ رانا ۔ ٹھاکر ۔ شاہ ۔ مہتا ۔ اور پنڈت وغیرہ ایسے باعزت القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں۔

آخری گذارش | آخر میں یہ گذارش اور کرنی ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوست کہتے ہیں کہ پاکستان گورنمنٹ جب تک اسلامی حکومت رہے گی اور سیکولر گورنمنٹ نہیں بنے گی وہاں کی اقلیت میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکتی، عرض یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا جب تک عنوان قایم رہے گا وہاں کی گورنمنٹ اور عوام پر خدا کا خوف اور مذہب کا پاس غالب رہے گا اور اس بنا پر وہ اقلیت کے ساتھ مساویانہ برتاؤ اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کریں گے اس کے برخلاف سیکولر گورنمنٹ ہونے کی شکل میں جب تک عوام انتہائی شائستہ نہ ہوں خاطرخواہ نتائج کی امید نہیں ہو سکتی۔

---

[1] مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے۔
The Foundation of Muslim Rule in India. P. 298.
99.300

تدوین حدیث

(۴)
محاضرہ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

دہی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نعم (ہاں) فرماتے ہوئے ان الفاظ کو دہرایا کہ

لاینبغی لی ان اقول فی ذلک الاحقا مسند احمد ج ۲ ص ۲۰۷	میرے لئے جائز نہیں ہے کہ اس حال میں (یعنی بحالت غضب بھی) نہ کہوں مگر حق ہی۔

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ معلومات کے حفظ ونگہداشت اور ان پر اعتماد کے لئے خواہ مخواہ نہ سوچنے والوں نے کتابت کے طریقہ کو غیر معمولی جو اہمیت دے رکھی ہے اس کے مقابلہ میں زبانی یاد کرنے کے طریقہ کو اس سلسلہ میں بے قیمت ٹھہرانے پر غل مچایا جارہا ہے۔ یہ دونوں ناسمجھی کی باتیں ہیں۔ علم کی حفاظت کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں مگر ذریعہ اعتماد کے لئے ذمہ داریوں کو ان لوگوں پر عائد کرنا ہے جو اس سے کام لینا چاہتے ہیں اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل خود بخود آدمی کی فطرت کو اعتماد پر مجبور کردیتی ہے اور جیسے یہ انسانی فطرت کا ایک طبعی قانون ہے اسی طرح ان ذمہ داریوں سے لاپروائی ہر حال میں اشتباہ اور بدگمانیوں کی گنجائش پیدا کردیتی ہے۔ خواہ کتابت کے ذریعہ کو اختیار کیا جائے، یا زبانی یادداشت کے طریقے کو، تاہم عصر حاضر کے نابالغ عقول کے تقاضوں کی تسکین کا ایک ذریعہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ کتاب بھی بن گئی ہے آج کل

کے متکلمین اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، کچھ بھی ہو ایک پہلو نفع کا اس واقعہ میں یہ بھی نکل آیا ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض کتابوں مثلاً مستدرک حاکم اور البغوی کی کتاب میں یہ روایت جو پائی جاتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لکھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھا ہوا ایک مجموعہ تھا جس کے متعلق وہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پیش کی ہوئی کتاب ہے۔ اس روایت کا میں ذکر کر چکا ہوں، ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی اسی اجازت کو دیکھ کر حضرت انس کے دل میں بھی ان کی ریس کا جذبہ پیدا ہوا ہو بہرحال حضرت انس کے حالات میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں یہ کہتے ہوئے پیش کیا تھا کہ

ھذا ابنی وھو غلام کاتب	یہ میرا لڑکا ہے اور ایسا لڑکا ہے جو کاتب ہے
ص۱۲ ابن سعد ج، ق ا	یعنی لکھنے سے واقف ہے۔

حضرت انس چوں کہ آخر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، خود فرماتے تھے نو سال تک حضور کی خدمت میں رہا گویا وہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاص ہمجولی تھے۔ لکھنا بھی آتا ہی تھا، اور پھر بارگاہ نبوت میں رسوخ کا حال یہ تھا کہ بسا اوقات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یا بنی (میرے بیٹے) کے لفظ سے پکارتے تھے، ایسے چہیتے خادم کی بات کا ٹال دینا اور وہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی با مروت طبیعت سے آسان نہ تھا میں سمجھتا ہوں کہ یہی وجہ سے ان کو بھی حدیثوں کے قلم بند کرنے کی اجازت مل گئی کیونکہ ایک دو آدمی کے لکھنے سے ظاہر ہے کہ عمومیت کا وہ رنگ کیسے پیدا ہو سکتا تھا، جو قرآن کے صحیفوں کی عام اشاعت سے پیدا ہو چکا تھا، کچھ ایسا خیال بھی ہوتا ہے کہ گو حضرت انس بچپن ہی سے لکھنا جانتے تھے اور کاتب ہو چکے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہاں عبداللہ بن عمرو کی مہارت و حذاقت، بھلا جس شخص نے عربی چھوڑ سریانی اور

عبرانی خطوط اور زبان کو بھی سیکھ لیا ہو ان کا مقابلہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا کر سکتے تھے لحضرت انس جو یہ کہتے تھے کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نسخہ کو پیش بھی کر لیا تھا اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو غالباً مشورہ دیا ہو گا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے مجھے سنا بھی دو، عبداللہ بن عمرو کے نسخے کے متعلق پیش کرنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں آیا ہے، شاید ان کی تحریری عذاقت پر اعتماد تھا اور ان پر اعتماد نہ کیا جاتا تو کس پر کیا جاتا، آئندہ یعنی عہد نبوت کے بعد ان دونوں کتابوں کی حیثیت کیا رہی اس تفصیل کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا، اس وقت تو عہد نبوت تک کے واقعات کا صرف ذکر مقصود ہے۔

بہر حال عام حدیثوں کے متعلق "کچھ وارد مریزیہ" کی مذکورہ بالا حکمت عملی یعنی جو پانا چاہیں ان تک پہنچ بھی جائے لیکن اس طور پر نہ پہنچے کہ ان حدیثوں کے مطالبات کی قوت عمومی راہ سے منتقل ہونے والے دینی عناصر کے برابر ہو جائے انتہائی نزاکتوں کے ساتھ اس حکمت عملی کی نگرانی کرتے ہوئے ایک خاص حال میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان حدیثوں کو چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے جو آج خبر احاد کی شکلوں میں پائی جاتی ہیں گویا سمجھنا چاہئے کہ علاوہ ان خطوط، معاہدے نامے، یا مختلف اقوام و افراد کے نام ہدایت نامے یا صدقات وغیرہ کے تحریری ضابطے جن کے چند نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے یا حجۃ الوداع کے خطبہ کو ابو شاہ یمنی کے لئے لکھوا کر عطا فرمانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں ان متفرق چیزوں کے سوا حدیث کی یہی دو کتابیں یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص والا نسخہ اور دوسری کتاب حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی ان دو کتابوں کے سوا اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ واقعہ تحریق (جلانے) کے بعد صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی حدیثوں کو کتابی شکل دی ہو، یا ان کو قلمبند کیا ہو، ممکن ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو آئندہ شاید اس سلسلہ میں کوئی اور نئی چیز

ہاتھ آ سکے۔ کچھ بھی ہو حدیثوں کے ان انفرادی نسخوں سے وہ حکمت عملی متاثر نہیں ہو سکتی تھی جو اپنی عام حدیثوں کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی جیسے ان مکتوبہ خطوط و معاہدات وغیرہ میں بھی محض قلم بند ہو جانے کی وجہ سے وہ کیفیت نہ پیدا ہوئی اور نہ پیدا ہو سکتی تھی جو مثلاً قرآن میں پیدا ہو چکی تھی، کیونکہ عمومیت یا استفاضہ عام، شہرت بین الانام کا تعلق کتابت سے نہیں بلکہ تعدد و کثرت سے ہے، ایک خط اگر لکھا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی خط کی شکل میں رہ گیا بھلا وہ قرآن کے ان نسخوں کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا جو گھر گھر میں پھیلا ہوا تھا مشہور حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن فرما رہے تھے کہ مسلمانوں سے آخر یہ علم اٹھ جائے گا، یعنی پیغمبر سے جو جدید علم مسلمانوں کو میسر آیا ہے اس کا چرچا باقی نہ رہے گا، کہتے ہیں کہ ایک صحابی جن کا نام زیاد بن لبید انصاری تھا، انھوں نے عرض کیا کہ اب یہ علم کیسے مٹ سکتا ہے قرآن کی اشاعت جس وسیع پیمانے پر اس وقت تک ہو چکی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے زیاد نے اس وقت عرض کیا تھا کہ

کیف یرفع العلم منا وبین اظہرنا کتاب اللہ وقد تعلمنا ما فیہ وعلمنا ونسائنا وذریتنا وخدمنا (۲۰۰)	ہم لوگوں میں سے علم کیسے اٹھ جائے گا۔ حالانکہ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے اس کتاب میں جو کچھ ہے اسے ہم نے خود سیکھا ہے اور اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو اپنے خادموں کو سکھایا ہے۔
مجمع الزوائد ج۱	

الفاظ کے تھوڑے رد و بدل سے ترمذی وغیرہ صحاح کی کتابوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ عورتوں، بچوں، حتیٰ کہ خادم و ملازمین تک کو اس زمانے میں جب یہ کتاب پڑھائی جا چکی تھی تو اس عمومیت و استفاضہ کا مقابلہ بھلا وہ مکتوبہ سرطے کیا کر سکتے تھے جو اکے دکے گنتی کے چند آدمیوں کے پاس موجود تھے۔

یہی بات تو یہ ہے کہ دین کے جس حصہ کی تبلیغ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی رنگ میں فرمائی تھی، جس کی بدولت آئندہ ہر زمانہ میں ان کی حیثیت ان امور کی ہو گئی جن کا علم تواتر و توارث و تعامل کی شکل میں اس وقت تک منتقل ہوتا ہوا مسلمانوں کی اگلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچ رہا ہے اسلامی دین کے ان قطعی اور یقینی عناصر و اجزا کے متعلق علم و یقین کی جو کیفیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابیوں کی تھی۔ قطعاً یہی کیفیت اس علم کی بھی ہے جو ان ہی امور کے متعلق مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تواتر کی راہ سے پیدا ہونے والے علم میں اور وہ علم جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے دونوں میں قطعیت اور یقین کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا، میں پوچھتا ہوں جن لوگوں نے مثلاً لندن کو دیکھا ہے اور اس شہر کے متعلق مشاہدے سے جس یقین کو پیدا کیا ہے اس یقین میں اور ان لوگوں کے یقین میں جنہوں نے لندن کو خود نہیں دیکھا ہے مگر تواتر کی راہ سے اس بات کا یقین ان میں پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے شہروں میں ایک شہر لندن بھی ہے اس حد تک یعنی لندن کا وجود یقینی ہے، کیا ان دونوں یقینوں میں کسی قسم کا فرق پیدا کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ جن لوگوں نے لندن کو نہیں دیکھا ہے محض اس لئے ان کے یقین میں شک اور احتمال اسی قسم کا شک اور احتمال ہو گا جیسے ان لوگوں کے متعلق جو لندن جا چکے ہیں وہاں رہ چکے ہیں ان کے متعلق شبہ پیدا کرنے والا یہ شبہ پیدا کرے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا سب خواب کی حالت میں دیکھا تھا۔ یا آنکھ کا دھوکہ تھا جو لندن کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا ورنہ واقع میں کچھ نہ تھا، ظاہر ہے کہ اس قسم کے احتمالات وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن کی عقل کسی بیماری کی وجہ سے اپنے فطری حدود سے ہٹ گئی ہو۔ فخر الاسلام بزدوی نے اسی لئے شریعت کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو تواتر کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے، یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

حتی صار کالمعائن المسموع — ان کی حالت ایسی ہے جیسے خود کسی معائنہ
ص۳۶۱ ج ۲ — کی ہوئی یا براہ راست سنی ہوئی شی کی ہو سکتی ہے

ان کا دعویٰ ہے کہ یہ حال صرف قرآن ہی کا نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ انھوں نے اسی راہ سے منتقل ہونے والی بہت سی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد الرکعات ومقادیر الزکوٰۃ وما اشبہ ذلک ص۳۶۱ ج ۲ — جیسے قرآن کے منتقل ہونے کا حال ہے اور یہی حال پانچوں وقتوں کی نمازوں کا، نمازوں کی رکعتوں کا، زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں کا اور ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابہ جو عہد نبوت میں موجود تھے، شریعت کے اس حصہ کے متعلق ان کے یقین کی جو نوعیت تھی، یہی نوعیت اس یقین کی مسلسل باقی رہی ہے اسی لئے ان امور کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، یا اس کے بعد پیدا ہوئے، علامہ ابو زید دبوسی نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقویم میں لکھا ہے۔

وحتی ارتفعت الشبہۃ فصار المتصل منہ بک الحاسۃ سمعت (کشف ص۳۶۲ ج۲) — (تواتر کی وجہ سے) جب شبہ باقی نہ رہا تو اس راہ سے جتنی چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہو کر تم تک پہنچی ہیں ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ براہ راست اپنے کان سے تم نے ان کو سنا ہو۔

اسی طرح صاحب مسلم کے ان الفاظ کے تحت یعنی

ان التواتر لیس من مباحث علم الاسناد

تواتر کا تعلق ان مباحث سے نہیں ہے جن میں روایت کی سند سے بحث کی جاتی ہے

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم نے بھی لکھا ہے کہ

بل التواتر کالمشاہدۃ فی افادۃ العلم فواتح الرحموت ج ۲ مطبوعہ مصر ص۱۱۹

یقین آفرینی میں تواتر کا حال وہی ہے جو حال مشاہدہ کا اس سلسلہ میں ہے۔

پھر مولانا نے ایک دلچسپ مثال سے اس کو سمجھانا چاہا ہے یعنی بخاری میں بعض روایتوں کو ثلاثیاتِ بخاری کہتے ہیں، یہ ان روایتوں کا نام ہے جن میں امام بخاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کل تین آدمی کا واسطہ واقع ہوتا ہے مولانا بحر العلوم نے ان ہی ثلاثیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بخاری کے بعد تو ان کی کتاب متواتر ہوگئی اس نے بخاری کے بعد آئندہ صحیح بخاری کے ان سارے ثلاثیات کی حیثیت ہر مسلمان کے لئے رباعیات کی ہوگئی ہے، مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

ومن ثمہ کان ثلاثیات البخاری رباعیات لنا لان صحیحہ متواتر عنہ فکانا سمعنا من البخاری فلم یزد الا واسطۃ وھی نفسہ فواتح ص۱۱۹ ج ۲

اسی بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ بخاری کے ثلاثیات (یعنی تین واسطوں والی روایتیں) ہمارے لئے رباعیات کی حیثیت رکھتی ہیں (یعنی چار واسطوں والی روایتوں کی حیثیت ان کی ہوگئی) وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کی کتاب (صحیح بخاری) امام بخاری کے لحاظ سے تو متواترہ ہو چکی ہے پس گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے اس کتاب کو براہ راست امام بخاری ہی سے سنا ہے اس لئے (ثلاثیات) کے متعلق صرف ایک ہی واسطہ کا تو اضافہ ہوا، یعنی خود امام بخاری کی ذات

نے چوتھے واسطے کی حیثیت اختیار کرلی۔

بہرحال شروع ہی سے اس کا باضابطہ نظم کردیا گیا تھا کہ دین کے ایک حصہ کی حیثیت تو ایسی ہوجائے جس کے علم میں قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کے اعتماد کا حال قدرتی طور پر ایک ہوجائے۔ قرآن اور ایسی ساری چیزیں جو اسی راہ سے مسلمانوں میں پیغمبر کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ جس رنگ میں قرآن منتقل ہوتا چلا آرہا ہے ان کی بھی کیفیت ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دین کے اس حصہ کو اسی حال میں چھوڑ کر رفیق اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے اور بحمد اللہ اس وقت تک دین کا یہ حصہ اسی رنگ میں مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، آئندہ بھی خدا سے امید ہے کہ اس کی اس کیفیت کی حفاظت فرماتا رہے گا۔ دین کے اس حصہ کے علم ویقین میں اشتباہ واضمحلال کے پیدا ہونے کی وہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ خدانخواستہ مسلمانوں کو تاریخ کے آئندہ زمانہ میں محکومیت کی کسی ایسی ملعون کیفیت میں اپنے کرتوتوں کے بدولت مبتلا ہونا پڑے، جیسے یہود وغیرہ گذشتہ ملعون قوموں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ غیر قوموں کو ان پر مسلط کیا گیا اور یہ تسلط اتنا سخت تھا کہ اپنے دین کے نام لینے کی بھی اجازت محکومیت کی حالت میں ان کو نہیں دی جاتی تھی، ان کی کتابیں غایب ہوگئیں، ان کے علماء چن چن کر قتل کر دیئے گئے، کوشش کی گئی کہ آئندہ ان کی پیدا ہونے والی نسلوں کے کان میں دین موسیٰ اور اس کی کسی بات کی کوئی بھنک بھی ان کے کانوں میں نہ پڑنے پائے، صدیاں اسی حال پر گذر گئیں جو جانتے تھے وہ مر گئے، اور جو زندہ رہے انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے آباء واجداد کا کوئی دین بھی تھا یا اللہ کے کسی برگزیدہ رسول کی وہ بھی امت ہیں ان کے رسول کی ۔ ۔ ۔ ۔ ، بھی کوئی کتاب تھی؛ یہودیوں کی تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے ان کو تاریخ کے طویل ادوار میں دوچار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی جگر خراش روح فرسا شکل حق تعالیٰ کے عتاب کی ہے کہ خدا کے غضب کی اس آگ میں جو کچھ بھی نہ جل جائے اس

پر متعجب نہ ہونا چاہیئے تاہم بیچارے یہودیوں کو جب کبھی سر اٹھانے کا موقعہ ملا ادھر ادھر سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پھر اپنے گم شدہ دین کو کسی راہ سے جیسا کہ ان کا خیال ہے پالینے میں وہ کامیاب ہوتے ہیں لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی تاریکیوں میں ان کو گھرنا پڑا ہے کہ مشکل ہی سے یہ کہا جا سکتا ہے جو دین ان کے پاس اس وقت جس شکل میں پایا جاتا ہے وہ واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیا ہوا اور پہنچایا ہوا دین ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں کے دین کی ابتدا ہی سلطنت سے ہوئی اور گو پچھلی چند صدیوں سے دنیا کی سیاسی امامت کی باگ ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے لیکن دین کی حد تک بحمد اللہ کوئی ایسا واقعہ ان کے ساتھ اب تک پیش نہیں آیا ہے کہ درمیان میں صدی دو صدی تو بڑی بات ہے گھنٹے دو گھنٹے کے لئے بھی اس دین سے وہ جدا نہیں ہوتے ہیں جسے وراثت میں ان کے پچھلے اگلوں سے پاتے چلے آ رہے ہیں، اگرچہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مہیب خطرات آنکھیں دکھا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس واقعہ کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ گذشتہ زمانے کے معلومات کی حفاظت کے اتنے بے شمار اسباب و ذرائع قدرتی طور پر اس عہد میں پیدا ہو چکے ہیں اور پریس و طباعت وغیرہ کے رواج کی بدولت ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ اس زمانہ میں معمولی چیزوں کا مٹانا بھی آسان نہیں ہے۔ پھر اسلامی بینات جو اس وقت دنیا کے اکثر حصے کے کروڑہا کروڑ باشندوں میں کتابی و عملی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے یقین میں اضمحلال پیدا کرنے کی کوشش بہ ظاہر مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے کچھ اس کا خیال بھی آتا ہے کہ "اسلام کی محمدی شکل" جب انسانی زندگی کے اس دستور العمل کی جس پر پیدا کرنے والا اپنے بندوں کو چلانا چاہتا ہے اس کی جب یہ آخری شکل ہے تو ارحم الراحمین کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ نہ چلنے والے باغیوں کی وجہ سے دین پر چلنے کی راہ ان لوگوں کے لئے بھی بند کر دے گا۔ جو بہرحال اسی راہ پر چلتے ہوئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں، امید تو اسی کی ہے کہ ان کے لئے سچے دین پر

چلنے کا امکان بہر حال باقی رکھا جائے گا جیسا کہ عرض کیا گیا گو یہ حالت تاگفتہ بہ حدود تک بگڑتے ہوتے پہنچ چکی ہے جس کے بدلنے کے لئے دوسری عام تدبیروں کے ساتھ زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ خود مسلمان دین پر چلنے کے جذبہ کو نئے سرے سے زندہ کریں، ورنہ قدرت ہی کا ایک قانون ہے کہ طلب کسی چیز کی جب باقی نہیں رہتی تو رسد بھی بند کر دی جاتی ہے پچھلے دنوں کے سارے جاں گداز حالات سچ پوچھئے تو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے لیکن واقعہ کا اظہار کیسے نہ کروں کہ بہ نسبت دوسروں کے یہ حال زیادہ تر اکتا جانے کی اسی کیفیت سے پیدا ہوا ہے جو دین کے متعلق خود مسلمانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بدقسمتی سے پیدا ہو گیا ہے اور آہ! کہ اس وقت تک بجائے گھٹنے کے عملی طور[1] پر اس کیفیت میں کمی تو کیا پیدا ہوتی، بہ ظاہر شدت ہی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خیر میں کدھر نکل گیا آئندہ کیا ہونے والا ہے، علیم و خبیر ہی اسے جان سکتا ہے اور اس وقت مستقبل کے متعلق مجھے کچھ لکھنا بھی نہیں ہے بلکہ اس وقت تک جن حالات سے گذرتے ہوئے موجودہ نسلوں تک دین پہنچا ہے میری بحث کا دائرہ اسی حد تک محدود ہے عرض یہ کر رہا تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم امت میں دین کو جس حال میں چھوڑ کر تشریف

---

[1] "عملی طور پر" کا اضافہ میں نے جس لئے کیا ہے، ہر مسلمان جو اپنے حال سے واقف ہے غالباً اس اضافہ کی ضرورت تسلیم کرے گا بعض علاقوں میں جہاں غیر قوموں سے مسلمانوں کو کش مکش کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہاں دیکھا جا رہا ہے کہ دین کی طرف واپسی کا چرچا زبانوں پر کچھ دنوں سے ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے، لیکن جس سے معاملہ ہے کاش! بجائے "سمیع و علیم" ہونے کے وہ صرف "سمیع" ہی ہوتا تو امید کی جا سکتی تھی کہ صرف سنا کر اس کو منا لینے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے لیکن سننے کے ساتھ جو دیکھتا بھی ہے اور ہر چیز جس حال میں ہے اس کو جانتا بھی ہے اس کے سامنے اس قسم کے چرچے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ ربنا ولا تحمل علینا وارحمنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا ربنا ولا تجعلنا فتنة للقوم الظالمین ۱۲

لے گئے تھے۔ اس وقت ایک حصہ کی حالت تو وہی تھی جسے تبلیغِ عام کی راہ سے ایک ایسا قالب عطا کر دیا گیا تھا کہ اس کی یافت میں اگلوں پچھلوں کی حالت کا ایک ہو جانا ناگزیر تھا۔ بحمد اللہ کہ ہزار سال کے بعد بھی چند صدیاں گذر چکی ہیں، اس وقت تک دین کا یہ حصہ اسی حال میں موجود ہے۔ اور دوسرا حصہ دین ہی کا تھا جس کے متعلق اگلوں اور پچھلوں کو تو کیا برابر کیا جاتا، خود عہد نبوت میں جو موجود تھے ان لوگوں میں بھی اس کی اشاعت عمومی شکل میں اسی لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس میں قصداً وارادۃً اس رنگ کو چاہا جاتا تھا کہ نہ پیدا ہو، جو دین کے پہلے حصہ میں اور اس حصہ کے مطالبہ میں یا اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں دین کا یہ ثانی الذکر حصہ کچھ تو مذکورہ بالا کتابی شکل میں افراد کے پاس تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی تعداد بہت محدود تھی اور زیادہ تر یہ ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جن کے دل و دماغ کی تربیت دنیا کے سب سے بڑے معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں ہوئی تھی اور جن واقعات کے تجربے و مشاہدہ کا موقعہ صحبتِ نبوت میں ان کو ملا تھا ان ہی کا تذکرہ دوسروں سے وہ کرتے تھے بعض لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ دین کا یہ حصہ جن لوگوں میں پھیلا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تھے، ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی، اصابہ میں علی بن ابی زرعہ الرازی کے حوالہ سے یہ مشہور قول منقول ہے کہ

توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن	وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس
رآہ وسمع منہ زیادۃ علی مائۃ	حال میں کہ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ
الف انسان من رجل وامرءۃ	سے آپ کی باتیں سنی تھیں ان کی تعداد ایک لاکھ
کلھم قد روی عنہ سماعاً[1]	انسانوں سے زیادہ تھی جن میں مرد بھی تھے اور
(اصابہ ج ۲ ص ۳ اصابہ)	عورتیں بھی تھیں یہ ایک لاکھ سے زیادہ تعداد والی

[1] لیکن الخطیب نے خود ابوزرعہ رازی سے اپنی متصل سند کے ساتھ اس قول کو جو نقل کیا ہے اس میں بجائے
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جماعت وہ ہے جس نے سن کر یا دیکھ کر آپ
سے ان میں ہر ایک سے روایت کی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں جن بزرگوں کے معلومات حدیث کی کتابوں میں جمع ہو سکے ہیں یا اس وقت جن کے معلومات تک رسائی ممکن ہے غالباً ان کی تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الحاکم نے لکھا ہے کہ

قد روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الصحابۃ اربعۃ الاف رجل وامرأۃ منہ مدخل

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی جماعت میں روایت کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک لاکھ سے ایک لاکھ چودہ ہزار ان صحابیوں کی تعداد بتائی گئی ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار یا رفتار کے متعلق کسی قسم کا علم لوگوں تک پہنچایا ہے۔ ابوزرعہ سے پوچھا بھی گیا تھا کہ اتنی بڑی تعداد ان صحابیوں کی کیسے ہو سکتی ہے۔ آخر اتنے آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیسے سنیں اور آپ کو کہاں دیکھا اس کے جواب میں ابوزرعہ نے کہا کہ مدینہ والے مکے والے اور ان دو شہروں کے بیچ میں جو لوگ آباد تھے اسی طرح عام اعراب وصحرا کے باشندے جو خدمت مبارک میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ نیز حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ جو شریک تھے اور عرفات کے میدان میں جن لوگوں نے آپ کی باتیں سنیں یا آپ کو کچھ کرتے دیکھا (دیکھو تدریب الراوی ص۲۰۶) اسی کتاب میں سیوطی نے رافعی کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ساٹھ ہزار مسلمان آپ کے بعد عرب میں موجود تھے جن میں تیس ہزار مدینہ میں اور تیس ہزار مختلف عربی قبائل میں پھیلے ہوئے تھے مگر خود اس تخمینہ کی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ بخاری کی اس روایت کا لوگ اکثر تذکرہ کرتے ہیں جس میں کعب بن مالک جن کے ساتھ تبوک کی مہم میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بڑا قصہ پیش آیا، وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے کہ لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ ایک دیوان (دفتر) میں ان کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا تھا یا نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی فرمایا کہ واصحاب رسول اللہ کثیر لا یجمعھم کتاب حافظ یعنی الدیوان یہ حضرت کعب کے اصلی الفاظ ہیں لیکن اس سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کے حالات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دس ہزار سے زیادہ تعداد نہیں پائی جاتی حالاں کہ لکھنے والوں
(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی یعنی وفات کے بعد دین کا یہی حال تھا اس کے بعد کیا ہوا؟ اب کچھ قصہ اس کا سنیئے

خلافت راشدہ اور حدیث ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدتاً ایک مختصر زمانہ ہے کل ڈھائی سال حکمرانی کا ان کو ملا اور وہ بھی ایسے حال میں کہ اچانک مختلف قسم کے فتنے اور فساد خود عرب میں بھی پھوٹ پڑے اور عرب سے باہر بھی ایسی تیاریاں تھیں جن کی طرف توجہ ضروری تھی، تاہم ان ہی حالات میں حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین اصولی اقدامات کا کتابوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے پانسو حدیثیں قلمبند کیں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اگرچہ بظاہر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت زیادہ تجلد اور صبر و ثبات استقلال و استقامت کا اظہار کیا لیکن درحقیقت یہ انکا ظاہر حال تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حضور کے بعد ابوبکر پر ان کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی عبداللہ بن عمر اور زیاد بن حنظلہ کے حوالہ سے ابن اثیر وغیرہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ

کان سبب موت ابی بکر الکمد علی رسول اللہ صلی اللہ وسلم	ابوبکر کی موت کی وجہ وہ اندرونی سوز و غم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان میں پیدا ہو گیا تھا۔
ج ۳ ص۲۲۴ اسد الغابہ	

ایک ایسا جان لیوا اور جان گداز غم جو آخر موت ہی پر منتج ہوا، شاید اسی اندرونی خلش اور سوز کی تسکین کی یہ تدبیر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سمجھ میں آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو معلومات ان کے دماغ میں تھے ان کو قلم بند کر کے اپنا جی بہلاتے مشاغل کے اس ہجوم اور کثرت کے باوجود جن میں خلافت کے بعد وہ گھر گئے تھے، اتنا وقت الغرض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نے سب ہی کا تذکرہ کیا ہے یعنی جن لوگوں کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو گیا تھا یا جو آپ کے سامنے پیدا ہو چکے تھے لیکن کمسن اور چھوٹے تھے ۱۲

نے نکال لیا کہ دس بیس نہیں بلکہ پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ جو قریب قریب موطا امام مالک کی مرفوع حدیثوں کی تعداد کے مساوی ہے[1] - اپنے قلم سے لکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے تیار کرلیا۔ الذہبی نے ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

جمع ابی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت خمس مائۃ حدیث ص

جمع کیا میرے والد (ابوبکر) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اور یہ پانسو حدیثیں تھیں،

جس کے معنی یہی ہوئے کہ جس کام کو سو سال بعد حضرت امام مالک نے موطاء کی شکل میں انجام دیا، یہی کام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ایک ایسی صورت میں انجام پاچکا تھا جس سے زیادہ بہتر صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تدوین حدیث کے سلسلہ میں سوچی نہیں جاسکتی، جو کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں حدیثوں کو قلم بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کاغذ دستیاب نہیں ہوتا تھا، یا لکھنے والے میسر نہیں آتے تھے، جہاد وغیرہ کے مشاغل کی وجہ سے اس قسم کے علمی کام کے لئے مواقع نہیں تھے ان سارے احتمالات کا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے عملی جواب دیا جاچکا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ کف افسوس ملنے والے آج تدوین حدیث کی عام تاریخ پڑھ کر جو کف افسوس مل رہے ہیں ان کی آرزو ایسی شکل میں پوری ہوچکی تھی جس سے بہتر شکل سوچی نہیں جاسکتی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے دینی اور سیاسی جانشین

---

[1] موطا کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں جو حدیثوں کے تعداد کی کمی وبیشی کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں، شاہ ولی اللہ نے مسوی شرح موطا میں ابوبکر ابہری کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موطا میں مسند مرفوع حدیثیں چھ سو ہیں لیکن ابن حزم کا قول شاہ صاحب ہی نے نقل کیا ہے کہ شمار کردم آنچہ در موطا ست یافتم از مسند پانصد و چند حدیث صنا مسوی شرح موطا،

کے براہ راست قلم کا لکھا ہوا حدیثوں کا یہ نسخہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں میں اگر شائع ہو جاتا تو خیال کیجئے کہ آج پیغمبر کی ان حدیثوں کے متعلق کیا کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی، الغرض آرزو کرنے والے حدیثوں کے متعلق، جو کچھ آرزو اس زمانے میں کر رہے ہیں، ان کی یہی آرزو واقعہ کا قالب اختیار کر چکی تھی۔

جنہوں نے پیغمبر کے دین کے مصالح کو نہیں سمجھا ہے ان کے لئے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام کتنا بڑا مبارک اور ضروری اقدام قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مصلحتوں کے پیش نظر دین کے اس حصہ کی اشاعت میں کوشش اس پہلو پر صرف فرمائی تھی کہ عمومیت کا رنگ اس میں نہ پیدا ہو کیا ان پیغمبرانہ مصلحتوں پر پانی نہ پھر جاتا، اگر لکھنے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق اپنی حکومت کی طرف سے عام مسلمانوں میں اس کو شائع بھی فرما دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ع ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

اس جذبہ کی تائید تھوڑی دیر کے لئے ان کو عقل سے مل گئی خیال آیا ہوگا کہ پیغمبر نے تم تو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بعض لوگوں کو حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دے دی تھی پھر میں بھی اگر کچھ کہہ رہا ہوں تو اجازت کے اس دائرے سے باہر تو میرا یہ کام ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے اس جذباتی فیصلہ کے وقت شاید ادھر ان کا دھیان نہ گیا کہ جن لوگوں کو کتابتِ حدیث کی انفرادی اجازت بارگاہ نبوت سے ملی تھی ان میں کوئی بھی نہ تھا اور نہ ان میں نبی کا کوئی جانشین اور مسلمانوں کا دینی و سیاسی امیر تھا اور نہ ان کوئی ایسی ہستی تھی جس کا کام حکومت کا کام سمجھا جا سکتا تھا۔

اسی روایت میں صدیقہ کے بعض الفاظ جن کا بھی ذکر آ رہا ہے، ان سے جو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے بعد بجائے عام اشاعت کے اس نسخہ کو حضرت ابو بکر نے عائشہ صدیقہ کو رکھنے کے لئے دے دیا تھا، میں تو ان الفاظ سے یہ سمجھتا ہوں کہ

نوری جذبہ سے مغلوب ہوکر اس کام کو گو ابو بکر صدیق کر گذرے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ ابو بکر
صدیق ہی کیوں ہوتے اور نبی کی جانشینی کے لئے ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا اگر اس
مصلحت سے وہ قطعی طور پر خالی الذہن ہوکر اپنے اس کام کو اسی طرح بڑا کام تصور
فرما لیتے جیسے اس زمانہ کے آرزو کرنے والے سوچ رہے ہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ
آج یورپ یا امریکہ میں ابو بکر صدیق کے اس نسخہ کا اگر پتہ چل جائے تو اس کو اپنی ایک
بڑی کامیابی قرار دے کر شاید آسمانوں کو سر پر اٹھالیں!

لیکن یہ حال تو ان کا ہے جنہوں نے نہ پیغمبر کو دیکھا نہ پیغمبر کی صحبت سے استفادہ
کا موقعہ ان کو ملا مگر جو زندگی کے ہر شعبہ میں نبی کا ثانی سمجھا جاتا تھا دیکھتے ہو ان کا کیا حال ہے
انہی کی صاحبزادی ام المومنین عائشہ صدیقہ جن کے پاس یہ "صدیقی نسخہ" حدیثوں کا
رکھوایا گیا تھا' ان ہی کی زبانی سنو! وہ کیا فرماتی ہیں اسی روایت کے آخر میں ہے۔

فبات لیلۃ یتقلب کثیرا — پھر ایک شب میں (دیکھا گیا) کہ وہ یعنی حضرت ابو بکر
بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔

تم تو اس پر خوش ہو کہ ابتداء اسلام ہی میں حکومت کی طرف سے نبی کے بعد ہی خود پیغمبر کے
خلیفہ نے حدیثوں کا مجموعہ جمع کر لیا گویا سارے شکوک و شبہات جو آج حدیثوں کے متعلق
دلوں میں پیدا ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں ان کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا تم اس لئے خوشی
سے پھولے نہیں سماتے اچھل رہے ہو کہ بڑا کام ہو گیا، لیکن خود جس نے اس بڑے کام
کو انجام دیا تھا وہ یہی سوچ کر کہ ایسا کیوں ہو گیا کروٹوں پہ کروٹیں بدل رہا ہے، نیند آنکھوں
سے اڑ گئی ہے آخر عائشہ صدیقہ سے نہ رہا گیا باپ کی اس غیر معمولی بے چینی کو دیکھ کر اٹھ کھڑی
ہوئیں سرہانے تشریف لائیں خود فرماتی ہیں کہ فغمنی (والد کی اس حالت نے مجھے غم میں
مبتلا کر دیا)، اور عرض کیا کہ

أتتقلب لشکوی او لشیئ بلغک — آپ یہ کروٹیں کیا کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے
بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے جسے سن کر...

(باقی آئندہ)

قدرتی نظام وحدت

۳

(جناب مولوی ظفیرالدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانحہ)

"قدرتی نظام اجتماع" کے عنوان سے گذشتہ سال "نظام مساجد" کا ایک باب آپ پڑھ چکے ہیں، اسی سے متعلق ایک اور باب پیش خدمت ہے، خدا کرے اہل علم میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے اور عند اللہ مقبول ہو" (ظفیر)

نظمِ جماعت کا نفع تشنۂ تکمیل رہ جاتا۔ اگر اس کی شیرازہ بندی عمل میں نہ لائی جاتی مگر حضرت حق جل مجدہٗ کی حکمتِ بالغہ ایسا کیوں کر کرسکتی تھی، چنانچہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی تکمیل جیسی چاہئے تھی رب العزت نے فرمادی، اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے اس کے ایک ایک شعبہ کو اجاگر اور مستحکم فرمادیا اور اس طرح امامتِ صغریٰ کے سلک گہر میں نظمِ جماعت کو منظم ومنضبط کرکے امامتِ کبریٰ کی شاہراہ قائم فرماگئے۔ تاکہ دینی نظام سے دن رات دنیاوی نظامِ حیات کا سبق تازہ ہوتا رہے، اور منتشر اور پراگندہ افراد کو اجتماعی زندگی کی پوری مشق ہوجائے۔

نظامِ وحدت اور یکجہتی کی جو مثال مسجدوں کے اس دینی نظام میں ملحوظ رکھی گئی ہے، کہیں اور نہیں مل سکتی، توحید کا نظارہ اور اس کی نورانی شعاعیں جو یہاں پائی جاتی ہیں وہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوسکیں گی۔

امامت واجتماعیت | مسجدوں کے اس قدرتی نظام میں جو مضبوطی اور استحکام ہے اور انفرادی زندگی کو جس طرح عمل سے روکا گیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، کوئی ایسا

ؔ اپنے محلہ اور امام مسجد کو یہ مضمون پہنچادیجئے اور پھر اسی کے ذریعہ نمازیوں کو بھی ۱۲

سوراخ باقی نہیں چھوڑا گیا ہے جہاں سے متفردانہ زندگی کا چشمہ پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نافذ فرمادیا ہے کہ کہیں تین یا دو شخص بھی ہوں تو بھی ان میں سے ایک کو اپنا امام منتخب کر لیا جائے۔

اذا کانوا ثلثة فلیؤمهم احدهم	تین ہوں تو بھی ان میں کے ایک کو امامت
واحقهم بالامامة اقرأهم	کرنی چاہئے اور حق امامت بڑے عالم

(مسلم باب من احق بالامامة ج۱ ص۲۳۶) کو ہے۔

تین کی قید اتفاقی ہے مطلب یہ ہے کہ جب ایک سے زیادہ ہوں تو لوگوں کو چاہئے کہ ایک کو اپنا پیشوا منتخب کرلیں اور اس کو منتخب کریں جو قرآن اور دین کا زیادہ علم رکھتا ہو حضرت مالک بن الحویرث رض ایک مرتبہ اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور سفر کے تذکرہ پر آپ نے ان کو حکم فرمایا

اذا سافرتما فاذنا واقيما وليؤمكما	تم دونوں جب سفر کرو تو سفر میں نماز کے لئے
اكبركما (بخاری)	اذان پکارو، اقامت کہو اور جو بڑا ہو امامت کرے

نظام وحدت کا استحکام پیشوا بنایا جائے تو اس طرح کہ اس کی ہر حرکت وسکون کی پیروی کی جائے وہ جب مالکِ حقیقی کے روبرو مناجات کرے تو سب کے سب خموشی سے ہمہ تن گوش ہو کر سنیں، اور باادب سیدھے کھڑے رہیں، وہ جب اس کی باعظمت ربوبیت کے آگے جھکے، تو بے چون وچرا سب جھک جائیں اور اس کی عظمت وربوبیت کا بار بار اقرار کریں اور وہ جب پھر سر اٹھا کر سجدے میں گر جائے، تو بلا پس وپیش ایک ایک فرد اپنی اونچی پیشانی اس کے آگے ڈال دیں اور اپنی عاجزی اور اس کی صفتِ علو کا عملی طور پر اعلان کریں۔ مختصر یہ کہ باضابطہ اس کی پیروی کی جائے کیونکہ ارشاد نبوی ہے

انما جعل الامام ليؤتم به	امام تو بس اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی
(بخاری باب انما جعل الامام الخ)	کی جائے۔

پیروی اور اقتدا نام ہی اس کا ہے کہ امام جو بھی کرے، ہو بہو اس کی پیروی میں ہی مقتدی اور پیروکار بھی کرے اپنے امام سے پہلے کوئی بھی مقتدی جنبش نہیں کر سکتا، اور نہ کسی حرکت و سکون میں اس کی مخالفت کی اس کو گنجائش ہے۔

لا تبادروا الامام اذا کبر فکبروا واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد (مسلم باب النہی عن مبادرۃ الامام بالتکبیر وغیرہ)	امام پر سبقت نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور وہ جب ولا الضالین کہے تو آمین کہو، اور وہ جب رکوع کرے تو رکوع کرو، اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو۔

نظامِ وحدت کی مخالفت خدا نخواستہ کسی نے اگر امام کی کسی حرکت و جنبش میں مخالفت کی، یا اس پر کسی رکن وغیرہ کی ادائیگی میں سبقت کی تو پھر وہ اصولاً متبعین اور مقتدیین کی جماعت سے کٹ گیا، اور اپنی اس بے باکانہ روش سے خطرے میں گھر گیا، اور عذابِ الٰہی کو اس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، کسی اور کا نہیں بلکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

اما یخشی الذی یرفع راسہ قبل الامام ان یحول راسہ راس حمار (مسلم باب تحریم سبق الامام الخ ج۱)	جو امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیوں وہ اس سے نہیں ڈرتا کہ اس کا سر، گدھے کے سر سے تبدیل کر دیا جائے۔

جرم بظاہر اتنا معمولی مگر سزا اتنی بڑی؟ بلا شبہ اس نے احترامِ قانون پس پشت ڈال دیا اور یکجہتی اور نظامِ وحدت میں خلل انداز ہو گیا جو اپنی نوعیت میں معمولی ہونے کے باوجود بڑا جرم ہے، کیونکہ اس نے اپنی پیشانی رب العزت کے قانون سے نکال کر شیطان کے ہاتھوں میں دے دی۔

الذی یرفع راسہ او یخفضہ قبل الامام فانما ناصیتہ بید الشیطان	جو مقتدی اپنا سر امام سے پہلے اوٹھاتا یا جھکاتا ہے تو بلاشبہ اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ

رواہ مالک (مشکوٰۃ)

ہے۔

اس عنوان قباحت سے بڑھ کر اور کیا روک تھام کی کوشش ہو سکتی ہے، اس قباحت وشناعت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نظام وحدت کی اہمیت کا احساس خوب ذہن نشین ہو جائے اور اس احساس کی تازگی کے ساتھ استحکام نظام کی پوری جد وجہد جاری رکھی جائے، تاکہ اس کا فائدہ ظاہراً باطناً ہر طرح نمایاں ہو سکے کیونکہ بہت سارے فوائد کا دار و مدار محض اس یکجہتی اور امام کی کامل اقتداء میں مضمر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں اس کی پوری نگرانی فرمائی، حضرت انس رضی کا بیان ہے کہ آپ نے ایک دن ہم لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز جب ختم ہو چکی، تو ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا اے لوگو! رکوع۔ سجدہ۔ قیام اور انصراف میں سبقت (پہل) نہ کرو، میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے[۱]

اس تاکید کی انتہا ہے کہ حالت نماز میں بھی مقتدیوں کی چوک سے غافل نہیں رہتے اور پھر ان پر اس راز کو منکشف فرما کر حقوقِ نماز اور فرائضِ اقتدا کی تاکید فرماتے ہیں۔ کیوں بغیر کسی شرعی رمز کے یہ سب کچھ تاکیدیں ہو رہی ہیں، نبی کی نگاہ سے بڑھ کر دور بیں انسانوں میں اور کس کی نگاہ ہو سکتی ہے، اور بالخصوص خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی، بس یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس شرعی اقتدا میں بے انتہا دینی اور دنیاوی فائدے ہیں۔

امام پر سبقت اور اسکی ممانعت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے ان ارشادات اور ان کی حکمتوں کو خوب سمجھا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا انھوں نے اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا حضرت براء بن عازب رض فرماتے ہیں، کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے

---

[۱] مسلم باب تحریم سبق الامام برکوع اور سجود د نحوہما عنہ ۱۸۱ ج ا

نماز اس طرح پڑھتے تھے، کہ آپ جب سمع اللہ لمن حمدہ رکوع سے اُٹھتے ہوئے فرماتے، تو سیدھے کھڑے ہو جاتے، اور اس وقت تک اپنی پیٹھ سجدہ کے لئے نہیں جھکاتے، جب تک آپ اپنی پیشانی زمین پر رکھ نہ لیتے [1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے امام پر پہل کی، یہ دیکھ کر اس سے فرمایا تو نے نہ تنہا نماز پڑھی، نہ امام کے ساتھ، پھر آپ نے اُس کو سزا دی اور فرمایا، نماز لوٹا لو [2]

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشنگوئی فرمائی تھی کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا، کہ وہ نماز پڑھینگے مگر ان کی نماز نماز نہ ہوگی" اس حدیث کے بعد تحریر فرماتے ہیں

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ زمانہ مراہی زمانہ نہ ہو، میں نے سیکڑوں مسجدوں میں نماز پڑھی ہوگی مگر کہیں بھی نہیں دیکھا، کہ اہل مسجد نماز اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں، یا نماز میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں، پس اے نمازیو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اپنی نماز خوب سنبھل کر پڑھو، اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کی نماز کا خیال رکھو کہ ان کی نماز بھی حقوق ادا ہو سکے۔

سن لو! اگر کوئی خود خوب اچھی نماز پڑھتا ہے، اور اس کے سارے حقوق کا لحاظ بھی رکھتا ہے مگر وہ دیکھتا ہے کہ دوسرا شخص اپنی نماز پورے حقوق کے ساتھ نہیں ادا کرتا، وہ اپنے امام پر حرکت وسکون میں پہل کرتا ہے پھر بھی وہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے، اس کو اس کی غلط روی پر نہ ٹوکتا ہے، نہ اس کی غلط روی کی قباحت بیان کرتا ہے، اور نہ وہ اسکی اصلاح کی سعی کرتا ہے تو وہ بھی بلاشبہ اس کے ۔۔۔ اس گناہ میں شریک سمجھا جائے گا، اور اپنی نماز حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنے کے باوجود وہ دوسرے کی نماز میں قصور وار ہوگا"

امام صاحبؒ کے اس بیان کے لب ولہجہ پر بار بار غور کیا جائے۔ اور جس شدومد سے اس کی اہمیت ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

---

[1] مشکوٰۃ عن البخاری والمسلم [2] کتاب الصلوٰۃ للامام احمد [3] کتاب الصلوٰۃ وما یلزمہا للامام احمد

اصلاح امت۔ بلاشبہ ہر مسلمان پر اپنی ذمہ داری کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ اس امت مرحوم کا طغرائے امتیاز ہی یہ بیان کیا ہے کہ ہر بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور ہر ناپسندیدۂ الٰہی سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ — تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو،
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ — کہ تم نیک کاموں کا حکم کرو
عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۲) — اور برے کاموں سے روکو۔

صحابۂ کرام رضی اللہ علیہم کی پوری زندگی اس کا زندہ ثبوت ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب واقف کار کسی غلط روی اور ناجائز امور پر چشم پوشی کرتا ہے تو وہ غلط روی اور ناجائز امور وبا کی طرح پھیل پڑتے ہیں اور اس کا ضرر عام ہو جاتا ہے، جس میں بکثرت لوگ مبتلا ہونے لگتے ہیں،

پھر یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس کا مواخذہ ہر ایک باخبر سے ہوگا، اس نے دیکھکر بھی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کی، خموشی کو کیوں راہ دی، یہ ذمہ داری صرف اصطلاحی عالم پر نہیں عائد ہوتی ہے بلکہ جو مسلمان جتنا بھی جانتا ہے اس پر اسی قدر ذمہ داری آتی ہے۔ ابتدائے اسلام میں دین کی تبلیغ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی جذبہ کے احساس کے ساتھ کی، ضرورت ہے کہ یہ سنت پھر زندہ کی جائے اور وہ بروئے کار لائی جائے عوام کی نماز میں جو خامی چلی آرہی ہے اسے ان پر ظاہر کیا جائے اور اس کی شرعی اصلاح کی جائے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر قدرے بسط و تفصیل سے (احیاء العلوم میں) بحث کی ہے۔ امام احمد بن حنبل رح نے بھی کتاب الصلوٰۃ میں اس مسئلہ کو کھول کر لکھا ہے،

جماعت کی ظاہری ہیئت۔ مختصر یہ کہ امام کی اقتدا ہر نوع کامل ہونی چاہئے، اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ہونی چاہئے ہر مقتدی پر امام کی متابعت اس حد تک ضروری ہے کہ وہ اس سے سرمو تجاوز نہیں کرسکتا، اسی وجہ سے یہ حکم ہے کہ مقتدی جب دو یا اس سے

زیادہ ہوں تو امام کو آگے بڑھا دیں اور خود پیچھے ایک سیدھ میں کھڑے ہو جائیں، اور اس طرح کہ شانہ سے شانہ ملا ہوا ہو۔ نگاہیں سجدہ گاہ پر جمی ہوئی ہوں سب کے سب ایک طرح ہاتھ باندھے ہوں، سب کا رخ قبلہ کی جانب ہو، صفیں سیدھی اور ہموار ہوں۔ کہ اگر کوئی صف کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک خطِ مستقیم کھینچنا چاہے تو اس میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے،

اس ظاہری ہیئت کے ساتھ باطنی ہیئت بھی اچھی سے اچھی ہو، دل پر خشیت و محبّت کا پرتو نمایاں ہو اور یہ محسوس کر رہا ہو، کہ گو ہم اپنے آقا کو نہیں دیکھ رہے ہیں، لیکن وہ ہمیں دیکھ رہا ہے،

درستی کا اہتمام

عہد نبوی میں صفوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید برابر رکھی، اور کبھی بھی صف کی ناہمواری برداشت نہیں فرمائی، بلکہ بذات خود آپ نے اس صفوں کی درستی کا کام انجام دیا ہے۔ آپ کا دستور تھا کہ پہلے صفوں کی ہمواری ملاحظہ فرما لیتے پھر نماز شروع فرماتے۔ جس کو صف میں ناہمواری پیدا کرتے دیکھ لیتے، اس پر خفگی کا اظہار فرماتے، چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ آپ نماز کے لئے آئے اور پیش امام پر کھڑے ہو گئے، تکبیر تحریمہ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑ گئی۔ جس کا سینہ صف سے نکلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

عباد اللہ لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم	اے بندگان خدا۔ یا تو تم اپنی صفوں کو برابر کرو یا پھر اللہ تعالیٰ تمہارے اندر مخالفت ڈال دیں گے

(مسلم ج ۱ ص ۱۸۲)

جس ظاہری اختلاف سے روکا گیا ہے، اگر اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا، تو وہی اختلاف اور بعض کا بعض پر تاخر و تقدم، باطنی اور واقعی تنافر قلوب، حدوث کینہ، اور وحشت عداوت کا موجب بن جاتا ہے جس کا اثر بڑھ کر شوکتِ اسلام اور نظام حیات پر پڑتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ جب ایک قانونِ شرعی کی نافرمانی ہوتی ہے تو وہ دلوں کی تاریکی کا ذریعہ

کا باعث بن جاتی ہے۔

صفوں کی درستی کے فائدے | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی صفوں کی درستی کو نظر انداز نہیں فرمایا آپ کا ارشاد تھا کہ تسویۂ صف نماز کے کمال سے ہے، صفیں جس قدر سیدھی اور ہموار ہوتی ہیں اور نمازی جتنا مل مل کر کھڑے ہوتے ہیں، اسی قدر نماز میں کیف ونشاط پیدا ہوتا ہے، اور دلوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔

سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من تمام الصلوٰۃ (مسلم جلد ۱) — صفیں درست اور برابر کرو، کہ یہ چیز کمال نماز سے ہے

ایک دفعہ اقامت ہو چکی تھی، کہ آپ اپنے چہرۂ انور سے صفوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا

اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظہری (بخاری) — تم اپنی صفیں ان کے حقوق کے ساتھ کھڑی کرو کیونکہ میں تم کو اپنے پیچھے کی طرف سے دیکھتا ہوں

اس قدرتی نظام میں اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مقتدی ایک منظم فوج کی طرح اپنے امام کی ماتحتی میں کھڑے ہوں، جو امام کے ایک ایک اشارہ کی پابندی کریں ساتھ ہی اس دینی فوج میں جو احکم الحاکمین کی اطاعت میں صف بستہ ہے کوئی انتشار، پراگندگی، شور، ہنگامہ اور نظم وضبط کے خلاف معمولی بات بھی پائی نہ جائے، تاکہ شیطان کو خوشی اور حملہ کا کوئی رخنہ نظر نہ آئے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (صف۔۱) — اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خاص طور پر پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح صف بستہ ہوکر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں

کہیں سے بھی یہ نظر نہ آئے کہ اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں کوئی نقص ہے اور ان کا کوئی فرد اپنے امیر اور کمانڈر کے حکم کے ذرہ برابر خلاف ہے تاکہ اس طرح باطن اور بھی گتھ

جائے اور امیر کو ہرگز ہرگز یہ کہنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

مالی اراکم عزین (مسلم ج۱ ص۱۸۱) کیا بات ہے کہ تم کو بٹا ہوا دیکھتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک بات کھول کر بیان کر دی ہے، اور عملی تعلیم دے کر امت کے لئے شاہراہ قائم فرما گئے ہیں، ارشاد فرمایا۔

استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم (مسلم ج۱ ص۱۸۱) برابر کھڑے ہو، اختلاف نہ ہو، کہ اس کا اثر تمہارے دلوں پر پڑے گا۔

وایاکم وھیشات الاسواق (مسلم ص۱۸۱) صف بندی میں بازار کے سے شور و ہنگامہ سے بچو،

رصوا صفوفکم وقاربوا وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیدہ انی اری الشیطان یدخل من خلل الصف تم اپنی صفوں کو خوب درست کرو، مل مل کر کھڑے ہو، اور شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہو، میں شیطان کو صفوں کے شگاف میں گھستے دیکھتا ہوں۔

(ابوداؤد ماجا رفی تسویۃ الصفوف)

ان سارے مسائل پر غور و فکر کی نظر دوڑا جائیں، اور ان کی دینی اور دنیاوی حکمتوں کو تلاش کر جائیں تو پتہ چلے کہ ان شرعی قوانین میں کتنے بے شمار فوائد مضمر ہیں۔

امام کی قربت | صفوں میں شریعت نے ترتیب کا لحاظ رکھا ہے کہ امام سے جو جس قدر قریب ہوگا وہ اسی اعتبار سے فضائل کا مستحق قرار پائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نزولِ رحمت کی ابتدار امام سے ہوتی ہے اور وہ بڑھ کر ساری صفوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

اذا نزلت الرحمۃ علی اھل المسجد بدأت بالامام ثم اخذت یمینا ثم عطفت علی الصفوف (کنز العمال ج۴ ص۱۲۰) اہل مسجد پر نزول رحمت کی ابتداء امام سے ہوتی ہے پھر وہ داہنے پھر تمام صفوں پر متوجہ ہوتی ہے۔

معلوم ہوا صف اول کو جو امام کے قریب ہوتی ہے دوسری صفوں پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صف اول کو کیا مقام حاصل ہے تو پھر وہ جس طرح بھی ہو سکے صف اول ہی میں جگہ کے حصول کی کوشش کریں،

لو یعلم الناس ما فی النداء والصف	لوگوں کو اذان اور صف اول کی حیثیت
الاول ثم لم یجدوا الا ان	کا علم و یقین ہو جائے تو وہ اس کے حصول
یستہموا علیہ لاستہموا	کی جدوجہد کریں، چاہے قرعہ اندازی کا
(مسلم باب تسویۃ الصفوف واقامتہا ج ۱ ص ۱۸۲)	ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔

امام کے قریب کون لوگ ہوں | امام سے قریب ان لوگوں کو کھڑا ہونے کو کہا گیا ہے، جن لوگوں میں نیابت کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے تاکہ ضرورت کے وقت امام کی جگہ اس کے فرائض وہ انجام دے سکے، حدیث میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

لیلنی منکم اولوا الاحلام والنہی	میرے قریب تم میں سے ذی ہوش اور صاحب
ثم الذین یلونہم ثلاثا (مسلم ص ۱۸۱ ج ۱)	علم و فضل کو رہنا چاہیے اور پھر جو ان کے
	قریب ہوں۔

شاید یہ بھی مقصد ہو، کہ ایسا شخص امام سے (جو سب میں زیادہ ذی علم ہوتا ہے) طریقہ نماز اور دوسرے مسائل بآسانی اخذ کر سکے گا، یا اور اس طرح کے دوسرے فوائد بھی ہوں، مگر اتنی بات تو عیاں ہو گئی کہ جب امام کی قربت باعث فضائل ہے تو صف اول کو اور صفوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہو گی، کہ وہ امام سے قریب تر ہوتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلٰی	بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے داہنی

میامن الصفوف۔ ماجہ ابوداؤد سے دعائے رحمت شروع کرتے ہیں

باب ان یلی الامام فی الصف)

یہ ترغیب اس لئے بھی ہے کہ نمازی پہلے پہنچ کر صف اول میں جگہ حاصل کرنے کی سعی کریں اور اس طرح فضائل اور دوسرے ذرائع سے اجر اور ثواب کے زیادہ سے زیادہ مستحق قرار پاسکیں۔ ان ساری حدیثوں کے پیش نظر یہ فیصلہ سہل ہو جاتا ہے مسجدوں کے اس نظام وحدت میں ارتقاء کا جذبہ ابھارا گیا ہے، جہاد کے ایک شعبہ کی جو سب کی روح ہے مشق کرائی گئی ہے اور امام کی عزت افزائی کی گئی ہے جو سرداری کے فرائض انجام دیتا ہے، اور اس طرح لوگوں کو اس کے ساتھ محبت و عقیدت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اجتماعیت اور اخوت و مساوات

پس یہ بات واضح ہو گئی کہ صفوں کی مشروعیت میں انفرادی زندگی کا خاتمہ ہے اور اجتماعی زندگی کی دعوت، عدل و مساوات کی تعلیم ہے اور اخوت و محبت کا سبق۔ جن کو اشاعت اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اسلام متفردانہ زندگی کی مذمت کرتا ہے قانونی طور پر بھی اور عملی نقطہ نظر سے بھی، انتشار و تشتت اور اختلاف و مخاصمت کو وہ ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کرتا اور ہر شعبہ زندگی میں اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ اس کی سرشت میں داخل ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو دیکھ لیتے ہیں، کہ وہ جماعت میں شریک نہیں، یا صف سے علیحدہ تن تنہا کھڑا ہے تو حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صف کے پیچھے یکہ و تنہا نماز پڑھ رہا ہے، تو آپ نے زجر فرمایا اور نماز کے اعادہ کا حکم دیا[1]۔

امام کا انتخاب

اب غور کرنا ہے کہ مقتدی کو جس امام کی پیروی کی اتنی سخت تاکید ہے اور شریعت نے جس کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے، کیا وہ جگہ ہر شخص کو علم و فضل کا لحاظ کئے بغیر مل سکتی ہے؟ ہر ذی عقل یہ کہے گا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ یقیناً اس منصب جلیل کے لئے اس جماعت میں سے اس

---

[1] ابوداؤد باب الرجل یصلی وحدہ خلف الصف

فرد کو منتخب کیا جائے گا، جو ان میں بہترین اخلاق و اطوار کا ہو، زہد و اتقاء کا مالک ہو اور علم و فضل میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

امام کس حیثیت کا ہونا چاہئے | بلا شبہ وہ جب ایک ایسی مرکزی دینی عبادت کا پیشوا ہے جو افضل العبادات ہو اور ایک ایسے رکن کا ضامن بن رہا ہے، جو ارکان خمسہ میں دوسرا درجہ رکھتا ہے تو بلا شبہ ایسے شخص کو رذائل اخلاق، سوقیانہ اطوار، مذموم عادات اور ہر ایسی خصلت بد سے منزہ اور پاک ہونا چاہئے، جو شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ ساتھ ہی مکارم اخلاق صفات محمودہ، خصائل پسندیدہ اور خدا شناسی و خدا ترسی کے اوصاف سے متصف بھی ہونا چاہئے جس کو ہم خدا کے سامنے اپنا نمایندہ بنا رہے ہیں، حتی الوسع اس کے انتخاب میں ہمیں عقل و خرد سے کام لینا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بیچ بھی ہمارے سامنے وراثت و خاندان اور حسب نسب کا غلط مسئلہ آجائے، امیر و فقیر کی بات دھوکہ نہ دے جائے، جس کی پروردگار عالم نے مذمت فرمائی ہے[1]۔ بلکہ ان سب سے بالا تر ہو کر ہماری نگاہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ پر ہو یہ وہ عہدۂ جلیلہ ہے جسے خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات سے زینت بخشی ہے، اور اس وقت تک جب تک ہوش و حواس نے ساتھ دیا خود ہی زینت بخشتے رہے۔ مرض الوفات والی حدیث کے ضمن میں طبری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

انما فعل ذالك لئلا يعذر احد من الائمة بعده نفسه بادنى عذر فيتخلف عن الامامة	یہ تو آپ نے اس لئے کیا، تاکہ آئندہ کوئی امام ادنیٰ عذر کو حیلہ بنا کر امامت سے کترانے نہ لگے

(فتح الباری ج ۲ ص ۱۲۵)

---

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۵۴۶۔

(باقی آئندہ)

"ایک دلچسپ ادبی بحث"

جنوری ۱۹۵۸ء کے برہان میں جو نظرات لکھے گئے تھے ان میں ایک موقع پر فارسی کا ایک شعر

حاجی بہ رہِ کعبہ و من طالب دیدار :: او خانہ ہمی جوید و من صاحب خانہ

آگیا تھا۔ اس پر ہفتہ وار "صدق" مورخہ ۱۳ فروری میں ایک صاحب علم کا مراسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے اس شعر سے متعلق نظرات نگار پر نکتہ چینی کی تھی۔ اتفاق سے اس کا ذکر ایک خط میں فاضل دوست خواجہ عبدالرشید صاحب سے آیا جن سے قارئین برہان خوب واقف ہیں تو موصوف نے "صدق" کے مراسلہ کے جواب میں اپنی معلومات پیش کیں جو ذیل میں ایک دلچسپ ادبی بحث کی حیثیت سے ہدیۂ ناظرین ہیں خواجہ صاحب کے ارشاد کے مطابق ہم پہلے "صدق" کا مراسلہ بعینہٖ نقل کرتے ہیں اس کے بعد آپ خواجہ صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ ہمارے فاضل دوست نے خود بھی لکھا ہے یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ "صدق" کے فاضل مراسلہ نگار بھی "ایک پنجابی عہدہ دار ہیں" اور اس کا جواب لکھنے والے ہمارے دوست بھی ایک پنجابی عہدہ دار ہی ہیں بہرحال عہدہ داروں کا یہ فارسی ادب و شعر کا ذوق موجب صد تحسین و آفرین ہے۔ اڈیٹر

ایک "شعر" کی تحقیق

(ایک پنجابی عہدہ دار کے قلم سے)

جنوری رسالہ برہان (دہلی) نظرات حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے سانحہ ارتحال پر نثر میں ایک مرثیہ تھا جو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے قلم سے نکلا ہے تاثرات

ات صفحوں پر مشتمل تھے۔ اور قابل احترام۔ مگر آخری صفحے کے وسط میں مولانا نے
شعر لکھدیا ہے ناصر خسرو کے ساتھ منسوب کرکے۔ تو اس سے اس تعزیت نامے
رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اگر اس شعر کی اصلیت مولانا کو معلوم ہوتی تو وہ شاید یہ شعر
لکھتے۔ یہ درحقیقت شعر نہیں اور نہ ناصر خسرو سے اس کو تعلق ہے یہ اصل میں
مصرعے ہیں بھائی عاملی[1] کے ایک مخمس کے! یہ مخمس عارفانہ نہایت دلپذیر ہے
گریہ دو مصرعے جو مولانا نے لکھدئے ہیں انہیں ایک مستقل شعر سمجھ لیا جائے تو خیالات
ادائیگی میں تو اترا در روحانی تجسس جو موجود ہے اس میں تو وہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے
مطالب کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

عرصہ ہوا ایران میں ایک فارسی کتاب ہاتھ لگی تھی جہاں میں نے مخمس دیکھا
اسوقت اسقدر پسند آیا کہ کچھ بند نقل کرلئے۔ یہ جو دو مصرعے ایک شعر بنا کر مولانا سعید
صاحب نے لکھے ہیں یہ ذیل کے بند سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

ل دم کہ عزیزاں بروندے پئے ہر کار — زاہد بسوئے مسجد و من جانب خمار
ہی برد کعبہ و من طالب دیدار — من یار طلب کردم دا دجلوہ گہ یار

او خانہ ہمی جوید و من صاحب خانہ

خط کشیدہ مصرعوں کو ملا کر ایک شعر پیدا کر دیا گیا ہے! اور اسے ناصر خسرو کی
جانب منسوب کر دیا گیا ہے اب اس مخمس کے دیگر بند بھی ملاحظہ ہوں۔ اوپر والے بند
سے پہلے ایک اور بند ہے اور وہ یہ ہے:-

رفتم بدر صومعہ عابد و زاہد — دیدم ہمہ را پیش رخت راکع ساجد
درمیکدہ رہبانم و در صومعہ عابد — گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد

یعنی کہ ترامی طلبم خانہ بہ خانہ!

اب تیسرا بند ملاحظہ ہو دیکھئے کتنی جان ہے اس میں اور کس طرح بول رہا ہے

[1] یعنی شیخ بہاء الدین عاملی صاحب کشکول "مثنوی" "نان و حلوا" (صدق)

هر در که زدم صاحب آن خانه توئی تو | هر جا که رسیدم پرتو کاشانه توئی تو
در میکده در دیر که جانانه توئی تو | مقصود من از کعبه و بت خانه توئی تو

مقصود توئی کعبه و بت خانه بهانہ!

اب آخری بند ملاحظہ فرمائیے:-

بیچارہ بھائی که دلش زار غم تست | هر چند که عاصی است ز خیل خدم تست
امید وی از عاطفت دم بدم تست | تقصیر دگناهش بامید کرم تست

یعنی که گنه را به ازیں نیست بہانا!

شعر کی تحقیق کی تحقیق

از

جناب خواجہ عبد الرشید صاحب راولپنڈی

آپ نے شعر کی تحقیق کے متعلق لکھا ہے۔ میں نے شعر کی تحقیق پڑھی تھی۔ مگر کہنے والے سے آشنا نہیں ہوں۔ البتہ آپ کو اسی موضوع پر اپنی تحقیق روانہ کرتا ہوں جو پنجابی عہدہ دار کے جواب میں ہے۔ رسالہ میں جگہ نکال کر مشکور فرمائیے۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جس روز معدق پہنچا ادراسمیں پنجابی عہدہ دار کے قلم سے ایک شعر کی تحقیق پر مسند دیکھا۔ اسی شام اپنی کتابوں کی پڑتال کر رہا تھا کہ ایک جلد مجلہ آئندہ مطبوعہ طہران ہاتھ لگی۔ اٹھائی اور صفحے الٹنے شروع کر دیئے۔ ایک مقام پر پہنچکر عنوان جو نظر پڑا تو نظر چونک گئی۔ عنوان تھا ——— راجع بغزل خیالی و مخمس تشیخ بھائی "۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ عنوان بحث انتقاد کا ایک حصہ جو اس شمارہ میں بطور باب باندھ دیا گیا تھا۔ اور اس سے پیشتر مباحث بھی اس کے متعلق موجود تھے۔ جب مضمون کو شروع سے سلسلہ وار پڑھا تو ذیل کے نقاط ترتیب وار سمجھ میں آتے گئے۔ اب آپ کا جو خط آیا ہے تو پھر اسے ایک بار دیکھا اور رشدہ

شدہ اقتباس لینے کے بعد انہیں یکجا کر دیا ہے اور ارسال خدمت کر رہا ہوں۔
بعض جگہ اقتباس بعینہ درج کر دئے گئے ہیں بغیر ترجمہ کے صدق میں وو ایک شعر کی
تحقیق،، بھی کسی پنجابی کی لکھی ہوئی ہے اور میں بھی پنجابی ہی ہوں۔ اور اس میں بھی
شک نہیں کہ عہدہ داری کا طوق میرے گلے میں بھی ڈالا جا سکتا ہے!
ہاں تو اس مجلہ آئندہ کے کسی پہلے پرچے میں شیخ بھائی کی ایک غزل عارفانہ
نقل کی گئی تھی، جو بہ ذیل عنوان درج ہے۔

غزلہای عارفانہ —— خدائے یگانہ

(ار شیخ بہائی موضوع فوق را در غزلے عارفانہ باکمال لطافت سرودہ است)

تا کے بہ تمنائے وصالِ تو یگانہ — اشکم بود از ہر مژہ چوں سیل روانہ؟
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد — یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بہ خانہ
مقصودِ من از کعبہ و بت خانہ توئی تو — مقصود توئی کعبہ و بت خانہ بہانہ
حاجی بہ رہ کعبہ و من طالب دیدار — او خانہ ہمی جوید و من صاحب خانہ
امید بہائی بود فور کرم تست — نہ از عمل خویش و نہ از اہلِ زمانہ

اس غزل پر چند ایک لوگوں نے مدیر کے پاس اعتراض کیا کہ یہ غزل شیخ بھائی کی نہیں بلکہ
یہ تو غزل عارفانہ خیالی بخاری کی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ آقائے علی حکمت، جو ہندوستان
کئی مرتبہ آ چکے ہیں۔ اور جن کی شخصیت سے عوام واقف ہیں۔ انہوں نے مدیر موصوف
کو لکھا کہ "تذکرہ غلطی درام کہ مخمس ارایشیخ بھائی با تضمین ابن قطعہ خیالی را در بر درا د" اس
کے بعد آقائے کیوان سمیعی نے بھی ایک مقالہ سپرد قلم کیا جو اسی موضوع پر تھا۔ یہ قطعہ جس کا
ذکر آقائے علی حکمت نے کیا ہے۔ وہ بھی آقائے کیوان نے لکھا ہے۔ جو کہ ابھی ذیل میں درج
کر دونگا۔ اس قطعے کے سات بیت ہیں۔ جس شکل میں کہ یہ قطعہ شائع ہوا ہے اس میں
فقط اس کے پانچ بیت ہیں اور ان میں سے صرف تین دونوں قطعوں میں مشترک ہیں

یعنی بھائی آملی اور خیالی بخارائی والے قطعوں میں۔ درحقیقت بھائی آملی کے قطعہ کی نسبت اس قطعے میں چار بیت اضافی ہیں اور دو اُن سے کم۔ مدیر نے اس امر کا ذکر نئے لازم سمجھا ہے کہ "

" این تذکرہ ما تا حدی تائید میکند اظہار آقائے علی حکمت راکہ شیخ بھائی قطعہ خیالی را تضمین کردہ است یعنی در صحت انتساب مخمس منسوب بہ بھائی در تذکرہ قطعی ایشان، با شہرتی کہ غزل خیالی بنام او دارد، چندان تردید نتوان دانست، وچون مخصوصاً مطلع و مقطع دو قطعہ متفاوت و قطعہ ہا نیز با دو تخلص مختلف و اختلاف مضمون میباشند محقق است کہ ہر دو شاعر در این وزن و قافیہ سرودہ ندانہ اینکہ قطعہ سے میان دو شاعر مشکوک باشد "

اس جگہ مدیر نے اظہار کیا ہے کہ ممکن ہو سکتا ہے کہ آقائے کیوان کو مخمس بھائی کا علم نہ ہو۔ اور انہوں نے ذیل کی غزل خیالی بخارائی کی سمجھکر ارسال کر دی ہو جو یہ ہے۔

غزل عارفانہ خیالی بخارائی

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ	خلقے بتو مشغول و تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم دگہ ساکن مسجد	یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ
مقصود من از کعبہ و بت خانہ تو ئی تو	مقصود توئی کعبہ و بت خانہ بہانہ
ہر کس بہ زبانی صفت تو گوید	نائی بنوائے نے و مطرب بہ ترانہ
حاجی برد کعبہ و ما طالب دیدار	او خانہ ہمی جوید و من صاحب خانہ
. . . .	باقی بہ جہانت کہ فسونست و فسانہ
تقصیر خیالی با مید کرم تست	یعنی کہ گناہ را بہ ازیں نیست بہانہ

غور فرمائیے تو جو تفاوت ہے، وہ فوراً نظر آجائے گا۔ مثلاً مطلع و مقطع شیخ بھائی کا ملاحظہ فرمائیے۔ جو کہ یوں ہے،

تا کے بہ تمنائے وصال تو یگانہ	اشکم بود ہر مژہ چوں سیل روانہ

امید بہائی بہ وفور کرم تست　　نہ از عمل خویش ہو نہ از اہل زمانہ

یہاں اس تمام روداد کے بعد آقائے علی حکمت کا مراسلہ درج ہے جو کہ طویل ہے مگر کچھ اقتباس یہاں دیکر آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔ آقائے علی حکمت فرماتے ہیں ۔

" به حکم وظیفهٔ ادبی سزاوار دانست که توضیحی در این باب عرض نماید تا آن مجلهٔ ارجمند نفیس از اشتباه وسهو مصون ماند ۔ این غزل که از منظومات لطیف عرفانی و بسیار نغز و فصیح سروده شده اثر طبع خیالی بخارائی است و این شاعر در نیمهٔ اول قرن نهم در بخارا می زیسته و از معاصرین و مصاحبین خواجه عصمت الله بخاری شاعر عصر تیمور لنگ بوده است ۔ (رجوع شود به تذکرة الشعراء دولت شاه سمرقندی ص ۱۲۱ ومجالس النفائس میر علی شیر نوائی ص ۱۸۸ و ص ۱۲ طبع جدید طهران) غزل او لبکر روان وسلیس و دلنشین است همیشه مورد عنایت و توجه شعرا واقع قرار گرفته با ستقبال تخمیس وتضمین آن شاعران متعدد همت گماشته اند ۔ از آن جمله شیخ بهائی آملی آنرا مخمس نموده است

آن مخمس بتمامه در مجموعهٔ خطی که این بنده قدیماً جمع آوری کرده است ثبت شده ولی متاسفانه چون ذکر ماخذ نشده معلوم نیست که از کجا گرفته و نقل نموده ام ، عین مخمس را برائے جناب عالی میفرستم که اگر سزاوار دانستید عیناً در یکے از صفحات آن مجله درج فرمائید که فائدهٔ آن عام و تمام باشد ۔"

اور اگر اجازت ہو تو اس اقتباس کو تھوڑی ترمیم کے بعد اس کی آخری سطور کو میں بھی دہرا دوں ۔

" که عین مخمس که بندهائش باقی مانده که در صدق ہفتہ وار چاپ نشده ، برائے جناب عالی میفرستم که اگر سزاوار دانستید عیناً در یکے از اشاعت مجلهٔ شهریهٔ برہان درج فرمائید که فائدهٔ آن عام و خاص باشد !"

اس کے بعد پھر وہی مخمس درج ہے جو پنجابی عہدہ دار نے "صدق" میں شائع کرایا ہے ۔ مگر اس میں کچھ بند زائد ہیں جو صدق میں نہیں آئے ۔ آپ کے لئے درج کرتا ہوں

کہ لطف اندوز ہو لیں اور اس مزید تحقیق سے آپکی تشنگی دور ہو جائے، واقعی اس
شاعر کے کلام میں حقیقت کی چاشنی ہے۔ بلکہ یہاں ایک التماس کرونگا کہ آپ پنجابی
عہدہ دار کے مراسلہ کو صدق سے مستعار لیکر اس مراسلہ کی تمہید بنا کر شائع
کر دیں تاکہ تحقیق بہ پایاں رسد! اور اس پنجابی عہدہ دار کی گستاخی معاف فرمائیں
میں ایک دوسرے پنجابی بھائی کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ اس نے براہ راست
آپ سے کیوں نہ ذکر کیا۔

بقایا بند ملاحظہ فرمائیے:-

تا کہ بہ تمنائے وصالِ تو یگانہ　　اشکم شود از ہر مژہ چوں سیل روانہ
خواہد بسر آید شبِ ہجران تو یا نہ　　اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ
جمعے بتو مشغول و تو غائب ز میانہ

بلبل بچمن زان گل رخسار نشاں دید　　پروانہ در آتش شدہ انوار عیاں دید
عارف صفت روئے تو از پیر و جوان دید　　یعنی ہمہ جا عکسِ رخ یار توان دید
دیوانہ نیم من کہ روم خانہ بخانہ

عاقل بقوانین خرد راہ تو پوید　　دیوانہ برون از ہمہ آئین تو جوید
تا غنچہ شگفتہ این باغ کہ بوید　　ہر کس بزبانی صفتِ حمد تو گوید
مطرب بہ غزل خوانی و بلبل بہ ترانہ

اب آپ اپنی داستان سنائیے کہ آپ نے اسے حکیم ناصر خسرو کا شعر کیسے سمجھا تھا؟ آپ نے
فرمایا ہے کہ اس کی ایک دلچسپ داستان ہے، جو ایک "ذہنی حجاب" کا نتیجہ ہے۔ آپ
نے "ذہنی حجاب" کے لئے Mental complex کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں سمجھ
تو گیا ہوں کہ آپکی اس سے مراد کیا ہے، مگر اس کی کچھ دلچسپ مثالیں مجھے بھی یاد ہیں۔
اور ڈاکٹر فرائڈ نے اپنی کتاب Psychopathology of Everyday Life

ں اور بھی مزیدار حکایتیں بیان کی ہیں ۔ کئی بار زندگی میں ہوتا ہے کہ غلط نام کسی چیز
کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا ہے حالانکہ اصل نام دماغ میں ضرور گھوم رہا ہوتا ہے ، بعض
ما اوقات دیدہ ودانستہ بھی سرزد ہو جاتا ہے ۔ مثلاً شعر یاد ہو مگر شاعر کا نام بھول گیا ہو تو
ی اور کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا ہے ! اصلی complex یہی ہے ۔ مجھے
یسا معلوم ہوتا ہے جس طرح آپ کے complex کا ذمہ دار حکیم ناصر خسرو نہیں ،
بلکہ امیر خسرو ہیں !

تفسیر مظہری

تمام عربی مدرسوں، کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بے مثل تحفہ

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف حصوصیات
کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک
میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔
الحمدللہ کہ ۔ سالہا سال کی عرق ریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان
تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو گئی ہیں
جو کاغذ اور دیگر سامان طباعت وکتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹/۸ ساٹھ روپے جلد ثانی ساٹھ روپے
جلد خامس ساٹھ روپے جلد ششم آٹھ روپے جلد ثالث ورابع زیر کتابت ہیں

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

مادہ ہائے تاریخ رحلت علامہ شبیر احمد عثمانی رح

میرے قدیم اور مخلص دوست مولانا محمد محسن بیدل سنبھلی مادہ ہائے تاریخ کہنے میں نہ صرف یہ کہ حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ اس میدان میں بعض حیثیتوں سے اپنی مثال نہیں رکھتے جنوری ۱۹۳۸ء کے برہان میں آپ کے کلکِ تاریخ بار سے نکلے ہوئے وہ مادہ ہائے تاریخ شائع ہو چکے ہیں جو آپ نے ندوۃ المصنفین کی تاریخ تاسیس کے سلسلہ میں تحریر فرمائے تھے اور جنہیں دیکھ کر پہلی مرتبہ آپ کے اس کمال کے تفصیلی مشاہدے کا موقع ملا تھا۔

حضرت عم محترم علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال پر آپ نے ہجری اور عیسوی منظوم اور منثور مختلف مادہ ہائے تاریخ بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے نکالے ہیں جن کو موصوف کے ایک نفی مکتوب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ عتیق الرحمن عثمانی

محترمی زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ دعا ہے کہ جناب مع جمیع احباب و متعلقین مع الخیر و العافیہ ہوں۔ آمین۔

عرصہ کے بعد یہ شرف حاصل کر رہا ہوں کہ ۔ استاذی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کے سانحۂ وفات کی تعزیت کے مستحق میرے نزدیک آپ ہیں۔ اس لئے آپ کو ہدیۂ ناچیز ارسال کیا جاتا ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

روزنامہ "تنویر" لکھنؤ مورخہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق یکم فروری ۱۹۵۰ء میں بعنوان "قطعہ تاریخ وفات علامہ عثمانی" از منشی ظہیر الحق صاحب نشاط سیمابی متھوناتھ بھنجن اعظم گڈھ ایک قطعہ شائع ہوا تھا قطعہ کا مقطع جس میں مادہ ہے "آہ مولانا شبیر احمد عثمانی" ایک مادہ تعمیہ تھا۔

"فخرِ رازی صاحبِ تفسیر مرد" بہرسالِ رحلتش گفتا نشاط

احقر نے حسب مذاق ان دونوں مادوں کو اتفاق سے جو جانچا تو دونوں غلط پائے نمبر ایک میں اگر "مولینا" کی ی شمار کی جاوے تو ۱۱۳۷۹ اعداد ہوتے ہیں اور اگری کی بجائے مولانا کا الف شمار کیا جائے تو ۱۱۳۷۰ اعداد ہوتے ہیں۔ بغیر ی یا بغیر الف مولنا قطعاً غلط ہے یہ واضح رہے کہ اس فن میں مسلمہ طور پر کتابت ہی معیار ہے اور مولانا یا مولینا دو ہی صورتوں میں کتابت ہوتی ہے۔

نمبر دو میں بلا مخرجہ مرد کے (جو نقطعاً نہیں کیا گیا ہے) ۱۲۱۹۳ اعداد ہوتے ہیں بہرحال "تنویر" کی مذکورہ بالا اشاعت محرک اول ہوئی پھر بعض حضرات کی فرمائش اور خود حضرت مرحوم سے اپنے ذاتی تعلق نے مجبور کر ہی دیا کہ استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے سال وفات کے لئے یہ ناچیز شاگرد بھی کچھ امکانی سعی کرے۔ توفیق ایزدی سے جو کچھ ہو سکا ہے بغرض اشاعت ارسال ہے۔

ان "مادہ ہائے عجیب و غریب" متعلقہ سن ہجری اور آئینہ خانہ تواریخ" متعلقہ سن عیسوی میں یہ بات ناظرین کرام ملحوظ رکھیں کہ ہر جز و یا جملہ مستقل ایک مادۂ تاریخ ہے

"مادہ ہائے عجیب و غریب"

۱۳۶۹ھ

"رحلتِ مفسرِ قرآں" ۱۳۶۹ھ — "علامہ محدث عثمانی" ۱۳۶۹ھ

"پیش کش از محمد حسن بدر سنبھلی" ۱۳۶۹ھ

"مفسرِ قرآن محدث" ۱۳۶۹ھ — "حجۃ الاسلام شارح صحیح مسلم" ۱۳۶۹ھ — "قدس آستاں مولانا شبیر احمد" ۱۳۶۹ھ

"قدسی اساس شیخ الاسلام" ۱۳۶۹ھ — "امام العلما المتقنین رحمۃ اللہ علیہ" ۱۳۶۹ھ — "وصال مفسر و محدث شد" ۱۳۶۹ھ

"وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مُفَسِّر"
۱۳۶۹ ہجری

"اَنَارَ اللّٰهُ بُرْهَانَهٗ، سَقَى اللّٰهُ مَثْوَاهُ"
۱۳۶۹ ہجری

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، سَقَى اللّٰهُ مَثْوَاهُ"
۱۳۶۹ ہجری

"تاریخ الوصال"
۱۳۶۹ ہجری

درجہاں بشر وارث الانبیاء — مرد ستیا جل کس بیابد بناہ
بسالِ وصالش نوشتیم بدرد — "وصالِ مفسر، محدث شدہ آہ"
۱۳۶۹ ہجری

"تاریخ النّاعلم"
۱۳۶۹ ہجری

شد ز ما حضرت شبیر احمد — شیخ الاسلام و محدث و راشد
بدر گفتم پئے سالِ رحلت — "شیخ الاسلام فقیہ الدین"
۱۳۶۹ ہجری

"تاریخ عالم زاہد"
۱۳۶۹ ہجری

واصل برفیقِ اعلیٰ شد۔ آں کہ شعر راز فرقانی — استاذ شفیقت بدر جو رفت — تاریخ بجواں ہم فانی
تاریخ بگو در نو عیشش — "علامہ محدث عثمانی"
۱۳۶۹ ہجری

"از یکے از تلامذہ مولینا"
۱۳۶۹ ہجری

"آئینہ خانۂ تواریخ"
۱۳۶۹ ہجری

"مفسر و محدثِ اعظم" — "علامۂ روزگار" — "قدس آستاں مولانا شبیر احمد"
۱۳۶۹ ہجری
۵۸۰
۱۹۴۹ عیسوی — ۱۹۴۹ عیسوی

"جواہر مکنون از محمد حسن بدر سنبھلی فاضل دیوبند"
۱۹۴۹ عیسوی

"شیخ الاسلام پاکستان عفا اللہ عنہ"[25]
۱۹۴۹ عیسوی

"شیخ راشد پاکستان"[26]
۱۹۴۹ عیسوی

"شیخ شارح صحیح مسلم مُرد"[27]
۱۹۴۹ عیسوی

"آہ مولانا شبیر احمد تشریف بردند"[28]
۱۹۴۹ عیسوی

"آہ صدر جمعیت العلماء اسلام پاکستان رحمہ اللہ"[29]
۱۹۴۹ عیسوی

"حیاتِ جاودانِ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی"[30]
۱۹۴۹ عیسوی

"حیاتِ جاودانِ مولانا شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ"[31]
۱۹۴۹ عیسوی

"تاریخ عیسوی انتقال"[32]
۱۹۴۹ عیسوی

"روز دوشنبہ، وصالِ مفسر و محدث شد"[33]
۱۳۶۹ ہجری
۵۸۰
۱۹۴۹ عیسوی

"قطعات" "تاریخ الوصال"[34]
۱۳۶۹ ہجری
۵۸۰
۱۹۴۹ عیسوی

"تاریخ الوصال"[35] "از محمد حسن بدر علوی"
۱۳۶۹ ہجری
۵۸۰
۱۹۴۹ عیسوی

آں شارحِ حدیث و مفسر حنیف رفت[36] — از عالمِ کثیف بدارِ لطیف رفت
چوں بدر فکر کرد پئے سالِ رحلتش — آمد ندا کہ "شارحِ مسلم شریف رفت"
۱۹۴۹ عیسوی

"گہر شاہوار تاریخ"[37]
۱۹۴۹ عیسوی

"قطعہ دگر سفر آخرت"[38]
۱۹۴۹ عیسوی

آں شارحِ حدیث و کلام شریف رفت[39] — آں نائبِ رسول و عفیف و عریف رفت
گلزارِ شرع شد متزلزل عجب مدار — دانندۂ مزاجِ ربیع و خریف رفت
در علم و فضل منکرِ او ہیچ کس نہ بود — بر مرقدش ز فرقِ ارادت حریف رفت
پرسید بدر سالِ وصالش چو از سروش — گفتہ سروش "شارح مسلم شریف رفت"
۱۹۴۹ عیسوی

۶۰۳ "از انفر محمد حسن بدر سنبھلی فاضل دیوبند"[40]
۱۹۴۹ عیسوی

ادبیات

نعت سرورِ کائنات

(جناب چند بہاری لال صبا جے پوری جانشین حضرت مائل دہلوی)

ہوں اگر روح الامیں ہوں پاسبانِ مصطفےٰ
رُک نہیں سکتے کسی سے عاشقانِ مصطفےٰ

عیدِ میلادِ نبی کی بزم ہے آراستہ
آج ہونا چاہیئے اظہارِ شانِ مصطفےٰ

کیا کہوں قرآں اٹھا کر ہو نہیں سکتی تمیز
یہ زباں اللہ کی ہے یا زبانِ مصطفےٰ

سادگی تو دیکھیے میری جبیں کی جھک گئی
عرشِ اعظم کو سمجھ کر آستانِ مصطفےٰ

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کرم اللہ کا
بن گیا خود میشولئے عاشقانِ مصطفےٰ

آفریں ہمت پہ اس کی رحمتِ حق کہہ اٹھی
لے لیا گر کے جس نے آستانِ مصطفےٰ

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا کلامِ پاک کو
جس طرح سمجھے ہوئے ہیں عاشقانِ مصطفےٰ

اب مرا دامن نہیں ہے دامنِ رحمت سے کم
آ پڑی ہے اس پہ خاکِ آستانِ مصطفےٰ

بندگی کی شان سے تفریق پیدا ہو گئی
ورنہ ہو جاتا خدا پر بھی گمانِ مصطفےٰ

بادۂ توحید کا اک جام مجھ کو بھی تو دے
اے شبِ معراج والے میزبانِ مصطفےٰ

ہم دکھا دیں گے تمہیں کعبہ اُدھر آتا ہوا
جس طرف سجدہ کریں گے عاشقانِ مصطفےٰ

میں تو کہتا ہوں خدا کا عرشِ اعظم بھی نہیں
جس قدر بھاری ہے سنگِ آستانِ مصطفےٰ

آخر انساں ہے صبا تو یہ ملائک کہتے ہیں
ہو نہیں سکتا بیانِ عزو شانِ مصطفےٰ

کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد چہارم حضرت
عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات
اور متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں
ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا
گیا ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام وقت
کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی
کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا ایڈیشن۔ قیمت
[illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج و زوال جدید
ایڈیشن۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

مکمل **لغات القرآن** معہ فہرست الفاظ
لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول طبع دوم
قیمت [illegible] مجلد [illegible] جلد ثانی۔ [illegible] مجلد [illegible]
جلد ثالث [illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا نظمِ مملکت مصر کے مشہور
مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی
محققانہ کتاب "النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم
و تربیت۔ جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید
کتاب۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]
نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف
اور مباحثِ تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب۔
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ترجمان السنۃ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا
جامع اور مستند ذخیرہ صفحات ۴۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹/۸
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ترجمان السنۃ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے
قریب حدیثیں آگئی ہیں قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ
مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشہائے سفر [illegible]

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی
خدمات۔ قرونِ وسطیٰ میں حکمائے اسلام
کے شاندار علمی کارنامے۔ جلد اول مجلد [illegible]
جلد دوم مجلد [illegible]

وحی الٰہی مسئلۂ وحی اور اس کے تمام گوشوں
کے بیان پر پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ
پر ایسے دل پذیر انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی
اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں
کو روشن کرتا ہوا دل کی گہرائیوں میں سما جاتا
ہے۔ جدید ایڈیشن قیمت [illegible]

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

REGISTERED No D148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲۔ محسنین: جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان بغیر کسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپیے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احباء۔ نو روپیے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائینگی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپیے۔ ششماہی تین روپیے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ ار

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کراکر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کیجاتی ہے مفصل فہرست جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ قیمت ہے، مجلد سعہ

سلسلۂ تاریخ ملت، مختصر ضخامت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے، اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد عہ

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دلپذیر بیان قیمت ہے، مجلد ہے

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت ہے، مجلد ہے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت عہ مجلد عہ

خلافت عباسیہ جلد اول (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت ہے مجلد للعہ

خلافت عباسیہ جلد دوم (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ) قیمت للعہ مجلد صہ

فہم قرآن۔ جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ہے مجلد ہے

غلامان اسلام۔ اسّی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان، جدید ایڈیشن قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق و فلسفۂ اخلاق علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے۔ قیمت ہے، مجلد صہ

قصص القرآن جلد اول۔ تیسرا ایڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک قیمت صہ مجلد ہے

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن۔ قیمت ہے، مجلد سعہ

قصص القرآن جلد سوم۔ انبیا علیہم السلام

برہان

جلد بست و چہارم شمارہ (۶)

جون سنہ ۱۹۵۰ء مطابق شعبان المعظم سنہ ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

نہرو لیاقت معاہدہ کے بعد اب فضا میں سکون پیدا ہو چلا اور بہت سے پاکستان کے مہاجر مسلمان اپنے وطن عزیز کو واپس آنے لگے ہیں تو بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی نے پھر پر پرزے نکالنے اور اپنے وہی پرانے راگ الاپنے شروع کر دیئے ہیں چنانچہ ابھی پچھلے دنوں آپ نے مختلف تقریروں میں فرمایا کہ "مسلمانوں کو عرب و ایران کی طرف دیکھنا چھوڑ دینا چاہیئے اور وہ عقیدہ خواہ کچھ رکھیں مگر انھیں ہندو کلچر اختیار کر لینا چاہیئے۔ ورنہ ان کے لئے بھارت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

ہم نے ٹنڈن جی اور ان کی قماش کے دوسرے آدمیوں کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا اور ان کی تقریروں اور تحریروں کو کبھی اہمیت نہیں دی کیونکہ

واعظ سے جھگڑتے ہیں نہ جلاد سے ڈرتے ۔۔۔ پہچانتے ہیں ہم اسے جس رنگ میں جو آئے

لیکن اصولی طور پر آج ہم ٹنڈن جی سے دو چار باتیں کہنی چاہتے ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی پچھلے دنوں فسادات کے موقع پر یوپی اور مغربی بنگال میں مسلمانوں پر جو قیامت گذری ہے ٹنڈن جی اس سے اچھی طرح باخبر ہیں تو پھر کیا ٹنڈن جی اور ان کے جیسے دوسرے سربرآوردہ ہندو لیڈروں کے لئے یہ بات انتہائی افسوسناک اور قابل شرم نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں میں خود اعتمادی۔ بھروسہ اور بھارت کو صحیح اپنا وطن سمجھنے کا یقین اور احساس پیدا کرنے کی کوشش اور فرقہ پرست ہندوؤں نے جو کچھ کیا ہے اس پر شدید ملامت کا اظہار تو کرتے نہیں اور الٹا مسلمانوں سے کہتے ہیں ہندو کلچر اختیار کرو ورنہ پاکستان چلے جاؤ۔ سوال یہ ہے

کہ آپ نے مسلمانوں کے لئے کیا کیا ہے ان کو کیا دیا ہے؟ ان کو کب یہ باور کرنے دیا ہے کہ بھارت واقعی ان کا وطن ہے اور ان کے یہاں ایسے ہی شہری حقوق ہیں جیسے کہ ہندوؤں کے ہیں اگر آپ نے یہ سب کچھ مسلمانوں کے لئے کیا ہوتا تو پھر مسلمانوں سے آپ کا کوئی مطالبہ کسی درجہ میں معقول ہو بھی سکتا تھا آپ اور آپ کی قوم تو زندگی کی ہر منزل میں مسلمانوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں ہیں پس جب عملاً آپ خود اس کے قائل ہیں تو اب مسلمانوں سے یہ کہنے کے کیا معنے ہیں کہ ہندو کلچر اختیار کرو۔"

دوسری بات یہ ہے کہ آپ بار بار ہندو کلچر کی جو رٹ لگاتے ہیں تو اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا آپ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ بھارت صرف ہندوؤں کا ملک ہے اور یہاں کی گورنمنٹ بھی ہندو گورنمنٹ ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندو کلچر اسلامی کلچر سے بہتر اور بلند تر ہے اگر وجہ پہلی ہے تو گذارش یہ ہے کہ آپ خود بھارت کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے پھر آپ نے اس وقت صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں کی جب کہ دستور میں یہاں کی گورنمنٹ کو سیکولر قرار دیا گیا تھا اور ساتھ ہی تمام فرقوں کے لئے کلچر کی آزادی کا حق تسلیم کیا گیا تھا ٹنڈن جی کا اس وقت نہ صرف خاموش رہنا بلکہ دستور کی تکمیل کے بعد اس پر اپنے دستخط ثبت کر کے اسے بعینہٖ صحیح تسلیم کر لینا اور پھر اس طرح کی تقریریں کر کے خود اس کی خلاف ورزی کرنا کیا یہ سب کچھ اس کی دلیل نہیں ہے کہ ٹنڈن جی کے قول و فعل میں نہ صرف یہ کہ مطابقت نہیں ہے بلکہ وہ طبیعت کے بزدل اور ڈرپوک بھی ہیں۔

اور اگر وجہ دوسری ہے یعنی آپ ہندو کلچر کی تبلیغ اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کے خیال میں ہندو کلچر میں ایسی خوبیاں اور اچھائیاں ہیں جو اسلامی کلچر میں نہیں ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ ہندو کلچر کی یہ خوبیاں صرف اسلام کے مقابلہ میں ہیں یا سکھ عیسائی اور پارسی کلچر کے مقابلہ میں بھی ہیں تو پھر آپ کی یہ نظر عنایت مسلمانوں پر ہی کیوں ہے؟ اور اگر ان کے مقابلہ میں نہیں ہیں تو پھر آپ ہندو کلچر

ہی کا ڈھنڈورا کیوں پیٹ رہے ہیں بہرحال جہاں تک اسلامی کلچر کے ساتھ ہندو کلچر کے موازنہ کا تعلق ہے ہم ٹنڈن جی کو چیلنج کرتے ہیں کہ اگر آپ میں یہ جرأت ہے کہ دن کو رات اور رات کو دن ثابت کر سکیں اور تاریخِ انسانیت کے روشن و تابناک نقوش پر دھول ڈال سکیں تو میدان میں آئیے اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کیجئے ورنہ محض دعویٰ بے دلیل سے کچھ نہ ہوگا مسلمان اس طرح کبھی کسی کی دبیل میں نہیں رہ سکتا ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ   کہ عنقارا بلند است آشیانہ

ٹنڈن جی بھولتے ہیں کہ ان کی ان باتوں سے ملک میں فرقہ پرستی کی کیسی زہریلی بارود کی سرنگیں بچھ رہی ہیں کہ اس کا اگر بر وقت اور مناسب تدارک نہیں کیا گیا تو کسی دن پورے ملک کو بھک سے اڑا سکتی ہیں ان کی ان تقریروں سے ایک طرف وزیر اعظم اور ان جیسے ہزاروں سنجیدہ فکر کے ہندو سخت بیزار اور متنفر ہیں تو دوسری طرف مسلمان اور دوسری اقلیتیں بددلی محسوس کر رہی ہیں یہاں تک کہ سکھ جنہوں نے ہندوؤں کی دوستی میں اپنا سب کچھ فنا کر دیا پچھلے دنوں ان لوگوں کی بڑی نمائندہ کانفرنس امرتسر میں ہوئی تو اس میں مقرروں نے برملا ہندو کلچر اور ہندی زبان کی ڈکٹیٹر شپ کا رونا رویا اور تقریباً وہی باتیں کہیں جو تقسیم سے پہلے لیگ کہتی تھی۔ سکھ ایک بہادر قوم ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہ برملا کہتی ہے ان کے علاوہ دوسری اقلیتوں سے پوچھو کہ ٹنڈن جی کے رویہ کا ان پر کیا اثر ہے؟ صاف معلوم ہوگا کہ ٹنڈن جی اس طرح کی باتیں کر کے ملک کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی کر رہے ہیں اور اس کو فرقہ پرستی کی شدید لعنت میں پھر گرفتار کر دینا چاہتے ہیں۔

تدوین حدیث

(۵)

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

ابوبکر ایک قطعی فیصلہ پر پہنچ چکے تھے، اسی لئے کسی دوسرے سے حتیٰ کہ ام المومنین جیسی صاحبزادی سے بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مشورہ اس باب میں سنیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوچھتی رہیں، لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا، عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ.

فلما اصبح قال ای بنیہ ھلمی — جب صبح ہوئی تو (حضرت ابوبکر) نے فرمایا

الاحادیث التی عندک — بیٹی ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں

کچھ نہیں معلوم کہ جن حدیثوں کو اتنی محنت اور کاوش سے لکھا ہے ان کو کیا کریں گے، مگر حکم تھا لاکر عائشہ صدیقہ نے کتاب حاضر کردی اس کے بعد کیا ہوا ان ہی سے سنئے فرماتی ہیں

فدعا بنار فحرقھا — پھر آگ منگوائی اور اس نسخہ کو جلادیا۔

اور اب صدیقہ کی سمجھ میں آیا کہ رات بھر والد بے چینی کے ساتھ کروٹیں جو بدل رہے تھے اس کا اصلی راز کیا تھا سب سے بڑی کامیابی ابوبکر کو نظر آگئی کہ ان کی بہت بڑی ناکامی ہوگی اگر دنیا میں ان کے ہاتھ کی یہ لکھی ہوئی کتاب باقی رہ گئی جو نہیں جانتے ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں اور جو جانتا تھا اس نے کیا سمجھا، باپ بیٹی کی آئندہ گفتگو سے اس کا اندازہ کیجئے ۔ صدیقہ فرماتی ہیں جب والد نے کتاب میں آگ لگادی، اور اس کو جلادیا تب میں نے عرض کیا کہ

لم احرقتھا — آپ نے اسے کیوں جلادیا۔

یہی سننے کی بات ہے جو جواب میں حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ

خشیت ان اموت وھی عندی فیکون فیھا احادیث عن رجل قد ائتمنتہ ووثقتہ ولم یکن کما حدثنی فاکون قد نقلت ذاک فھذا لا یصح

مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ مرے پاس رہ جاتے، (بایں طور) کہ اس مجموعہ میں ایسے شخص کی بھی حدیثیں ہوں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا، اور اس کے بیان پر اعتماد کیا اگر جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا بات ویسی نہ ہو اور میں نے (اپنے مجموعہ) میں اسے نقل کر دیا۔ ایسا کرنا درست نہ ہوگا۔

میرے خیال میں تو بغیر کسی تاویل کے واضح اور صاف مطلب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا الفاظ کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن حدیثوں کے متعلق عمومیت اور اشاعت کا طریقہ پیغمبر نے اختیار نہیں فرمایا تھا بلکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی بات آخر جن بنیادوں پر مان لیا کرتا ہے، اور وہ بنیادیں کیا ہوتی ہیں، یہی کہ بہ ظاہر خبر دینے والا ایسا آدمی ہو جس کے متعلق سننے والے یہ خیال رکھتے ہوں کہ یہ ایک معتبر اور قابل بھروسہ آدمی ہے۔ دنیا کا عام کاروبار اسی پر چل رہا ہے حتیٰ کہ عدالتوں میں اسی قسم کے گواہوں کی شہادتوں پر اعتماد کر کے حکام فیصلے صادر کیا کرتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ قطعی یقین جو لازوال ہو اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی پس ان حدیثوں کے باب میں بھی یہی راہ جب اختیار کی گئی تھی۔ اور اسی راہ سے جن حدیثوں کا علم انھیں حاصل ہوا تھا۔ یعنی ان کے بیان کرنے والوں کے متعلق اس کی ضمانت نہیں تلاش کی گئی کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، سچ ہی کہہ رہے ہیں، بلکہ ان کے عام حالات کو دیکھتے ہوئے جو کچھ انھوں نے بیان کیا تھا حضرت ابو بکر نے مان لیا تھا اور ان پر بھروسہ کر کے ان کی روایت کردہ حدیثوں کو اس مجموعہ میں جمع کر دیا تھا، اصل نوعیت تو ان حدیثوں کی یہی ہے، ان کی تبلیغ ہی ایسے ڈھنگ سے پیغمبر نے کی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا، اور یہی ہوا، مگر اسی وجہ سے کہ بالکلیہ ہر قسم کے

شکوک وشبہات کے ازالہ کی کوشش ان حدیثوں کے متعلق نہیں کی گئی ہے اس کا بھی احتمال ان میں باقی ہے کہ بیان کرنے والوں کا بیان ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو جیسا کہ گذر چکا، اس احتمال کی گنجائش دین کے اسی حصہ میں قصداً رکھی گئی ہے اسی گنجائش نے اس کے مطالبہ کی قوت کو دین کے اس حصہ کے مطالبہ کی قوت کے مقابلہ میں کچھ کمزور کر دیا ہے جس میں قطعاً اس احتمال کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک حضرت ابوبکر نے ان روایتوں کو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اپنی کتاب میں درج نہیں کیا تھا، اُن کا یہی حال تھا مگر سوچنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ اور دینی وسیاسی جانشین کی حکومت کی طرف سے جو کتاب مرتب کرائی گئی ہو اس میں مندرج ہو جانے کے بعد کیا ان حدیثوں کا یہی حال جس کا باقی رکھنا مقصود تھا باقی رہ سکتا تھا، ابوبکر صدیق کی وہ کتاب آج مسلمانوں میں ہوتی تب بتایا جا سکتا تھا کہ اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام وقوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور گرویدگی کا کیا حال ہے

ناکون قد نقلت ذاك فهذا لا يصح

ان الفاظ کا کم از کم میری سمجھ میں یہی مطلب آیا ہے بلکہ شاید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسرے مطلب کی گنجائش بھی ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی اوروں سے بھی میری یہی استدعا ہے کہ ان الفاظ کا کوئی دوسرا مطلب ان کے ذہن میں پہلے سے اگر موجود ہو یا غور کرنے سے اب معلوم ہوتا ہو تو مجھے مطلع فرما سکتے ہیں کیونکہ اس کا احتمال ہی نہیں ہے کہ شبہ کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے ان حدیثوں کو قابل قبول نہ قرار دیا ہو کیونکہ ان کا مسلک اگر یہی ہوتا تو شروع ہی سے ان حدیثوں کے جمع کرنے کا ارادہ چاہئے تھا کہ نہ فرماتے آخر یہ احتمال کہ باوجود سچ بولنے کے ہر وہ شخص جو معصوم نہیں ہے اس کی خبر میں صدق کے ساتھ کذب اور سچ کے ساتھ جھوٹ ہونے کا بھی اندیشہ کیا جا سکتا ہے، یہ اندیشہ تو لکھنے سے پہلے ان ساری روایتوں کے متعلق پیدا ہو سکتا

تھا جنھیں دوسروں سے سن کر انھوں نے اپنے اس مجموعہ میں درج کیا تھا لیکن باوجود اس اندیشہ
کے جب ان حدیثوں کو لکھ چکے تو لکھنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ مزید کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا تھا
اضافہ اگر ہوا تھا تو اسی امر کا ان کے قلم بند کر دینے کے بعد وہ شبہ جس کا ہر حدیث کے ساتھ احتمال
لگا ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا بلکہ خلافت کی طرف سے اگر اس کی اشاعت نہ بھی کرتے گھر ہی
میں رکھے رہتے مگر ان کے بعد لوگوں کو یہی کتاب ملتی تو ظاہر ہے کہ ابوبکر کی طرف منسوب ہو جاتا
ہی اس شبہ کے ازالہ کے لئے کافی ہوتا بلکہ ان کے الفاظ "خشیت ان اموت وھی عندی
(مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے) ان الفاظ سے
تو اسی کی تائید ہوتی ہے کہ اشاعت بھی ان کی زندگی میں اس کتاب کی اگرچہ نہ کی جاتی جب بھی ان
کے پاس سے اس کتاب کا نکلنا یہی اس نوعیت اور اس کیفیت کو بدل دینے کے لئے ان کے
نزدیک کافی ہوتا جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا پیغمبر کا مقصود تھا سیدھی بات تو یہ ہے کہ
حضرت ابوبکر کا مسلک اگر یہی ہوتا کہ خبر آحاد میں چونکہ غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے چاہئے کہ
اپنی دینی زندگی میں مسلمان اس سے قطعاً استفادہ نہ کریں اور اسی وجہ سے اپنی اس کتاب کو
انھوں نے اگر نذر آتش کیا تھا تو چاہئے تھا کہ کبھی ایک دو آدمیوں کی روایتوں پر وہ بھروسہ نہ
کرتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ پیش ہونے پر اسی کے مطابق صرف فیصلہ ہی نہیں بلکہ ضرورت کے وقت
لوگوں سے اسی قسم کی حدیثوں کی جستجو اور تلاش بتایا گیا ہے کہ ان کا یہ ایک عام دستور العمل تھا۔
آخر طبقات ابن سعد میں حضرت ابوبکر کی طرف اس اصول کو جو منسوب کیا گیا ہے کہ

ان ابا بکر اذا نزلت به قضیة	حضرت ابوبکر کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی صورت
لم یجد لھا فی کتاب اللہ اصلا	حال ان کے سامنے ایسی پیش ہوتی جس کے
ولا فی السنة اثرا فقال اجتھد	متعلق نہ کتاب اللہ ہی میں کوئی اصل ملتی اور
برائی فان یکن صوابا فمن اللہ	نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اس
وان یکن خطاء فمنی واستغفر اللہ	کے متعلق کسی اثر کا پتہ چلتا تو فرماتے کہ اپنی رائے

ج ۳ ص۱۳۶ سے اب میں اجتہاد کرتا ہوں میرا یہ اجتہادی
نتیجہ اگر درست ہوا تو یہ اللہ کی طرف سے
(توفیق) ہو گی اور اگر غلط ہوا تو اس کی ذمہ داری
میری طرف عاید ہو گی میں خدا سے اس غلطی
کے متعلق معافی چاہتا ہوں۔

یہ کسی معمولی آدمی کا نہیں بلکہ ابن سیرین جیسے محقق صادق کا بیان ہے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی نیا مقدمہ یا مسئلہ پیش آتا تو پہلے قرآن میں اس کی اصل تلاش کرتے اس میں نہ ملتا تو سنت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں کوئی اثر اور نمونہ مل سکتا ہے تو اس کو ڈھونڈھتے، جب ان دونوں میں کوئی چیز نہ ملتی تو پھر خود اجتہاد فرماتے یہی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جب کوئی اصل نہ ملتی تو سنت میں اثر تلاش کرنے کا کیا طریقہ تھا ظاہر ہے کہ کوئی کتاب ایسی اس وقت تو موجود نہ تھی جس سے مدد لی جا سکتی تھی، یہی کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے متعلق حضرت ابوبکر کے پاس جو معلومات تھے ان میں ڈھونڈھتے اپنے پاس نہ ہوتا تو دوسروں سے پوچھتے متعدد واقعات میں انھوں نے یہی کیا بھی تھا جس کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے وہی جدہ (دادی) کی میراث کا مسئلہ ہے کون نہیں جانتا کہ خود حضرت ابوبکر کے پاس اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا، الذہبی میں ہے کہ

ثم سال الناس تذکرہ ص۳ تب حضرت ابوبکر نے لوگوں سے دریافت کیا

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور کسی کو معلوم ہو تو بتائیں تب حضرت مغیرہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فیصلہ کا اس مسئلہ کے متعلق ان کے پاس علم تھا اس کو پیش کیا جو ظاہر ہے کہ ایک خبر تھی، صدق و کذب کا احتمال اس میں بھی تھا جیسا لکھا ہے زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے حضرت ابوبکر نے پوچھا کہ کوئی اور صاحب بھی اس فیصلہ کی شہادت دے سکتے ہیں محمد بن مسلمہ نے جب تائید کی تو اسی حدیث کے مطابق

حضرت ابوبکرؓ نے فیصلہ کر دیا کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک آدمی کی خبر ہو یا دو کی غلطی کا احتمال دونوں میں رہتا ہے۔ البتہ دوسرے آدمی کی تائید سے اس احتمال میں کچھ کمی ضرور ہو جاتی ہے جیسے عدالت کے مقدمات میں بھی یہی کیا جاتا ہے کہ بجائے ایک گواہ کے دو گواہوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے یہی حضرت ابوبکرؓ نے بھی کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لکھا ہے کہ بجائے اس کے مقدمات ہی کے سلسلہ میں مزید اطمینان کا جو طریقہ ہے، یعنی قسم کھلوانا یا حلف لینا اس پر عمل کرتے تھے[۱]۔ حالاں کہ جب آدمی جھوٹ بول سکتا ہے اور بولتا ہے تو کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اور سکتا کیا معنی آئے دن جھوٹی قسموں کا بھی اسی طرح تجربہ ہوتا رہتا ہے جیسے جھوٹ بولنے کا، البتہ قسم سے جھوٹ کا احتمال ایک حد تک کم ہو جاتا ہے جیسے مزید ایک اور گواہی سے بھی یہی فائدہ ہوتا ہے۔

بہر حال شبہ تو بہر حال باقی رہتا ہے پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلک اگر یہ ہوتا کہ خبر آحاد میں چوں کہ غلطی کا شبہ ہے اس لئے اس کو مسترد کر دینا چاہئے اور اسی خیال کے زیر اثر اگر اپنی جمع کی ہوئی حدیثوں کو انھوں نے جلا دیا تھا تو چاہئے تھا کہ باوجود شبہ کے محض ایک یا دو آدمی کے بیان پر بھروسہ کر کے قطعاً فیصلہ نہ کرتے۔

پس کوئی وجہ اس مجموعہ کے جلانے کی اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابوبکرؓ کی کتاب میں داخل ہو جانے کے بعد کم از کم پانسو حدیثوں کے اس مجموعہ کے متعلق مسلمانوں میں وہ احساس قطعاً باقی نہ رہتا جسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی روایتوں میں قایم رکھنا چاہتے تھے، جذبہ کی مغلوبیت میں اگرچہ ایک فعل ان سے سرزد ہو گیا لیکن اس کے انجام پر جب ان کی نظر گئی تو ان کو یہ محسوس ہوا کہ نبوت کا جو منشا تھا ان کے اس فعل سے متاثر ہو جائے گا اور یہی سوچ کر

---

[۱] ذہبی نے خود حضرت والا کا قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کوئی بات جب میں سنتا تو جتنی توفیق ہوتی اس پر عمل کرتا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جب دوسرے سے سنتا تو قسم لے کر اطمینان حاصل کرتا تھا تذکرۃ الحفاظ ص۱۰ ج ۱

مراخیال بھی ہے کہ اس مکتوبہ مجموعہ کو حضرت نے ضائع فرمادیا۔ یقیناً آج مسلمانوں کے پاس حضرت ابوبکر کی یہ کتاب اگر موجود ہوتی تو یقیناً اس کتاب کی مندرجہ حدیثوں کے نتائج کے مطالبہ اور گرفت کی وہ نوعیت قطعاً باقی نہ رہتی جو اس وقت خبر آحاد کی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی ہے۔[۱]

خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کی تحریق یا نذر آتش کرنے کا پہلا واقعہ عہد نبوت میں اس لئے پیش آیا تھا کہ کتابوں کی کمیت اور کثرت تعداد سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں عمومیت کا رنگ پیدا کر کے آئندہ مسلمانوں کی زندگی میں عنیق اور تنگی کی وجہ یہی حدیثیں نہ بن جائیں دین کے دونوں حصوں میں مراتب کے فرق کو باقی رکھنے کے لئے خود پیغمبر کے زمانہ میں حدیثوں کے اس کتابی ذخیرے کو جلا کر ختم کر دیا گیا اور ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں اگرچہ کتاب تو ایک ہی تھی۔ لیکن جس نے کتاب مرتب کی تھی اس کی ذاتی خصوصیات کا نفسیاتی اثر بھی اس فرق کو چونکہ ختم کر دیتا جسے بالارادہ قصداً دین کے دونوں حصوں میں باقی رکھنا مقصود تھا اسی لئے ابوبکر صدیق

---

[۱] اس موقعہ پر اپنی طالب العلمی کے زمانہ کا ایک لطیفہ بے ساختہ یاد آ گیا۔ دارالعلوم دیوبند میں جب فقیر طالب العلم تھا میرے ساتھ ایک کافی مجمع دوسرے طلبہ کا بھی تھا میں ان لوگوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ فقیر آپ لوگوں کے زمانہ میں پیدا ہو گیا خدانخواستہ سو سوا سو سال بعد اگر پیدا ہوتا اور آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب کتاب لکھ کر چلے جاتے۔ آپ کی کتاب کہیں مصر میں چھپ جاتی تو میرے لئے گویا تم ہی جیسے لوگوں کی باتیں حجت کی حیثیت اختیار کر لیتیں ہر شخص ڈراتا کہ فلاں علامہ نے اپنی کتاب میں اس کی تصریح کی ہے اب تیرے لئے نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے گر میں جانتا ہوں کہ تم میں کتنے ہیں جو کتاب کا بھی صحیح مطلب نہیں سمجھتے شریعت کے گرا ور تہ تک پہنچنا تو بڑی بات ہے بہر حال کتابی قالب کسی چیز کا اختیار کر لینا خصوصاً مذہب اور دین سے اس کا تعلق ہو تو انسانی نفسیات پر اس کے عجیب و غریب اثرات مرتب ہوتے ہیں اسلام میں حالانکہ شروع ہی سے مراتب و مدارج کے فرق کو باقی رکھنے کے لئے بڑے بڑے انتظام کئے گئے ہیں لیکن بااین ہمہ عام مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے دیکھا جاتا ہے کہ فلاں کتاب میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کافی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس مسئلہ کا سرچشمہ کیا ہے۔ کتاب ہے یا سنت ہے یا اجماع ہے۔ قیاس ہے۔ استحسان ہے یا صرف گذشتہ زمانہ کے لوگوں کا تجربہ یا رواج ہے ۱۲۔

سے نے بھی پیغمبر کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس کتاب کو جلا کر خطرے کا انسداد فرمایا گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے عہد نبوت میں اسی فرق کو باقی رکھنے کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا، اسی طرز عمل کی تجدید و احیاء کا ایک قدرتی موقعہ حضرت ابوبکر کو بھی مل گیا۔

بہر حال میرے نزدیک تدوین حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہی خدمت تھی جسے آپ نے انجام دی، لیکن ظاہر ہے اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ اس نوعیت کی حدیثوں کو کسی تحقیق و تنقید یا چھان بین کے بغیر قبول کر لیا جائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا جو انتظام تھا اس کا ذکر کر چکا ہوں "من کذب علی متعمدا" والی حدیث کی ایسی عمومی اشاعت کہ معنیً اس میں تواتر کا رنگ پیدا ہو گیا یہ اسی انتظام کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اور گو عام طور پر لوگ اس روایت کا کم ذکر کرتے ہیں، لیکن مجمع الفوائد وغیرہ میں طبرانی کے حوالہ سے یہ قصہ جو نقل کیا گیا ہے راوی اس کے وہی عبداللہ ابن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، فرماتے ہیں کہ

ان رجلا لبس حلة مثل حلة النبی صلی اللہ علیہ وسلم واتی اهل بیت من المدینة فقال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لی ای بیت شئت استطعت فقالوا عهدنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یامر بالفواحش فاعدوا له بیتا وارسلوا رسولا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبروه فقال لابی بکر وعمر انطلقا الیه فان وجدتماه حیا فاقتلاه ثم حرقاه بالنار۔ جمع الفوائد ص۲۷

ایک شخص اسی قسم کا لباس پہن کر مدینہ منورہ کے کسی صاحب کے گھر میں پہنچا جیسا لباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیب تن فرمایا کرتے تھے اور گھر والوں سے اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جس گھر میں چاہو تم جہاں تک سکتے ہو تب لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد ہم سے لیا ہے (اسے ہم جانتے ہیں)، کبھی آپ بے شرمی کی باتوں کا حکم نہیں دیتے، پھر ان ہی لوگوں نے اس کے لئے ایک گھر خالی کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

ایک آدمی بھیجا اور جو بات اس شخص نے کہی تھی
اس کے متعلق دریافت کیا آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو اس شخص کی اس غلط بیانی کا علم ہوا
تو آپ نے ابوبکر و عمر کو حکم دیا کہ اس شخص کے
پاس جاؤ، اگر اس کو زندہ پاؤ تو قتل کر دینا، اور
آگ میں جلا دینا۔[1]

آگے بیان کیا گیا ہے کہ ان حضرات کے پہونچنے سے پہلے اس شخص کو سانپ نے ڈس لیا، جب تک یہ لوگ پہنچے وہ مرچکا تھا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور پیشین گوئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا اصابہ میں ہے کہ بھیجتے ہوئے رسول اللہ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں تم دونوں اس شخص کو نہ پا سکوگے (اصابہ صفحہ ۲۴۳ ج ۱)

بہرحال اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کرنے والے کو حکومت چاہے تو قتل تک کی سزا دے سکتی ہے اور بعد کو سلاطین اسلام نے اس قسم کے زنادقہ کو یہی سزا دی بھی ہے جس کا ذکر انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گا
بس اصلی کام دین کے اس حصے کے متعلق وہی "کچھ دار مریز" کے اصول کی نگرانی تھی ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ نے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ دین کے اس حصے میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جائے جس کی عمومی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی اپنے لکھے ہوئے مجموعہ کو ضائع بھی فرما دیا، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے خبروں کی تحقیق و تنقید کے عام اصول کے سوا حضرت مغیرہ کے بیان کرنے پر جو یہ فرمایا کہ ھل معک غیرک (کیا تمہارے ساتھ اس خبر میں

---

[1] حافظ ابن حجر نے اصابہ میں بھی اس روایت کو الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ نقل کیا ہے اصابہ والی روایت میں ہے کہ اس شخص نے آکر لوگوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرا نکاح فلاں عورت سے کر دیا ہے، اسی طرح بجائے حضرت ابوبکر و عمر کے اصابہ والی روایت میں ہے کہ حضرت علی و مقداد کو رسول اللہ نے اس شخص کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا ۱۲۔

کوئی دوسرا آدمی بھی ہے) اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ جیسے فصل خصومات کے لئے کم از کم شہادت کا نصاب دو ہے اسی طرح اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لئے کم از کم دو راویوں کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ دین کے اس حصہ پر اعتماد کرنے کے لئے اس کو قانونی نصاب کی شکل اگر دے دی جائے گی تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کم از کم دو آدمیوں کو ضرور فرماتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری ہے، ایک ذخیرہ روایات کا پایا جاتا ہے جن کے متعلق خود صحابی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کیا تھا نیز دنیا کے عام کاروبار میں جیسے اس وقت تک دیکھا جا رہا ہے عہد نبوت میں بھی بقول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہی دستور تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ضرورتوں کے لئے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوتے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ

انت واحد ولیس لك ان نأخذ منا مالم نسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انہ بعثکم علینا (الرسالہ صنا)	تم تنہا اکیلے آدمی ہو اس لئے تمہیں اس کا حق نہیں ہے کہ ہم سے کچھ اس وقت تک وصول کرو جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم یہ نہ سن لیں کہ ہم لوگوں سے (صدقہ وغیرہ وصول کرنے کے لئے) تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے ۔

خود ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں خصوصاً وراثت انبیاء والی روایت، "اور پیغمبر کے مدفون ہونے کی جگہ وہی ہوتی ہے جہاں ان کی وفات واقع ہو، ان دونوں حدیثوں کے وہ تنہا راوی ہیں اور ایک وہی کیا آپ کے بعد خلفاء اور دوسرے صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کرکے حدیثوں کو عموماً مانتے رہے ہیں اس کے

متعلق واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو ایک جگہ اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ کفایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الخطیب نے ایک مستقل کتاب میں ان روایات کو جمع کر دیا ہے۔

بہرحال جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی نہ کہ اعتماد کی شرط تھی، بجنسہٖ یہی حال حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل کا ہے کہ اعتماد میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے اس لئے آپ نے چاہا کہ کوئی اور صاحب بھی جانتے ہوں تو بیان کریں اتفاقاً محمد بن مسلمہ بھی اس روایت کے جاننے والے نکل آئے میں تو نہیں سمجھتا کہ اگر محمد بن مسلمہ کی تائید نہ ملتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مغیرہ کے بیان کو مسترد فرما دیتے۔

تاہم ان کے اس طرز عمل سے یہ سبق مسلمانوں کو ضرور ملا کہ دین کا یہی حصہ کیوں نہ ہو یعنی خبر الآحاد یا الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو پہنچایا گیا ہے اس کے رد و قبول میں لاپروائی سے کام نہ لینا چاہئے آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے بیان کرنے کے بعد بھی مزید تائید کا انھوں نے مطالبہ کیا، تو جو صحابی نہیں ہیں خود سمجھنا چاہئے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو کس درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور غالباً علاوہ مزید اطمینان کے شاید یہ سبق بھی اپنے اس طریقہ کار سے وہ دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے بعد ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے ہیں کہ اسی سنت صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا آپ نے بھی مطالبہ فرمایا بلکہ اپنی خاص فطرت کے لحاظ سے اس مطالبہ میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی، میرا اشارہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس مشہور دلچسپ روایت کی طرف ہے جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ ابوموسیٰ اشعری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے حاضر ہوئے آپ اندر تھے جیسا کہ اسلامی دستور ہے کہ اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ باہر ہی سے حضرت عمر کو سلام کیا لیکن جواب نہ آیا، دوسری

دفعہ تیسری دفعہ بھی جب ان کو جواب نہ ملا تو لوٹ گئے، ان کا لوٹنا تھا کہ حضرت عمر نے پیچھے سے اپنا آدمی روانہ کیا کہ ابو موسیٰ کو بلا کر لے آؤ جب وہ آئے تو فرمایا کہ تم نے جو کچھ آج کیا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم تم نے پائی ہے؟ حضرت ابو موسیٰ نے کہا کہ ہاں! آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اجازت تین دفعہ لی جائے نہ ملے تو آدمی واپس لوٹ جائے اسی پر میں نے عمل کیا حضرت عمر نے ذرا آنکھ نکالتے ہوئے فرمایا لتقیمن علیہ ببینۃ (تم کو اس پر شہادت پیش کرنی پڑے گی) بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ لا فعلن (میں تمہارے ساتھ کچھ ضرور کر دوں گا، یعنی خلاف بیانی کی سزا دوں گا، بعضوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ

ان کان ھذا شیئا حفظتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فہا والا لاجعلنک عظۃ	اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کیا ہے تو خیر ورنہ تم کو میں دوسروں کے لئے باعث عبرت بناؤں گا۔

(جمع الفوائد بحوالہ خمسہ عنہم ۱۲)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقۂ گفتگو کے اس خاص انداز سے ابو موسیٰ کچھ گھبرا سے گئے اور انصار کا ایک مجمع کہیں قریب ہی تھا وہاں پریشان حال پہنچے، سید القراء حضرت ابی بن کعب اس جماعت میں سب سے بڑے تھے۔ انہی سے دریافت کرتے ہوئے کہ آپ لوگوں میں کوئی صاحب ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہو اور حضرت عمر نے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا تھا اس کا بھی اظہار کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے جو مذاق شناس تھے وہ ان کے اس طرز عمل کو سن کر ہنس پڑے، لیکن حضرت اُبی نے ان لوگوں کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ یہ بیچارے تو پریشان ہیں اور تم لوگ ہنستے ہو پھر کہا کہ اس حدیث سے تو غالباً ہم انصار میں جو سب سے عمر میں چھوٹا ہے وہ بھی واقف ہوگا ابو سعید خدری سب سے عمر میں چھوٹے تھے، انہی کو حکم دیا گیا، ابو موسیٰ کے ساتھ گئے اور ان کے بیان کی حضرت عمر کے سامنے توثیق کی، بہر حال یہ قصہ تو ختم ہو گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو موسیٰ کو خوف زدہ پاکر کچھ حضرت ابی بن کعب کو خیال آیا۔ اسی وقت یا اس کے کچھ دیر کے بعد وہ حضرت عمر کے پاس حاضر ہوتے اور کہا

یا ابن الخطاب فلا تکونن عذابا علی اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی اے ابن الخطاب (خدا نے تم کو مسلمانوں کا اگر امیر بنا دیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے لئے تم عذاب نہ بنو۔

اُبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شکایت کو سن کر جو واقعہ تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمر نے کہا کہ

سبحان اللہ سبحان اللہ انما سمعت شیئا فاحببت ان تثبت	سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی چاہا کہ استواری پیدا کردی جائے۔

بعض روایتوں میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت عمر نے ابوسعید خدری کی مزید تائید کے بعد ابو موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ

اما انی لم اتہمک ولکن خشیت ان یتقول الناس علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلط بیانی کے ساتھ تم کو میں متہم نہیں کرتا، لیکن مجھے اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی باتیں لوگ نہ منسوب کرنے لگیں۔

اور بات درحقیقت یہی تھی یہ نہ تھا کہ تنہا ابو موسیٰ کی روایت پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتماد نہ تھا ان کے حالات میں پڑھئے خود جانے اس نوعیت کی حدیثوں میں صرف ایک صاحب کے بیان پر ان ہی حضرت عمر نے کتنی دفعہ اعتماد کیا ہے لیکن اس دفعہ ذرا سختی دکھا کر جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی، جیسے ابو موسیٰ تھے ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے تو جو صحابی نہیں ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ پیغمبر کی طرف لاپروائی کے ساتھ باتوں کے منسوب کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ موریثین میں بعد کو "شواہد و توابع" کا جو ذوق تما پیدا ہوا، یعنی ایک ہی حدیث حتی الامکان حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے میں عجیب و غریب والہانہ جذبات کا ظہور ان سے جو ہوا ہے کچھ تفصیل اس کی گذر بھی چکی ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقعہ پر ان کوششوں کا ذکر انشاءاللہ آتے گا خصوصاً امام بخاری

اور امام مسلم کی کتابوں کی روایتوں کا جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا منجملہ دوسرے امتیازات کے ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے یعنی شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں عموماً ان دونوں کتابوں کی روایتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

"طرق متعددہ دارد کہ یکے گواہ دیگر تواند بود وہر یکے متماسک بود" مکتوبات شاہ ولی اللہ ص ۲۱

اور اسی چیز نے منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ان دونوں کتابوں کے درجہ کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ حدیثوں کا کوئی مجموعہ ان کے ہم پلہ باقی نہیں رہا ہے

سچ پوچھیے تو خبر احاد کے متعلق اس طرز عمل کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی دن رکھ دی تھی جس دن مغیرہ کی روایت کو سن کر آپ نے مزید شہادت کا مطالبہ فرمایا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد خلافت میں وقتاً فوقتاً اس بنیاد کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے، ابوموسیٰ ہی کے ساتھ نہیں بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اوروں کے ساتھ بھی حضرت عمر نے کئی دفعہ اسی طرز عمل کو دہرایا[1]

---

[1] اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف قصہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مکان کا ہے جو مسجد نبوی سے متصل تھا بیان یہ کیا جاتا ہے کہ مدینہ کی آبادی عہد فاروقی میں جب بہت زیادہ بڑھ گئی اور مسجد نبوی میں تنگی محسوس ہونے لگی تو اطراف وجوانب کے مکانات کو حضرت عمر نے بیت المال سے خرید خرید کر مسجد کے ساتھ ملانا شروع کیا۔ آخر میں حضرت عباس کا مکان رہ گیا تھا۔ حضرت عمر نے ان کو بھی حکم دیا کہ فروخت کر دیجئے لیکن وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی وجہ سے وہ اڑ گئے گو حضرت عمر مختلف قسم کی رعایتوں کا ان کے ساتھ وعدے کرتے رہے لیکن وہ آمادہ نہ ہوتے۔ آخر ایک دن یہ ہوا کہ اس قصے کو ثالثیت میں دے دیا جائے ابی بن کعب سید القراء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دونوں نے حکم تسلیم کر لیا۔ قصہ ان کے پاس پیش ہوا۔ ابی نے دونوں کے بیانات کو سن کر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا حکم داؤد علیہ السلام کو جب ہوا اور جب تعمیر میں وہ مشغول ہوئے تو کسی آدمی کا مکان درمیان میں کچھ ایسا حائل ہوا کہ اس مکان کا نقشہ اس سے بگڑتا تھا یعنی تربیع یا چاروں سمت برابر ہو، اس میں نقص پیدا ہوتا تھا۔ اس شخص سے حضرت داؤد نے کہا کہ فروخت کر دو مگر وہ راضی نہ ہوا آخر حضرت داؤد

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الغرض تدوین حدیث کی تاریخ میں "شواہد و توابع" کا بنیاد ان رفیع بعد کو قائم ہوا۔ سچ پوچھیے تو وہ اسی صدیقی بنیاد پر اس کی تعمیر کھڑی کی گئی۔ الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نے دل میں طے کیا کہ زبردستی حکومت اس پر قبضہ کر لے گی۔ حق تعالیٰ کو ان کا ارادہ ناگوار گذرا۔ وحی ہوئی کہ داؤد میں نے تم کو حکم دیا کہ میری یاد کے لئے گھر بناؤ سو تم نے ارادہ کیا کہ غصب اور زبردستی چھینی ہوئی زمین کو اس مکان میں شریک کرو، مگر میری شان یہ نہیں ہے کہ میرے گھر میں مغصوبہ زبردستی چھینی ہوئی چیز داخل ہو، اس ارادے کی تم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کی تعمیر پوری نہ کر سکو گے تب داؤد نے کہا کہ پروردگار! میں نہیں تو اس کی تکمیل میرے فرزند کے ہاتھوں کرا دی جائے ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ ہوگا۔ حضرت ابی نے یہ حدیث جو سنائی تو حضرت عمر بے اختیار ہو گئے اور ابی کے دامن کو پکڑ کر فرمانے لگے کہ میں تو تمہارے پاس اس لئے آیا تھا کہ سہولت پیدا کرو گے تم نے تو اور بھی زیادہ سخت بات پیش کر دی اور کہا کہ تم کو اپنے اس بیان کی تائید میں شہادت پیش کرنی پڑے گی۔ دونوں مسجد آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا ایک مجمع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت ابوذر بھی تھے۔ ابی نے مجمع کی طرف خطاب کر کے کہا کہ میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ بیت المقدس کی تعمیر کے اس قصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اگر سنا ہو تو بیان کرے حضرت ابوذر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے تب حضرت ابی نے کہا کہ عمر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مجھے متہم کرتے ہو حضرت عمر نے کہا خدا کی قسم میں نے تم کو متہم نہیں ٹھہرایا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں عام طور پر پھیل جائیں یعنی وہی مقصد تھا کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں عمومیت کا رنگ اگر ان حدیثوں میں پیدا کر دیا جائے گا جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی اور انفرادی راہوں سے پہنچائی ہیں تو آنحضرت کا جو منشاء مبارک ہے وہ جاتا رہے گا۔ حضرت ابی یہ سن کر مطمئن ہو گئے اور جب حضرت عباس کو بھی محسوس ہوا کہ حکم کی راہ سے میرے گھر پر قبضہ کرنے سے عمر مایوس ہو چکے تو حاضر ہو کے کہ عمر لو! اب اس مکان کو مسلمانوں کے لئے میں خیرات کرتا ہوں اور ان کی مسجد میں اس کا اضافہ کر کے گنجائش پیدا کرتا ہوں صفحہ ۱۲ ج ۴ ابن سعد مسجد نبوی کے پاس حضرت عباس کے اسی مکان کا ایک اور دلچسپ قصہ ہے۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ اس کا ذکر کر دوں۔ ابن سعد ہی میں ہے کہ اسی مکان کے چھت میں ایک پرنالہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کپڑے بدل کر حضرت عمر خلافت کے زمانہ میں مسجد جا رہے تھے اس دن مرغی کے بچے حضرت عباس کے لئے ذبح کئے گئے تھے اس بچے کے گوشت وغیرہ کے دھونے کا خون اور آلائش

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے مذکورہ بالا قصہ کو درج کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ

وفی ذلک حض علی تکثیر طرق الحدیث ص۴ | یعنی حدیثوں کے طرق میں بعد کو جس کثرت کا خیال لوگوں کو ہوا۔ اس پر لوگوں کو حضرت عمرؓ ہی کے طرز عمل نے آمادہ کیا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ بنیاد اس کی تو ابوبکر صدیقؓ رکھ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس بنیاد کے استحکام و استواری میں مدد ملی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج دین کے اس حصہ کی کیفیت تیرہ سو سال بعد تک مسلمانوں میں اپنی خاص خصوصیتوں کے ساتھ جو موجود ہے یعنی ایک طرف مسلمانوں نے اس حصہ کو دین کے بنیادی حصہ کے برابر نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ مدارج و مراتب کے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی، جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً و ارادۃً اس حصہ میں پیدا کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح ہر زمانہ میں اس کا بھی خیال کیا گیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین، تحقیق و تلاش، تنقید و تحقیر کی کوششوں میں مسلمان ابتدائے اسلام سے اس وقت تک مشغول ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی خاص علاقہ یا ملک میں جہل کے پھیل جانے کی وجہ سے کچھ دن کے لئے بے تمیزیاں پھیل گئی ہوں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چھت سے کسی نے بہا دیا۔ ٹھیک حضرت عمرؓ جب پرنالے کے پاس تھے، سارا پانی ان کے جسم پر گرا اس۔ تب ایسا جذب طاری ہوا کہ آدمی بلوا کر خود اپنے ہاتھ سے اس پرنالے کو اُکھڑوا دیا حضرت عباسؓ کو اس کی جب خبر ہوئی تو اور کچھ نہ بولے صرف اتنا فرمایا کہ اس پرنالے کو براہ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نصب کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ عمرؓ بے چین ہو گئے اور قسم دے کر حضرت عباسؓ کو آمادہ کیا کہ عمرؓ کے کندھے پر چڑھ کر اس نالی کو اسی جگہ پر نصب کر دیں جہاں پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس کو نصب کیا تھا، آخر یہی کیا گیا ص۱۳ ابن سعد ج ۴ (باقی آئندہ)

قدرتی نظام وحدت

(۲)

اشما

(جناب مولوی ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانحی)

آنحضرت صلعم کی امامت کیلئے ایک جامع شخصیت کی نامزدگی

آپ جب مرض سے نڈھال ہوگئے، اور بار بار غشی کے باوجود غشی پر غشی آتی رہی تو آپ نے اس جگہ کے لئے اپنا قائم مقام اور خلیفہ اس فرد کو بنایا! جو عالم انسانی میں انبیاء و رسل کے بعد افضل ترین تھا جن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں "اعلم" ہونے کا درجہ حاصل تھا، یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہم کو آپ نے اپنی جگہ عطا فرمائی، آپ کی بعض ازواج مطہرات نے فاروق اعظمؓ کی سفارش کی اور باصرار و تکرار کی، مگر آپ نے اس مشورہ کو رد فرما دیا اور اس سلسلہ میں ایک حیلہ فرما کر اس حرکت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ صدیق اکبرؓ نے امامت فرمائی۔

اسی مرض الوفات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین دفعہ آپ نے پانی رکھنے کا حکم فرمایا، مگر ہر بار غشی کا دورہ پڑتا رہا، مسجد کی حاضری سے جب مایوسی ہوگئی، تو آپ نے صدیق اکبرؓ کو امامت کے لئے کہلا بھیجا، قاصد جب یہ پیام لے کر پہنچا تو صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "یا عمر صل بالناس" (لوگوں کو نماز پڑھائیے) یہ سن کر فاروق اعظم نے آپ سے فرمایا "انت احق بذالك" (آپ ہی اس کام کے زیادہ لایق اور مناسب ہیں) چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے امامت کی۔[1]

امام کے لئے کامل الفقہ ہونے کی ضرورت

یہ واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کبار نے واضح طور پر اس مسئلہ کو بیان کر دیا کہ امامت قوم کے بہترین فرد کا حقہ ہے

[1] مسلم باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر ... ج ۱ ص ۱۷۹

اور یہ عظیم الشان ذمہ داری اس شخص پر ڈالی جائے۔ جو ہر طرح اس عہدۂ جلیلہ کا مستحق ہو، نیز وہ علم و فضل اور جلالتِ شان میں اپنا نمایاں درجہ رکھتا ہو غالباً یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے مستحقین امامت میں اعلم الناس کو اول درجہ دیا ہے اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں۔

فقد یعرض فی الصلاۃ امر لا	نماز میں کبھی ایسی بات پیش آجاتی ہے جس کی
یقدر علی مراعاۃ الصلاۃ فیہ الا	رعایت سوائے کامل الفقہ کے اور کسی کے
کامل الفقہ ولھذا قدم النبی	بس کی بات نہیں، اور یہی وجہ تھی کہ نبی کریم صلعم
صلی اللہ علیہ وسلم ابابکر فی	نے ابوبکرؓ کو بقیہ لوگوں پر نماز کے باب میں ترجیح
الصلاۃ علی الباقین مع ان	دی باوجود اس بات کے کہ آپ نے ان کے غیر
النبی صلی اللہ علیہ وسلم نص	کے متعلق اقراء ہونے کی تصریح فرمائی ہے یعنی
علی ان غیرہ اقرأ کانہ عنی حدیث	اُبیؓ کو تلاوت قرآن کا ماہر فرمایا ہے

"اقرأکم ابی" (فتح الباری ص۱۱ ج۲)

یہ بات بالکل درست ہے کہ امام کو مسائل نماز سے پوری واقفیت ہونی چاہئے تاکہ وہ نماز کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کر سکے، موجودہ اصطلاحی حفاظ و قراء جو صرف قرآن پاک زبانی یاد کئے ہوتے ہیں اور عموماً ضروری مسائل سے واقفیت بھی نہیں رکھتے ان کو علماء پر کسی طرح امامت میں فضیلت نہیں دی جاسکتی جیسا کہ عوام کبھی کبھی "یؤم القوم اقرأھم بکتاب اللہ" والی حدیث سے دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عہدِ صحابہ میں شعبۂ امامت کی اہمیت

جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اتنی بات تو خوب دل نشین ہو گئی ہو گی، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دورِ حیات میں اس شعبہ کو کیا حیثیت دی۔ اس کے بعد عہدِ صحابہؓ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ ان عاشقانِ رسول نے اس مسئلہ میں بھی آپ کی ہدایت و راہ نمائی پر پورا پورا عمل کیا، فاروق اعظمؓ خلافت کے فرائض کے ساتھ امامت کے منصب پر بھی زندگی بھر فائز رہے اور جو والی اور امام منتخب کیا وہ ہر اعتبار سے لائق، اور اپنا حال تو یہ ہوا، کہ آخر کار امامت کرتے

ہوئے ہی جامِ شہادت نوش فرمایا۔ آپ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا بھی اس باب میں یہی طرزِ عمل رہا، یہی نہیں بلکہ خلافتِ راشدہ کے دور میں جتنے بھی والی اور گورنر منتخب کر کے دوسرے مقامات میں بھیجے گئے سبھوں نے اس منصب کو بھی سنبھالا، گویا ان کے فرائض میں نماز کی امامت بھی داخل تھی جس سے وہ کنارہ کشی نہیں کر سکتے تھے، تاریخ بتاتی ہے اس دور کے بعد بھی امامت گورنروں کے فرائض میں داخل رہی، ایک انگریز مستشرق ٹامس آرنلڈ خلافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

"خلیفہ کے سیاسی فرمانروا ہونے کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی دو قسم کے اختیارات کا حامل ہے مذہبی حیثیت سے اس کی حکومت کا حقیقی مقصد صرف دین کا تحفظ تھا حامیِ دین کی حیثیت سے وہ جنگ کرتا تھا، مذہب کو صدمہ پہنچانے والے افراد کو سزائیں دیتا تھا، نماز میں امامتِ جمعہ کا خطبہ دینا بھی اس کا ایک منصبی فرض تھا۔"[۱]

غور کیجیے یہ وہ شعبہ ہے جس کے متعلق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

الامام ضامن والمؤذن موتمن	امام ضامن اور موذن امین ہے اے اللہ!
اللھم ارشد الائمۃ واغفر للمؤذنین	اماموں کی ہدایت فرما، اور موذنوں کی معافی

(احمد و ترمذی باب الامام) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جس شعبہ کا کفیل اور ضامن قرار دیا گیا ہے وہ آپ کی نظر میں بہت اہم ہے اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر آپ نے اس کے لئے رشد و ہدایت کی دعا فرمائی ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ باب امامت کی احادیث کے مدنظر فیصلہ فرماتے ہیں۔

ومن الحق الواجب علی المسلمین	مسلمانوں پر واجب ہے کہ امام ان کو بنائیں جو
ان یقدموا اخیارھم واہل الدین	ان سب سے بہتر اور دیندار ہوں اور افضل
والافضل منھم اھل العلم	ترین وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا علم و یقین رکھتے

---

[۱] مسلمانوں کا نظم مملکت ص۲۰۷

باللہ تعالیٰ الذین یخافون اللہ ہیں اور اس کی خشیت سے ان کا سینہ معمور رہتا

(کتاب الصلوٰۃ ومایلزمہا) ہے۔

جلیل القدر محدث اور ایک امام کے الفاظ بار بار پڑھئے، ان سے کتنی اہمیت ٹپکتی ہے، امام کی اہمیت اور اس کی حیثیت کا کتنے بلند پیرایہ میں تذکرہ فرماتے ہیں، اور قوم پر کس قدر اس کی ذمہ داری عاید کرتے ہیں، کوئی بات تو ہے جو اس شدت پر آمادہ ہی ہے،

پھر اس کے بعد فوراً فرماتے ہیں۔

جاء الحدیث اذا ام الرجل القوم وخلفہ من ھو افضل منہ لم یزالوا فی سفال (کتاب الصلوٰۃ ومایلزمہا)

حدیث میں ہے کہ جب قوم کی امامت ایک ادنیٰ شخص کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس سے افضل موجود ہوتا ہے تو ایسی قوم ہمیشہ پستی میں رہتی ہے

خود امام پر ذمہ داری | یہی نہیں کہ ایسی قوم جو اپنے افضل کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اپنا امام اور پیشوا بناتی ہے ہمیشہ پستی میں رہتی ہے بلکہ پھر ذلت وخواری بھی اس کے لئے لازمی ہے، خود امام پر یہ ذمہ داری ہے کہ قوم اُسے کسی شرعی امر نہ ہونے کی وجہ سے امامت کے لئے قبول نہیں کرتی، تو اسے امامت سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ ایسے شخص کی نماز کی قبولیت میں شبہ ہے

ثلثۃ لا تقبل منھم صلوتھم من تقدم قوما وھم لہ کارھون ... اتی الصلوٰۃ دبارا ... واعتبد محررہ (ابو داؤد)

تین شخص کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا ایک وہ امام جس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں، دوسرا جو اخیر میں نماز کے لئے آتا ہے کہ اس کی نماز چھوٹ جاتی ہے اور تیسرا وہ شخص جو آزاد کو غلام بناتا ہے

اس قسم کی حدیثوں پر با معان نظر غور کیجئے اور امام کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، آج کل ہمارے اس زمانہ میں جو سلوک اس منصب کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اس کو بھی سامنے رکھئے۔

موجودہ دور اور شعبہ امامت | ضرورت ہے اس دور میں بھی اسی سنت کو زندہ کیا جائے اور ہر مسجد کا امام

اس حیثیت کا مقرر کیا جائے، جو اس اصول پر پورا اُترے ساتھ ہی وہ تبلیغِ دین اور اشاعتِ علوم کے فرائض انجام دے سکے، اس میں ہر حیثیت سے اتنی صلاحیت ہو کہ قوم اس کو اپنا پیشوا بنا سکے اور وہ حدیث کے معیار پر بھی پورا اُترے۔

ایک عرصہ پہلے اس کا احساس حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تھا اور آپ نے اس سنت طریقے کو زندہ فرمانے کی سعی فرمائی تھی، چنانچہ آپ کا یہ دستور تھا کہ اپنے زمانہ میں امام معیاری مقرر فرماتے تھے اور ان کو اس حلقہ کا ذمہ دار بنا دیا تھا، جس حلقہ کی وہ امامت کرتا تھا، اور کئی مسجدوں کو ملا کر ایک مناسب مسجد کو جامع مسجد کی حیثیت دے کر اس کے امام کو ششن جج قرار دے دیا تھا۔ "تذکرۂ صادقہ" میں مذکور ہے۔

"لوگوں کے اصلاح حال اور حیثیت طاغوتی سے بچنے کے لئے ضرورت تھی، کہ جہاں لوگوں کو فساد و فتن سے روکا جائے، وہاں ان میں عدل و تصفیہ کی روح بھی پھونکی جائے، اور ان کے ناگزیر تنازع اور پیچیدہ مسائل کے محاکمہ اور فیصل کیلئے کوئی صورت قائم کر دی جائے، اور ساتھ ہی ساتھ "شاورھم فی الامر" کی سنت بھی ادا ہو سکے۔

چنانچہ جناب ہر ایک بستی میں جہاں مسجد موجود ہوتی، وہاں امام مقرر کرتے، اور جہاں مسجد نہ ہوتی، وہاں بھی تعمیر کرا دیتے، اور فصل خصومات کا بار اسی کے شانہ پر رکھتے چار پانچ کوس کے حلقے میں کسی مسجد کو جامع مسجد قرار دے کر ایک تعلیم یافتہ، متدین امام کے سپرد کر دیتے، اور امام بمنزلہ سشن جج متصور ہوتا اگر اس پر لوگوں کی تسکین خاطر نہ ہوتی تو متخاصمین کی اپیل پر بذات خود ان مقامات پر پہنچ کر فصل تنازع فرماتے اور ملفوظات کیمیا اثر سے تالیفِ قلوب فرماتے تھے[1]۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مسجدوں کے قدرتی نظام کو خوب سمجھا تھا اور اس نظام کی روح کو جو عرصہ سے مردہ ہو گئی تھی دوبارہ زندگی بخشنا چاہتے تھے، اسے کاش

[1] ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک ص۵۹ و ص۶۰

مسلمانوں کی سوتی ہوئی بستی جاگے اور اس قدرتی نظام کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو بروئے کار لانے کی عملی جد وجہد شروع کر دے۔

امام اور اس کے فرائض | ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ایسے فرد کو بنایا جائے جو عالم باعمل اور خدا ترس ہو اور اس کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو کیونکہ اس کے فرائض بڑے اہم اور نہایت نازک ہیں، ذرا سی غلطی سے پونجی کے کٹ جانے کا خطرہ ہے، یقینی طور پر وہ اس دینی عبادت میں تمام اہل مسجد کا امیر ہوتا ہے، اور سب کی طرف سے نمائندہ بن کر وہی رب العزت سے مناجات کرتا ہے، اس لئے اگر اپنی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں سعی پیہم کی اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اسے بجالایا، تو وہ عند اللہ اجر جزیل کا مستحق ہوگا، اور انجام کار کامیاب و بامراد، اور خدانخواستہ اس نے کوتاہی کو راہ دی، اخلاص کی روح کو زخمی کیا اور حق پیشوائی کی بجا آوری میں جد وجہد سے کام نہ لیا تو پھر اس کے لئے خسران و ناکامی کی ذلت ہے۔

صفوں کی نگرانی | پیش امام پر پہنچتے ہی اس کو دیکھنا ہوگا، صفیں درست اور مرتب ہیں یا نہیں، وہ شریعت کے قوانین پر پوری اُترتی ہیں یا نہیں، یوں تو مقتدی کا فریضہ ہے ہی کہ وہ شرعی ھیئت کے ساتھ کھڑا ہو مگر مزید امام اس کی نگرانی کرے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود صفوں کو درست اور برابر فرماتے، اور ادھر سے مطمئن ہو کر تکبیر تحریمہ کہتے چنانچہ نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسوی صفوفنا اذا قمنا الی الصلوٰۃ فاذا استوینا کبر (ابوداؤد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو برابر فرماتے تھے، جب ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اور ہم جب برابر ہو لیتے تو آپ تکبیر کہتے تھے۔

دائیں اور بائیں صفوں کو دیکھ کر فرماتے "سیدھے کھڑے ہو اور اپنی صفوں کو شرعی حیثیت کے مطابق درست کر لو" حضرت انسؓ کا بیان ہے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلعم دائیں متوجہ ہو کر فرماتے ٹھیک

یقول عن یمینہ اعتدلوا وسووا	ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفوں کو درست
صفوفکم وعن یسارہ اعتدلوا	کرلو اور بائیں متوجہ ہو کر فرماتے، درست ہو جاؤ
وسووا صفوفکم (ابوداؤد)	اور اپنی صفوں کو ٹھیک کرلو

اس قدر تو خود کرتے، مزید برآں حضرت بلالؓ جو مؤذن تھے ان کی ڈیوٹی مقرر فرما دی تھی کہ وہ صفوں کو درست کرائیں اور وہ بھی یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔

ان بلالا کان یسوی الصفوف	حضرت بلالؓ صفوں کو درست فرماتے اور درّہ
ویضرب عراقیبھم بالدرۃ حتی	مار کر ان کی ایڑیوں کو سیدھی کرتے تھے تاآنکہ وہ
یستووا (کتاب الصلوۃ و ما یلزمہا للامام احمدؒ)	برابر ہو جاتے۔

فاروق اعظمؓ کا اہتمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے زمانہ میں اس اہتمام کو باقی رکھا، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کا دستور تھا کہ نماز شروع کرنے سے پہلے صفوں کی دیکھ بھال کر لیتے، اور صفوں کی درستی کے بعد نماز شروع کرتے، بلکہ آپ نے بھی ایک مستقل آدمی اس کام کے لئے مقرر کر دیا تھا جو صف میں گھوم کر دیکھتا اور آکر درستی کی خبر دیتا، حضرت احمد بن حنبلؒ جیسے جلیل القدر محدث کا بیان ہے

جاء عن عمر انہ کان یقوم مقام الامام	حضرت عمرؓ کے متعلق آیا ہے کہ وہ پیش امام پر آکر
لا یکبر حتی یاتیہ رجل قد وکلہ	کھڑے ہو جاتے اور اس وقت تک تکبیر نہیں
باقامۃ الصفوف فیخبرہ انھم قد	کہتے تھے، جب تک ایک آدمی جو اس کام پر مقرر
استووا فکبر وجاء عن عمر	تھا آکر خبر نہ کرتا کہ صف درست اور لوگ برابر
بن عبدالعزیز فکذا	ہو گئے، جب یہ اطلاع مل جاتی تو تکبیر کہتے،
(کتاب الصلوۃ و ما یلزمہا)	عمر بن عبدالعزیزؒ کا بھی یہی دستور بیان کیا گیا ہے

حضرت فاروق اعظمؓ صفوں کی درستی کے باب میں بہت سخت تھے، صف میں جو بھی ناہمواری پیدا کرتا اس کی سزا فرماتے، اس باب میں کسی کی رو رعایت ملحوظ خاطر نہ تھی۔ حضرت میمون کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کو جس دن نماز میں نیزہ مارا گیا، میں موجود تھا مگر صف اول میں اس لئے نہیں

کھڑا ہوا تھا کہ آپ سے ڈرتا تھا، کیونکہ آپ کا دستور تھا کہ اگلی صف کو جب تک خود نہیں دیکھ لیتے تکبیر تحریمہ نہیں کہتے تھے، اور جب کسی کو صف میں بے قاعدہ آگے پیچھے کھڑا دیکھتے اس کو درہ لگاتے[1]

ان واقعات سے یہ بات محقق طور پر معلوم ہوئی، کہ امام مسجد پر صفوں کی درستی کی بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے فرائض میں ان کی دیکھ بھال بھی داخل ہے۔

مقتدیوں کا لحاظ | بہر حال جب صفیں خوب درست ہو جائیں تو اب امام نماز شروع کرے گا اور اپنی ذمہ داری کے ساتھ پڑھائے گا۔ جس میں مقتدیوں کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہوگا اس لئے کہ جماعت میں ہر طرح کے نمازی ہوتے ہیں کتنے ضعیف اور بوڑھے ہوتے ہیں اور کتنے بیمار اور کمزور ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے حال کا لحاظ رکھنا امام کے فریضہ میں داخل ہے اس میں شبہ نہیں کہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جو طریقہ سنت کے حدود میں ہو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

اذا صلی احدکم للناس فلیخفف	تم میں سے کوئی جب لوگوں کی امامت کرے تو
فان فیھم السقیم والضعیف	اسے چاہیے کہ ہلکی نماز پڑھائے، کیونکہ ان میں
والکبیر واذا صلی لنفسہ فلیطول	بیمار، کمزور، اور بوڑھے سبھی ہوتے ہیں البتہ جب
ما شاء متفق علیہ (مشکوۃ باب ما علی الامام)[2]	اکیلا پڑھے تو پھر جتنی لمبی نماز چاہے پڑھے۔

سرکار دو عالم کی تخفیف | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان کا لحاظ فرماتے تھے، کسی بچے کے رونے کی آواز جب پہنچتی تو نماز مختصر فرما دیتے تھے مگر یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب عورتوں کو مسجد آنے کی اجازت تھی، یوں بھی آپ ایسی ہی نماز پڑھاتے جس سے مقتدی اکتا نہ جائیں اور اس طرح ان کے خشوع و خضوع میں فرق نہ پڑنے پائے، حضرت انسؓ جن کو آپ کی خدمت کرنے کا شرف حاصل تھا فرماتے ہیں۔

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ صفحہ ۱۲ ج ۱ اس کتاب کے متعلق اپنے شکوک میں نے مخدوم و محترم علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کو لکھے تو جواب میں تحریر فرمایا "الامامۃ السیاسۃ" ابن قتیبہ کی تصنیف ہرگز نہیں یہ یا تو کسی شیعی کی تصنیف ہے یا اس میں کسی شیعی نے تحریف کر دی ہے، یہ ہرگز اعتماد کے قابل نہیں (مکتوب ۵۲)

[2] مشکوۃ عن البخاری والمسلم باب ما علی الامام

ماصلیت وراء امام قط اخف صلوۃ ولا اتم صلوۃ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم (مشکوۃ عن البخاری والمسلم باب ماعلی الامام)

میں نے نبی کریم صلعم کے پیچھے جتنی ہلکی اور کامل نماز پڑھی کسی اور کے پیچھے کبھی بھی نہیں پڑھی

امام کو ہدایت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں سے یہ شکایت پہنچتی، کہ کوئی امام قراۃ زیادہ لمبی کرتا ہے جس سے مقتدی اکتا جاتے ہیں اور جماعت سے نماز پڑھنے میں تامل کرتے ہیں، تو آپ بہت خفا ہوتے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں یہ شکایت پہنچائی کہ میں فلاں امام کی طول قراۃ کی وجہ سے صبح کی جماعت میں شرکت کرنے سے معذور رہتا ہوں، صحابۂ کرام رض کا بیان ہے کہ آپ یہ سن کر اس قدر خفا ہوئے کہ اس سے پہلے نصیحت کے باب میں ہم لوگوں نے اس طرح کی خفگی کا اظہار دیکھا ہی نہیں تھا، اسی موقع سے آپ نے فرمایا ۔

ان منکم منفرین فایکم ماصلی بالناس فلیتجوز فان فیہم الضعیف والکبیر اا الحاجۃ (متفق علیہ (مشکوۃ باب ماعلی الامام)

تم میں سے کچھ لوگ نفرت پیدا کرنے والے ہیں تم میں جو بھی امامت کرے وہ مختصر اور ہلکی نماز پڑھائے، کیونکہ ان میں کمزور، بوڑھے اور ضرورت مند بھی ہیں ۔

اسی طرح ایک واقعہ حضرت معاذ رض کے متعلق حدیث میں صراحۃً مذکور ہے کہ وہ نماز بہت لمبی پڑھاتے تھے، جو جائز ہی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے اس وقت کے ذوق کے بھی مناسب تھی مگر کسی ایک فرد پر یہ نماز گراں گذری، جو محنت اور مزدوری کے کام کرتے تھے، یہ خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا "افتان انت یامعاذ"[1] (کیوں جی معاذ تم فتنہ انگیزی کرتے ہو)،

حضرت عثمان ابن ابی العاص رض فرماتے ہیں کہ آخری عہد جو مجھ سے لیا گیا وہ یہ تھا کہ جب امامت کروں تو حدود سنت کے اندر رہ کر ہلکی نماز پڑھاؤں[2]۔

---

[1] مشکوۃ عن البخاری والمسلم باب ماعلی الامام [2] مشکوۃ ایضاً

تخفیف کا مطلب | جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرأۃ اور تسبیحاتِ مسنونہ چھوڑ دیئے جائیں، سنن و آداب نماز کی رعایت ترک کر دی جائے اور واجبات و فرائض میں کسی طرح کی کوتاہی برتی جائے، بلکہ ماحصل یہ تھا کہ دائگی نماز کا جو سنت طریقہ ہے اس کے اندر رہ کر سب کچھ کیا جائے، تاکہ نماز پڑھنے والا "تیسیر" کو "عسر" محسوس کرنے نہ پائے۔

اس مسئلہ کو خوب سمجھ لیجئے کہ تخفیف صلوٰۃ (ہلکی نماز) کا مطلب شرعاً کیا ہے، آج کل دین سے جو بے رغبتی ہے اور عبادات میں جیسی سستی پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کی وجہ سے عموماً لوگ دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور تخفیف کے جو معنی ہیں اسے صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔

یہ مسئلہ ایسا ہرگز نہیں ہے جو شریعت میں مصرح نہیں کہ جس کی مجبوری کی وجہ سے قیاس سے کام لینا پڑے یا کسی شخص یا شہر یا جماعت کی عادت پر محمول کیا جائے یا محض امام اور مقتدی کی رائے پر چھوڑ دیا جائے۔ کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پوری ہیئت کے ساتھ مذکور ہے، اور ایک ایک بات کی تفصیل موجود ہے، ابھی حضرت انسؓ کی حدیث گذر چکی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ آپ کے پیچھے جو نمازیں نے پڑھی وہ ایک طرف اگر ہلکی تھی تو دوسری طرف کامل و تام بھی تھی جس سے واضح ہے کہ تخفیف کے ساتھ اتمام و کمال نماز بھی مطلوب ہے اور کھلی بات ہے کہ کمال میں تعدیل ارکان سنن و آداب کی رعایت اور نماز کے دوسرے حقوق بھی داخل ہیں پنجوقتہ نماز کی قراۃ حدیثوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

قرات میں آنحضرت صلعم کا معمول | صبح کی نماز میں مقدار قراۃ کیا تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کیا تھا اس سلسلہ میں چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں، حضرت جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر بق والقرآن المجید ونحوھا وکانت صلوٰتہ بعد تخفیفا	رسول اللہ صلعم فجر کی نماز میں سورۃ ق والقرآن المجید اور اسی طرح کی سورتیں پڑھتے تھے، اب تک آپ کی نماز ہلکی تھی۔

(مسلم باب القراۃ فی الصبح ص۱۸۷ ج۱)

حضرت عمرو بن حریث کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز میں "واللیل اذا عسعس" پڑھتے ہوئے سنا گیا۔

حضرت عبداللہ بن السائب کا بیان ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں ہم لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی جس میں سورۃ "مومنون" کی تلاوت شروع کی، جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام یا عیسیٰ علیہما السلام کے تذکرہ تک پہنچے، تو آپ کو کھانسی شروع ہوگئی چنانچہ وہیں رکوع میں جھک گئے۔

حضرت ابوہریرۃ فرماتے ہیں

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر یوم الجمعۃ بالم تنزیل فی الرکعۃ الاولیٰ وفی الثانیۃ ھل اتی علی الانسان متفق علیہ	جمعہ کے دن فجر میں نبی صلعم "الم تنزیل" پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں "ھل اتی علی الانسان"

(مشکوٰۃ باب القراۃ فی الصبح)

یہ سب صحیحین کی حدیثیں ہیں جن سے فجر کی مقدار قراۃ خوب اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے اور یہ جو کچھ عرض کیا گیا وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے۔

ظہر وعصر کی قرات | ظہر اور عصر کی نمازوں میں آپ کے قرآت کی جو مقدار تھی وہ بھی حدیث میں مذکور ہے حضرت ابو سعید خدری ایک اندازہ بیان کرتے ہیں، جو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قایم کیا تھا۔

کنا نحزر قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظھر والعصر فحزرنا قیامہ فی الرکعتین الاولیین من الظھر قدر الم تنزیل السجدۃ	ظہر وعصر کی نماز میں رسول اللہ صلعم کے قیام کا اندازہ ہم لوگ لگاتے تھے، ہمارا اندازہ ہے کہ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں آپ "الم تنزیل سجدہ" کی قرات کے مقدار قیام فرماتے تھے اور ایک روایت میں

۱؎ مسلم باب القراۃ فی الصبح ص۱۸۶ ج ۱ ؎ مسلم ایضاً

وفی الاخریین قدر نصف ذالک) ہے کہ ہر رکعت میں تیس آیت کی مقدار

وفی رأیۃ فی کل رکعۃ قدر ثلثین آیۃ (مسلم باب القراۃ فی الظہر والعصر ج ۱)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم ظہر میں "واللیل اذا یغشیٰ" پڑھتے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ "سبح اسم ربک الاعلےٰ" تلاوت فرماتے اور عصر میں اسی کے لگ بھگ اور فجر میں اس سے بہت زیادہ لمبی سورہ پڑھتے تھے[1]

مغرب | نماز مغرب میں سورۃ طور تک پڑھنا ثابت ہے، سورۃ مرسلات بھی آپ نے پڑھی ہے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالطور — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب میں سورۃ طور پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

متفق علیہ (مشکوۃ باب القراۃ فی الصلوۃ)

حضرت ام الفضل بنت الحارث رضی اللہ عنہا کہتی ہیں

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالمرسلات — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپ مغرب میں سورۃ مرسلات پڑھتے تھے

عرفا متفق علیہ (مشکوۃ باب القراۃ فی الصلوۃ)

عشاء میں حضرت کا معمول | عشاء کے متعلق حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ گذر چکا ہے، کہ ایک دفعہ ان کی لمبی قراۃ کی شکایت دربار رسالت میں پہنچی تھی تو آپ بہت خفا ہوئے تھے اور فرمایا تھا کہ "افتان انت" کیا تم فتنہ انگیز ہو، اسی حدیث میں آپ کا یہ ارشاد بھی مذکور ہے۔

اقرأ والشمس وضحٰھا، والضحیٰ واللیل اذا یغشیٰ وسبح اسم ربک الاعلیٰ — تم عشاء میں، والشمس وضحٰھا، والضحیٰ، واللیل اذا یغشیٰ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا کرو۔

(مشکوۃ عن البخاری والمسلم باب القراۃ)

---

[1] مسلم باب القراۃ فی الصبح صفحہ ۱ ج ۱

(باقی آئندہ)

جن

از

(مولانا حکیم محمد ابو نصر صاحب مدرسہ عزیزیہ بہار شریف)

مرزا قادیانی نے اپنی تفسیر کبیر میں جن پر ایک طویل بحث کی ہے اور اس بات کے ثبوت کی پوری کوشش صرف کی ہے کہ جن انسانوں ہی کی جماعت کا نام ہے۔ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے اور اس وجہ سے قرآن کریم کے جن مقامات میں جن کا تذکرہ آیا ہے، اس کی تاویل میں نہایت مضطربانہ تفسیر سے کام لیا ہے، کبھی ارواح خبیثہ، کبھی غیر ملکی اجنبی اقوام، کبھی نظام فطرت کے باغی وسرکش افراد، کبھی محض وہمی وخیالی وجود، اس کے بعد اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن اور احادیث سے سات دلیلیں پیش کی ہیں، ہو سکتا ہے اس طرح کی بحثیں لغت عرب اور قرآنی تعلیمات سے ناواقف حضرات کو اپنے دام فریب میں لے آئیں لیکن ارباب بصیرت کے لئے ان کی یہ دماغی اُپج مضحکہ انگیز ہے۔ دہری معتزلی - خوارج - اصحاب باطن ان ناموں سے مسلسل ایک جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے، جنہوں نے اپنے تبحر علمی کو قرآن کریم کی تحریف میں پوری طاقت صرف کی لیکن ان کی تحریف نہیں چلی۔ اسی طرح آج قادیانی نبی بھی قرآن مجید کی تحریف وتاویل میں کوشاں ہے، اس جماعت کے اعتقادیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے مذہب یورپ کے اُگلے ہوئے لقموں کو حلق سے اتارنا ہی فخر ہے یعنی یورپ کی تخیلات سے ان کا دماغ مسحور ہے، ملاحظہ کیجئے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ قتل کئے گئے ہیں جماعت احمدیہ بھی قتل عیسیٰ پر سر دُھن رہی ہے مسٹر ڈارون نے انسانی تخلیق کا فلسفہ ارتقا پیش کیا، مرزا صاحب بھی کلام مجید کو مسخر

ڈارون کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر پیش کر رہے ہیں، یورپ کی دماغی ترقی نے جنّ کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، بس کیا تھا قادیانی حضرات نے بھی اپنی اندھی تقلید کا سارا بوجھ کلام مجید پر لا کر رکھ دیا، کہ جنّ انسان کے علاوہ کوئی دوسری صنف نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ جماعت یورپ کی دلال ہے جو قرآنی تعلیمات کو ان کی تھیوریوں کی حمایت میں پیش کرتی رہتی ہے، غور کیجئے یہ لوگ قرآنی تعلیمات کی اصلاح کے لئے اُٹھے ہیں۔ لیکن عرب جو اسلام و قرآن کا مرکز ہے اور جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہاں تو ان کے کسی تبلیغی مشن کا وجود نہیں لیکن انگلینڈ اور فرانس ان کی تبلیغ کے مرکز ہیں حالانکہ ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمان قرآن کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لہٰذا ان ہی ملکوں میں ان کی اصلاح کا زور شور ہونا چاہئے تھا مگر معاملہ برعکس ہے، تمام اسلامی ملکوں میں تو کوئی وجود نہیں لیکن یورپ میں دیکھئے تو تبلیغی جد و جہد کے ہنگامے گرم ہیں بات وہی ہے کہ جن کی حمایت میں ہیں اُن ہی کے آغوش میں پناہ مل سکتی ہے اور ان ہی سے خراج تحسین وصول کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ نہ تو اپنے خیالات کے اشاعت میں سہولت ہو سکتی ہے اور نہ صدائے آفریں سے حوصلہ افزائی ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کامیابی وہاں ہو سکتی ہے جہاں قرآن کی زبان، اور قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت ہو جہاں قرآنی بصیرت رکھنے والے موجود ہیں وہاں ان کا جادو چل نہیں سکتا۔ مندرجہ ذیل سطور میں تفسیر کے اس ٹکڑے کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

مرزا صاحب نے جنّ کے چار معنی بیان کئے ہیں ——

(۱) جنّ ارواح خبیثہ کا نام ہے	اس دعوے کے ثبوت میں سورہ الناس کی آیت اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ پیش کی ہے، اس سے کس طرح

یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے اس کی وضاحت نہیں کی، شاید اس وجہ سے کہ جنّ کو وسوسہ پیدا کرنے والی قوم کہا گیا ہے وجہ استدلال اگر یہی ہے تو پھر آپ کے قلم کو کون روک سکتا ہے

اگر یہ بھی دعویٰ کرلیں کہ انسان کوئی جسمانی جنس نہیں ہے بلکہ ارواحِ خبیثہ کا نام ہے، کیونکہ وسوسہ کی جس طرح جنّ کی طرف نسبت کی گئی ہے اُسی طرح وہ ناس کے طرف بھی منسوب ہے۔

(۲) جنّ وہمی اور خیالی وجود کو کہتے ہیں — اس کے ثبوت میں سورۂ سبا کی آیت پیش کرتے ہیں وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَکْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (ع ۵)

اس آیت سے اپنے دعوے کو اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ خداوند قدوس قیامت کے دن ملائکہ سے دریافت کریگا یہ لوگ کیا تمہاری پوجا کرتے تھے، فرشتے کہیں گے کہ نہیں بلکہ جنّوں کی پرستش کرتے تھے، اگر جنّ کا حقیقی وجود ہے تو ملائکہ کا یہ جواب کیوں کر صحیح ہوگا کیونکہ جنّوں کی پرستش سے فرشتوں کی پرستش کی نفی نہیں ہوتی ہے پس فرشتوں کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے حقیقی اوصاف سے واقف نہیں، بلکہ اپنے اسلاف سے ملائکہ کا ذکر سُن کر اپنے ذہن میں خیالی وجود قایم کرلیا ہے، اور اُن ہی کو سمجھا کہ ملائکہ ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں، حالانکہ وہ وجود محض ذہنی تھا، اس لئے ملائکہ نے یہ جواب دیا کہ یہ لوگ جنّ کی پرستش کرتے تھے یعنی خیالی وجود کی پرستش کرتے تھے ملائکہ نام رکھ چھوڑا تھا، اور یہ میری عبادت نہیں کرتے تھے، کیونکہ جس قسم کے اوصاف کا ملائکہ کے متعلق عقیدہ رکھتے تھے وہ ہم میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے یہ ہماری عبادت نہیں ہوئی بلکہ جنّ یعنی خیالی و وہمی وجود کی عبادت تھی اس سے معلوم ہوا کہ جنّ خیالی وجود کو کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کی اس تقریر پر حسب ذیل تنقید ہے

(الف) یہ غور کرنا چاہیے کہ ان مقامات میں باری عزّ اسمہ کے سوال کا منشا و مقصد کیا ہے، ملائکہ سے بازپرس کیوں ہوئی؟ یہ لوگ کسی دوسرے کی پوجا کریں خواہ ملائکہ ہی کی کریں، اس میں ملائکہ کا کیا قصور ہے؟ یہ تو پوجنے والوں کا جرم ہے، لہٰذا ان سے

باز پرس کرنے کا کوئی محل نہیں، پھر ملائکہ کا باری تعالیٰ کی تعریف و تقدیس اور اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ سے اپنی وفاداری ظاہر کرتے ہوئے الحاح و زاری کے ساتھ اپنی عبادت سے انکار کرنے کا موقع ہی کیا ہے؟ اللہ جل شانہٗ کے سوال سے ان پر کسی قسم کا جرم عائد ہی نہیں ہوتا ہے اور جواب بھی اتنی تاویل کے ساتھ کہ یہ لوگ ملائکہ کے نام کی پوجا ضرور کیا کرتے تھے لیکن ان کی جو صفت بیان کرتے تھے وہ ہم میں نہیں پائی جاتی پس ہماری عبادت نہ ہوئی آخر اس تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے، ان کو تو برملا کہنا چاہئے تھے کہ یہ خواہ کسی کی عبادت کریں اس میں ہمارا کیا قصور ہے، خود پوجنے والوں سے دریافت کیجئے کہ یہ کن کی پوجا کرتے تھے اس لئے ان کی یہ تفسیر غیر مربوط اور بے محل معلوم ہوتی ہے آئیے اس باز پرس کا مقصد سمجھنے کی کوشش کریں، مرزا صاحب کے خیالی جن یا مشرکوں کے خیالی ملائکہ؟ قرآن کریم میں دوسری جگہ عام ان صلحاء کے متعلق ہے جن کو مشرکوں نے معبود بنالیا تھا وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ قَالُوْا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ (سورہ فرقان) حشر کے دن اللہ تعالیٰ مشرکین کے معبودوں سے دریافت فرمائیگا کیا تم نے ان کو اپنی عبادت کا حکم دیکر گمراہ کیا یا یہ خود گمراہ ہوئے الخ۔ اس مقام اور سورۂ سبا کے جواب کی طرز عبارت بتارہی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سوال اور ایک ہی واقعہ کی حکایت ہیں، صرف عنوان مختلف ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (باری تعالیٰ سوال کریگا کہ اے عیسیٰ کیا تم نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود بنالو) ان دونوں آیتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد باز پرس اور سوال کا مقصد واضح ہوجاتا ہے، باز پرس کا مقصد یہ ہے کہ تم حکم دہندہ تو نہیں ہوا اور اس عبادت سے تم خوش تو نہ تھے

اور یہ یقیناً باز پرس کرنے کی بات ہے آیئے اور سوال و جواب کی مطابقت ملاحظہ کیجئے،
فرشتوں سے باری تعالیٰ سوال کرتا ہے، یہ لوگ تمہارے حکم سے تمہاری پوجا کرتے تھے
کیا تم نے ان کو اپنی پرستش کا حکم دیا تھا، فرشتے باری تعالیٰ کی تعریف و تقدیس بیان کرنے
کے بعد کہتے ہیں ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں ہم تو صرف آپ کو اپنا ناصر و دلی سمجھتے ہیں
اس لئے آپ کے خلاف اغواء کی جرأت کیوں کر ہو سکتی ہے بلکہ اجنہ کے اغواء اور حکم
سے یہ ہماری عبادت کرتے تھے اور چونکہ یہ اُن کے حکم کی اتباع و فرماں برداری ہے
اس لئے فی الحقیقت اُن کی عبادت ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ جن کوئی وہمی چیز نہیں
ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جن کی مشرک اتباع و فرماں برداری کرتے ہیں۔

ایک شبہ اور اسکا جواب | شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی ہے کہ ملائکہ نے حکم نہیں دیا تو پھر
یہ سوال کیوں کیا؟ —— اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تمام امور سے واقف ہے پھر
حساب و کتاب کیسا؟ اصل بات یہ ہے کہ حشر کا تمام حساب و کتاب اور سوال و جواب
منظر عام اور منصۂ شہود پر لانے کے لئے ہے اور تمام لوگوں کو جتلانا مقصود ہے اسی طرح
یہ سوال و جواب بھی منظر عام میں ظاہر کرنے کے لئے ہے، اور مشرکین پر زجر و توبیخ ہے
کہ تم جن کی خوشنودی کے لئے عبادت کرتے تھے وہ بھی تمہاری عبادت سے خوش نہیں
تم نے جس کے لئے یہ ستم اُٹھائے وہ بھی تمہاری اس حرکت سے بیزار ہے۔

(ب) یہ منشاء سوال کے لحاظ سے ان کی تفسیر بالرائے کا بطلان تھا اب ذرا آیت
کے الفاظ پر غور کیجئے، فرشتوں کے جواب میں بل کا لفظ ہے۔ اور عربی میں بل اضراب
کے لئے آتا ہے یعنی ماسبق کی تردید اور مابعد کا اثبات، لہذا قابل غور یہ ہے کہ خداوند قدوس
نے جو سوال کیا کہ "کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے" اس سوال میں معبود ملائکہ سے
مراد ملائکہ حقیقی ہیں یا ملائکہ خیالی؟ اگر ملائکہ خیالی مراد ہیں تو پھر اُن کی تفسیر صحیح نہیں کیونکہ
جواب میں لفظ بل ہے جو ماقبل کی تردید کرتا ہے اور جب انھوں نے يَعْبُدُونَ الْجِنَّ

میں جن سے خیالی ملائکہ مراد لیا ہے، تو پھر ماقبل کی تردید کیوں کر ہوئی، بلکہ سوال کی عین تائید ہوئی، خلاصہ یہ ہوا کہ باری عز اسمہٗ سوال فرماتے ہیں کیا یہ لوگ خیالی ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں، فرشتوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ خیالی ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں، یہ کیسا تضاد ہے کہ خیالی ملائکہ کی پوجا سے انکار بھی ہے اور پھر اقرار بھی ہے — اور اگر حقیقی ملائکہ مراد ہیں تو باری عز اسمہٗ کا سوال غلط ہے، کیونکہ ان لوگوں نے تو دیمی ملائکہ کی پرستش کی ہے مرزا صاحب نے سوال و جواب کی مطابقت کے لئے بڑی کوشش سے خود ساختہ تفسیر پیش کی، لیکن وہی عدم مطابقت اپنی صورت بدل کر جن کی طرح ان کے سر پر سوار ہی ہے

(ج) بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ کے متصل ہی أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ہے، یہ جملہ بھی ان کے خیالی قلعہ کو منہدم کر رہا ہے کیونکہ بِهِم میں هم کا مرجع جن ہے اور جن کے معنی خیالی ملائکہ بیان کیے ہیں، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ خیالی ملائکہ کی پوجا کرتے تھے اور خیالی ملائکہ پر ایمان رکھتے تھے، جب اُن کی پوجا کرتے تھے تو یقیناً اُن پر ایمان رکھتے ہونگے لہذا كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ کے بعد أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ یعنی اُن کی پوجا کے بعد ان پر ایمان رکھنے کا تذکرہ بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے، اور کلام مجید کا کوئی ٹکڑہ مہمل! اَلْعِيَاذُ بِاللهِ میں نے جو تفسیر بیان کی ہے اس میں کوئی حصہ مہمل اور بے معنی نہیں رہتا، ملاحظہ کیجئے، فرشتے کہتے ہیں یہ لوگ جن کے اغواء اور حکم سے ہماری عبادت کرتے تھے اس لئے یہ عبادت و اطاعت جن ہی کی ہوئی، لیکن یہ جن کی عبادت بواسطت فرشتہ ہوئی اب اور بھی ترقی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں سے تو اکثر بلا واسطہ جن ہی پر ایمان رکھتے تھے

(۳) شمالی اقوام کو جن کہتے ہیں | عرب شمالی علاقہ کی اقوام کو جن کہتے تھے جن کے معنی پوشیدہ کے ہیں اور یہ لوگ گرمی کی وجہ سے عرب نہ آتے تھے اور عربی اقوام سردی کے باعث اُدھر نہ جاتی تھیں اس لئے ان کو جن کہتی تھیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں لفظ جن بہت سے مقام میں مذکور ہے اور یہ مصطلحات شرعیہ سے نہیں ہے بلکہ لغوی لفظ ہے اور

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ہم نے اس کو واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ، چنانچہ اگر قرآن نے کسی مقام میں لغت عرب کے خلاف استعمال کیا ہے تو اس جگہ معنیٰ مقصود کو واضح کر دیا ہے، ملاحظہ کیجئے، یوم عربی میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا نام ہے لیکن قرآن کریم نے اسے دوسرے معانی میں بھی استعمال کیا ہے تو وہاں اپنا معنیٰ مقصود بھی ظاہر کر دیا ہے إِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (سورہ حج) تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (سورہ معارج) پس اگر جنّ کے معنی لغت عرب کے خلاف کوئی دوسرے معنی مراد ہوتے تو ضرور اس کے ساتھ اس کی تفسیر بھی ہوتی لہذا قرآن کریم میں جنّ کے وہی معنی مراد ہیں، جو عرب میں مستعمل ہیں اس کے ثبوت میں عقلی دلیلوں سے زیادہ نقل پیش کرنا چاہئے، کلام عرب کو دلیل میں پیش کرنا چاہئے قرآن کریم کی بعض آیتوں سے جو استنباط کیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم کا مستعمل لفظ جنّ متنازع فیہ ہے اور متنازع فیہ کو دلیل میں پیش کرنا حماقت ہے، عرب میں لفظ جنّ انسان سے ایک الگ مخلوق کے لئے جاری ساری ہے احادیث سے بھی ثابت ہے کہ جنّ ایک الگ مخلوق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہڈی، گوبر سے استنجا کی ممانعت فرمائی، صحابی نے وجہ دریافت کی فقلت ما بال العظم والروثة فقال هما من طعام الجن (بخاری شریف) یعنی ہڈی گوبر کی کیا حقیقت ہے آپ نے فرمایا یہ دونوں جنّ کی غذا ہیں، آپ ہی بتائیں، کس ملک کے رہنے والے انسان کی غذا ہڈی، گوبر ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شمالی علاقہ کے لوگوں کی غذا ہے تو پھر ان کی غذا ہونے کے باعث عرب کو استنجا سے کیوں منع کیا گیا وہ لوگ وہاں سے عرب کی غذا کھانے تو نہیں آتے تھے۔

(۴) باغی و سرکش کو جن کہتے ہیں | جنّ کے متعلق مرزا صاحب کے عجیب مضطربانہ خیالات ہیں، کبھی جغرافیائی حدود کے اعتبار سے جن و انس کو انسان ہی کی دو قومیں قرار دیتے ہیں،

اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اب جن و انس دو صفات کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں نظام کے باغیوں کو جن اور نظام کے تابع کو انسان کہتے ہیں مرزا صاحب نے اپنے دعوے کے لئے محاورہ یا کلام عرب پیش نہیں کیا ہے۔ لغت میں کلام و محاورہ کو چھوڑ کر محض اپنے توہمات اور ذہنی تخیلات کو پیش کرنا بھی ایک قسم کا جناتی وسوسہ ہے جسے فطرت سلیمہ کبھی قبول نہیں کر سکتی تعجب کی بات ہے کہ کفار کو قرآن کریم نے گمراہ، اندھا، گونگا، بہرہ، بہرا یہ کہا ہے لیکن کفار قریش کو باغی نظام ہونے کے باوجود کسی جگہ بھی جن نہیں کہا آپ کے دعوے کے مطابق انسان تابع نظام کو کہتے ہیں، مگر یہ علاوہ قرآن کریم یا ایھا الناس یا ایھا الناس کہہ کر کفار کو مخاطب کر رہا ہے حالانکہ یہ باغی ہیں جن کی بغاوت پر مہر لگ چکی ہے، آپ کا یہ دعویٰ اتنا مہمل ہے جس کی تردید و تکذیب کے لئے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے

لیلۃ الجن میں ملاقات کرنے والے اجنہ کے متعلق مرزا صاحب کی تاویل

جنوں کی جو جماعت رسول اللہ صلعم پر ایمان لائی تھی اس کے متعلق کہتے ہیں وہ جن اس لئے کہا ہے کہ وہ باہر کے لوگ تھے "باہر کا لفظ بہت وسیع ہے گھر سے باہر، بستی سے باہر، صوبہ سے باہر، ملک سے باہر اس کو تو آپ نے بیان نہیں کیا کہ کہاں سے باہر رہنے والے کو جن کہا جاتا ہے لیکن اس سے پہلے جو آپ نے جن کے مختلف معانی بیان کئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک سے باہر یعنی غیر ملکی جن کی عرب کی طرف اور عرب کی ان کی طرف آمد و رفت نہ ہوتی تھی اور ان سے پوشیدہ تھے اس لئے ان کو جن کہا کرتے تھے آپ کو اعتراف ہے کہ یہ اجنہ جزیرہ نصیبین کے باشندے تھے نصیبین ملک عرب سے باہر نہیں ہے، بلکہ یہ ملحقات عرب میں ہے، عراق عرب کے متصل جانب غرب میں ایک حصہ ہے جس کو دریائے دجلہ اور دریائے فرات گھیرے ہوئے ہیں اس کا نام جزیرہ ہے دیار بکر اور مصر اسی جزیرہ میں ہے، اسی کا ایک مشہور شہر نصیبین ہے اور یہ جزیرہ زمانہ نبوی صلعم میں قیصر کے ماتحت تھا اور غسان قوم کے ایک عرب، قیصر کے جانب سے فرمانروا مقرر تھا، آپ وہاں کے

کے لحاظ سے یہ جزیرہ صحت بخش ہے اس میں بڑے بڑے قلعے اور شہر ہیں، اسی وجہ سے قدیم زمانہ میں یہ ملک بڑی شہرت اور فوقیت رکھتا تھا، بابل اور نینوی کے بادشاہ اسی سرزمین کے تھے جو اپنے وقت کے شاہنشاہ تھے یہ جزیرہ عرب میں مشہور و معروف تھا کیونکہ عرب کا عالم ہی تھا اور کوئی غیر معروف جگہ نہ تھی کہ جہاں عرب کی آمد و رفت نہ ہوتی ہو بلکہ یہ عرب میں شامل ہی ہے نصیبین کے جن کو غیر ملکی ہونے کے اعتبار سے جن کہا گیا یہ صحیح نہیں، اور صفاتی اعتبار سے جن کے معنی باغی اور سرکش کے بیان کئے ہیں، یہ بھی درست نہیں کیونکہ یہ کلام مجید سن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم کو بھی ایمان لانے پر برانگیختہ کیا لہذا ان کو کس زبان سے باغی کہا جا سکتا ہے۔

جن انسان سے کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے اس کے ثبوت میں سات دلیلیں مرزا صاحب نے پیش کی ہیں، آیئے اس پر بھی ایک نگاہ ڈالیں۔

پہلی دلیل | لیلۃ الجن میں ملاقات کرنے والے اجنہ کے متعلق لکھتے ہیں اول یہ کہ وہ پوشیدہ ملے اگر وہ جن تھے تو ان کو پوشیدہ اور رات کو ملنے کی کیا ضرورت تھی، علی الاعلان ملتے کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا، استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس گروہ کو "نفر من الجن" کہا گیا ہے درحقیقت وہ انسان ہی تھے اور کفار عرب کے ایذاء رسانی کے خوف سے خفیہ طریقہ پر رات کو ملے تھے انسان نہیں تھے تو پھر کفار عرب سے ڈرنے کی کیا وجہ تھی؟

اگر اس واقعہ کی تفصیل پر نظر ہوتی تو ہرگز اس قسم کے مہملات سے دلیلوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش نہ کی جاتی، لیلۃ الجن کا ایک دوسرا واقعہ ہے جس میں حضرت ابن مسعودؓ موجود تھے اس میں یہ ہے کہ آپ قوم جن سے ملنے کے لئے شعب حجون (عرب کی ایک گھاٹی کا نام ہے) تشریف لے گئے اگر یہ انسان ہی تھے تو ان لوگوں کو مسلمانوں سے کیا خوف تھا جو گھاٹی میں ٹھہرے۔ رات کا تو وقت تھا مسلمانوں ہی کی جماعت میں آکر ٹھہرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شعب حجون تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، اور یہ

بارہ ہزار کی تعداد سے آئے تھے ایسی حالت میں ان کو کفار عرب سے ڈرنے کیا وجہ ہو سکتی تھی جنگ بدر میں بہادر جنگجو کفار مکہ جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم ہی تھی اس کے مقابلہ میں بارہ ہزار کے جم غفیر کو خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی؟ نیز اسی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے خط کھینچکر گھیرا بنا دیا اور حضرت ابن مسعودؓ کو اسی کے اندر رہنے کی ہدایت فرمائی پھر آپ آگے تشریف لیجاکر گفت و شنید اور تلاوت شروع فرمائی اگر یہ انسانوں ہی کی جماعت تھی تو پھر حضرت ابن مسعودؓ کو گھیرے میں ان لوگوں سے علیحدہ ٹھہرانے کی کیا وجہ تھی؟ آپ ان کو اپنے ہمراہ لاتے تھے قریب پہنچ کر علیحدہ کیوں ٹھہرا دیا۔ پھر غور کیجیے اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اس خط سے باہر نکل جاتے تو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ تم کو اُچک لیتے خط سے باہر نکلنے میں اُن کا اچک لینا کیا معنی رکھتا ہے؟

دوسری دلیل | دوسری دلیل کا خلاصہ ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ یعنی ہم نے یہ رسول اس لئے بھیجا ہے کہ تم مسلمان انکی مدد اور نصرت کرو اور ان کی عزت دنیا میں قایم کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر جنات ایمان لانے تھے تو وہ کس رنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے تھے، کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے سروں پر چڑھ جاتے ہیں اور قسم قسم کے پھل لاکر دیتے ہیں، یہ کیسے مومن تھے کہ محمد رسول اللہ صلعم پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن کافر جنوں نے حضرت سلیمانؑ کے لئے قلعے تیار کیے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام ان کی خاطر کیا، یہ مومن ایسے طوطا چشم تھے کہ ابوجہل وغیرہ کسی کو انھوں نے سزا نہ دی اور پھر یہ جن لوگوں کو تو بے موسم پھل لاکر دے دیتے ہیں، مگر محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لاکر انھیں یہ توفیق بھی نہ ملی کہ جب غزوۂ خندق کے موقعہ پر آپ پر اور دوسرے مسلمانوں پر فاقے پر فاقے گذر رہے تھے اور آپ اور آپ کے صحابہ پیٹ پر پتھر باندھے پھر رہے تھے۔ یہ جنات آپ کے لئے اور آپ کے صحابہ کے لئے جو کی روٹیاں ہی لا دیتے الخ

لیکن یہ اعتراض جس طرح جنوں پر ہو سکتا ہے بعینہٖ اسی طرح باری تعالیٰ پر بھی ہو سکتا ہے اگر خداوند تعالیٰ کا وجود ہے اور وہ تمام دنیا کا مالک اور رزّاق ہے تو کیوں اس نے اپنے رسول برحق کے لئے جَو کی ایک روٹی بھی نہیں بھیجی خصوصًا ایسے وقت میں جب کہ اللہ کا رسول اللہ کے دشمنوں کے ظلم و تعدی کی مدافعت کے لئے میدانِ کارزار میں صف آرا تھے اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ سرے سے خدائے تعالےٰ کے وجود ہی کے منکر ہو جا ئیے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے، اور انبیاء قوانین خلافت ارضی کے معلّم اور نمونہ ہیں اس لیے ان کی عظمت و جلال اور فضل و کمال کے باوجود ان کو آلام و مصائب اور فاقہ و غربت سے محفوظ نہ رکھا گیا، اور یہ نہ ہوا کہ حجرہ میں بیٹھ کر ہاتھ اٹھا لیا اور دشمنوں کی جماعت بھسم ہو گئی بلکہ عام انسانوں کی طرح انھیں جنگ کرنی پڑی تاکہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا مقابلہ اور جفاکشی اور دشمنوں سے مدافعت کا طور وطریقہ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہو، جن کو جانے دیجئے خود صحابۂ کرام بہتیرے اور ہیں مصائب کو اپنے اوپر برداشت کرکے رسول اللہ صلعم کو بہت زیادہ آرام وعافیت پہونچا سکتے تھے، اور صحابۂ کرام ایسا چاہتے تھے، لیکن رسول اللہ صلعم قبول نہ فرماتے تھے اگر آپ صحابۂ کرام کے ساتھ سفر میں ہیں اور لکڑی چننے، کھانا پکانے وغیرہ کی نوبت آتی ہے تو خود بھی برابر حصّہ لے کر ہر کام کو انجام دے رہے ہیں، خندق کھودنے کا موقعہ ہے تو آپ بھی کدال لے کر محنت و مشقت کی بازی لگائے ہوتے ہیں آپ نے اس کو کبھی پسند نہ فرمایا کہ صرف صحابہ تمام کاموں کو انجام دیں اور آپ مسند پر آرام فرما رہیں، کیونکہ اپنی زندگی کا نمونۂ عمل پیش کرنا تھا، نیز مشرکین عرب کے مقابلہ میں جنوں سے مدد نہ لی، تاکہ یہ بات روشن ہو جائے کہ بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود میری کامیابی کا راز صدق وحقانیت ہے اور کفار کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ دوسری جماعت کے سہارے سے مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔

ان مومن جنوں کو اپنی جماعت میں تبلیغ کا فرض سپرد کیا گیا، اور یہ اسی فرض میں مشغول تھے اور یہ بھی رسول اللہ صلعم کی مدد ہی ہے اس طرح پر جنوں کی یہ جماعت بھی رسول اللہ صلعم کی مدد کر رہی تھی ۔

تیسری اور چوتھی دلیل | تیسری اور چوتھی دلیل کا حاصل یہ ہے اللہ تعالےٰ رسولوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور مِنْهُمْ ہوتے ہیں یعنی جن کی طرف آتے ہیں انہی کی قوم کے ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَى هٰؤُلَاءِ یعنی قیامت کے دن ہر اُمت کا رسول جو انہی میں سے ہوگا بطور گواہ لایا جائے گا اور محمدؐ رسول اللہ کو اُمت محمدیہ اور اس زمانہ کے لوگوں پر بطور گواہ بھیجا جائیگا اگر جنّ بھی کوئی ایسی قوم ہے جو ایمان لاتی ہے تو اس پر گواہی کون دے گا ۔

چوتھا ثبوت اس دعویٰ کی تائید میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ اٰيَاتِي وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعت ! کیا تمہارے پاس تمہاری قوموں میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میرے نشانات پڑھ کر سناتے تھے اور آج کا دن دیکھنے سے تم کو ہشیار کرتے تھے اس آیت میں تصریح ہے کہ جنوں کی طرف ان کی قوم کے نبی آئے اور انسانوں کی طرف انسان اب اگر جنّ کوئی دوسری مخلوق ہے تو اس آیت کے ماتحت نہ تو موسیٰ ان کے نبی ہو سکتے ہیں نہ نبی کریم صلعم الخ ۔

تیسری اور چوتھی دلیل کا خلاصہ ایک ہی ہے یعنی اگر جنّ کوئی دوسری مخلوق ہے تو ان آیات کے مطابق ان کا نبی انسان نہ ہونا چاہیئے بلکہ انسان کے علاوہ نبی ہوں گے ، حالانکہ جملہ انبیاء انسان ہی ہیں اس لئے ان کا جواب بھی ایک ہی ساتھ عرض کرتا ہوں ۔

(باقی آئندہ)

وزیر مامون احمد بن یوسف

از

(ڈاکٹر خورشید احمد فارق ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی)

احمد (عباسی) خلیفہ مامون کا جس نے ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک بغداد میں حکومت کی چوتھا وزیر تھا (مامون کے یکے بعد دیگرے چھ وزیر ہوئے۔ فخری) صولی نے اپنی بیش بہا تصنیف کتاب الاوراق میں اس کا ذکر کیا ہے تاریخ کی سب سے مشہور کتاب تاریخ الامم والملوک مصنفہ طبری (متوفی ۳۱۰ھ) میں احمد کا دو تین جگہ برائے نام ذکر آیا ہے جس سے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مامون کا سکریٹری۔ ابو الفرج اصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) مصنف اغانی نے جو شعر و شاعری اور افراد کی نفسیات و ماحول پر مطبوعہ کتب میں سب سے مفصل کتاب ہے صولی سے احمد کا مواد لیا ہے اور زیادہ تر اس کے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں، اس سے ہم کو نئے حقائق نہیں ملتے خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی مشہور تاریخ بغداد میں جو کچھ ہے صولی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مصنف عقد الفرید ۳/۸ نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ مامون کے چار وزیر تھے اور ان میں سے ایک احمد تھا۔ عقد الفرید کا یہ تعین صحیح نہیں مامون کے وزیر چھ تھے خود عقد نے دوسری جگہ۔ ۳۰۲/۳ پر اس غلطی کی اصلاح کر لی ہے۔)

مرزبانی نے مُوشح میں احمد کے کلام کے ایک دو نمونے پیش کئے ہیں جو صولی میں موجود ہیں جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی البیان والتبیین میں تین جگہ احمد کا نام آیا ہے جس سے بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر اور ادیب تھا۔ فخری نے بھی کوئی نئی بات نہیں لکھی اس کی فصاحت و بلاغت اور تدبیر کے بارے میں عربی کے قدیم مصنفوں کی طرح توصیفی کلمات لکھے ہیں جو بے سیاق و سباق ہونے کی وجہ سے تلمیحات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، البتہ جہشیاری نے کتاب الوزراء والکتاب میں

اس کے خاندان اور مناصب سرکاری کے بارے میں متعدد قیمتی تصریحات کی ہیں جن سے اس کی سوانح کا ڈھانچہ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ارشاد الاریب کے مصنف یاقوت نے بھی کئی واقعات ایسے پیش کیے ہیں جو صولی میں نہیں ہیں اور جن سے احمد کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ عطاالمامون میں جو دور جدید کے ایک مصری مصنف کی کتاب ہے احمد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ صولی ہے۔

احمد قبطی نسل سے تھا اور عرب دفاتر کے اکثر عہدے دار غیر عرب ہی ہوتے تھے ابتدائے اسلام سے دفتروں میں غیر عرب عناصر چھانے لگے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عربوں کو لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ چڑ رہی تھی، اسلام کے بعد وہ فتوحات اور لشکرکشی میں لگ گئے، پھر کچھ عرصہ بعد باہمی پیکار اور عیاشی میں ایسے مشغول ہوئے کہ سب کچھ بھول گئے۔ بنو امیہ کے دفاتر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مالیات کا شعبہ سراسر موالی یعنی آزاد کردہ غلاموں اور غیر مسلموں (نصاریٰ، یہودی، زردشتی وغیرہ) کے ہاتھ میں تھا اور خط و کتابت کے شعبہ میں بھی اکثر موالی تھے۔ ایمانداری، تدبر، اسلامت روی اور وفاداری میں بھی یہ لوگ علاوہ فنی قابلیت کے عربوں پر فائق ہوتے تھے۔ بنو عباس کے دفاتر میں تو عربوں کا تناسب برائے نام تھا۔ پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح (از ۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ) کا وزیر کوفہ کا ایک غیر عرب مالدار ابوسلمہ خلال تھا جس کو نہایت مخلصانہ تبلیغی و عسکری خدمات کے صلہ میں سفاح نے اپنا وزیر بنا لیا تھا اور پھر کچھ عرصہ بعد اس کی خیر اندیشیوں سے عاجز آکر قتل کرا دیا تھا۔ دوسرے خلیفہ منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کے وزیر ابوایوب موریانی (مقتول ۱۵۴ھ طبری ص۱۰) اور ربیع بن یونس ایرانی تھے، تیسرے خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) کا مشہور وزیر یعقوب بن داؤد بھی ایک معزز پارسی خاندان کا فرد تھا اسی طرح رشید کے تینوں وزیر یحییٰ، فضل اور جعفر پارسی افراد تھے اور مامون کے وزیر فضل بن سہل اور حسن بن سہل ایران کے معزز گھرانوں کے چشم و چراغ تھے غرضکہ عباسی دور میں جہاں تک مجھے معلوم ہے شاذ و نادر ہی اہم دفتری عہدے عربوں کے سپرد کئے جاتے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاذ و نادر ہی غیر ایرانیوں کے ہاتھ میں جاتے تھے

احمد کا پردادا صبیح کوفہ کے دفتر (سکریٹریٹ) کے ایک عرب سکریٹری یا کلرک کا قبطی غلام تھا جو بعد میں آزاد ہوگیا تھا۔ یہ عرب عجلی خاندان سے تھا اس لیے صبیح کے لڑکے اور پوتے موالی عجل کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں آزاد ہونے کے بعد غلام کو مولیٰ کہتے تھے اور گوکہ اصطلاحی و قانونی اعتبار سے وہ بالکل آزاد ہو جاتا لیکن رسماً وہ ہمیشہ کے لئے آزاد کرنے والے کا تابع اور جاں نثار بنا رہتا اور ضرورت کے وقت اس کی ہر پکار پر لبیک کہنے پر مجبور ہوتا احمد کا دادا قاسم بڑا ہونہار تھا اکثر اچھے گھرانوں کے افراد اور پڑھے لکھے معزز لوگ غلام بن کر عربوں کے قبضہ میں آجاتے تھے اس لئے وہ اپنے ذہنی رجحانات اور خاندانی روایات کو غلامی کے نئے ماحول میں برقرار رکھنے کی ہمیشہ جد وجہد کرتے۔ قاسم کچھ لکھ پڑھ کر اس عرب کاتب کے ساتھ کوفہ کے دفتر میں جانے لگا وہاں اس نے کلرکی، خط نویسی اور شاید حساب کتاب کی مشق کی اور بنو امیہ کے آخری زمانہ میں کوفہ کے دفتر میں سرکاری کلرک ہوگیا۔ اس نے بڑی ترقی کی کچھ ہی دن بعد وہ اموی خلیفہ ہشام کا سکریٹری ہوگیا اور اپنی غیر معمولی قابلیت سے حکومت میں بڑا رسوخ حاصل کیا، حتیٰ کہ عرب شاعر اس کی فیاضی، تدبر اور سلامت روی کے ترانے گانے لگے۔ ایک عینی شاہد کا کہنا ہے کہ ہم کسی ضرورت سے ہشام کے دربار میں حاضر ہوئے تو ہم نے قاسم کو محل میں ہشاش بشاش دیکھا اس نے ہماری سب ضرورتیں پوری کردیں، ہم نے اس سے زیادہ ہنس مکھ، شائستہ اور فراخ دست آدمی نہیں دیکھا۔ ابو النجم شاعر اس کے پاس آیا ہوا تھا یہ یحییٰ برمکی کا گہرا دوست تھا۔ قاسم کی غزل اور نثر کے کئی نمونے صولی نے پیش کئے ہیں، اس کی غزل میں بڑی دلکش رقت ہے۔

احمد کا باپ یوسف نہایت عمدہ مضمون نویس، شاعر اور مقرر تھا اس نے اپنے باپ کے ساتھ سرکاری دفتروں میں ٹریننگ پائی تھی تاسیس بغداد یعنی ۱۴۵ھ سے پہلے منصور کا دفتر کوفہ میں تھا اس نے یوسف کو متوسط درجہ کے سکریٹری کا عہدہ عطا کیا اور اس کی تنخواہ بقول صولی دس درہم سے بڑھا کر پندرہ درہم (تقریباً ساڑھے سات روپیے)، اور بقول یاقوت بیس درہم

ماہ۔ ۱۲۵۔ ۰ حارث ص۱۶۰ اخبار الطوال ۳۳۸ سے الصولی ص۱۴۲، ۳ الطبری ۹/۳۴۳۵ ارشاد الاریب

یومیہ کردی۔ پھر مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) کے وزیر یعقوب بن داؤد نے اس کو اپنا سکریٹری مقرر کیا یعقوب ۱۶۶ھ تک وزیر رہا اس سال مہدی نے ناراض ہو کر اس کو معزول کیا اور قید میں ڈال دیا ۱۶۶ھ سے مہدی کے عہد کے خاتمہ تک فیض ایرانی وزیر رہا اس کے بعد ہادی کے تیرہ ماہ عہد حکومت میں دو وزیر ہوتے۔ ربیع بن یونس متوفی ۱۶۹ھ اور ذکوان نصرانی ہمیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس چار سال کے عرصہ میں یوسف کے عہدوں کی نوعیت کیا تھی گمان غالب یہ ہے کہ وہ یحیٰی کے ساتھ رہا ہوگا۔ مہدی نے اپنے لڑکے رشید کو بحیثیت ولی عہد ثانی انبار سے لے کر افریقہ تک کی حکومت دے دی تھی اور اس کا انتظام یحیٰی کے سپرد تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب کے بعد یوسف مستقل طور پر یحیٰی کے دفتر سے متعلق ہو گیا تھا۔

یعقوب کی سکریٹری شپ کے بعد یوسف سے ہماری ملاقات ایک بڑے نازک مرحلے پر ہوتی ہے یہ وہ رات ہے جس میں موسیٰ ہادی کا انتقال ہوا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ خلافت کے میراث ہونے کا تصور حضرت علیؓ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس غیر اسلامی تصور کی بدولت جو بے شمار فسادات ہوئے اور لاکھوں بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں ان کی خونچکاں داستان سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں۔ مہدی نے اپنا ولی عہد اول ہادی کو بنایا تھا چونکہ وہ بڑا تھا اور اس کے بعد ہارون الرشید کو لیکن بنو امیہ بلکہ خود بنو عباس کی سنت کے مطابق (جس کو مٹانے بنو عباس بزعم خود اٹھے تھے) ہادی خلافت کا مورث اپنے لڑکوں کو بنانا چاہتا تھا اور بنو ہاشم کے بہت سے شیوخ اور مقتدر فوجی افسر اپنے مفاد کی خاطر نقضِ عہد کے لئے تیار تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ اس رات میں رشید اور اس کے سکریٹری یحیٰی بن خالد کو قتل کر کے صبح ہادی کے لڑکے کو خلیفہ بنا دیا جائے رشید اور یحیٰی اس وقت نظر بند تھے ایک فوجی افسر ہرثمہ بن اعین جس کو خلافت میں بڑا اثر حاصل تھا اس سازش کو تاڑ گیا اور راتوں رات اس نے رشید اور یحیٰی کو قید سے نکال کر رشید کو تخت خلافت پر بٹھا دیا بڑا نازک لمحہ تھا، یحیٰی نے بڑی جرأت اور تیزی سے کام کیا اس وقت اس کی نظر میں سب سے

۱؎ طبری ۴۹۰/۳ ۲؎ اس کے باپ دادا نیساپور کے نصرانی تھے۔ فخری ۱۴۸ ۳؎ معارف ۱۶۶ اخبار الطوال ۳۸۵
۴؎ طبری ۵۲۲/۳ ۵؎ فخری ۱۲۲ ۶؎ طبری ۹۸/۴

زیادہ معتمد اور لائق آدمی یوسف تھا جو اس کا دوست بھی تھا اس کی تحریک پر یوسف نے تمام صوبائی گورنروں اور حکام کو ہادی کی وفات اور رشید کی تاجپوشی کے بارے میں خطوط لکھے اور بقول صولی نہایت خوش اسلوبی سے وہ اس کام سے عہدہ برآ ہوا۔ صبح ہوئی تو حسب دستور فوجی افسروں کو اعلان خلافت سننے بلایا گیا قاعدہ سے تو خود رشید کو اپنی خلافت کی خوشخبری سنانا چاہئے تھی لیکن رشید کی کم عمری (اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال کی تھی) اور جھجک کی بنا پر یحییٰ نے اس کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا[1] اس لئے خطاب عام کے لئے بھی یوسف کو چنا گیا۔ یوسف نے تقریر کی جو صولی اور طبری دونوں نے نقل کی ہے اس میں حسب دستور پہلے اہل بیت کے استحقاق خلافت کا تذکرہ کیا پھر بنو امیہ پر لعنت ملامت کی جو ظالم تھے جنہوں نے خدا کا عہد توڑا تھا جنہوں نے حرام خون بہایا تھا جنہوں نے ناجائز طور پر پبلک کا روپیہ کھایا اڑایا تھا" اس کے بعد رشید کی قابلیت، اس کی فیاضی، (جو اس وقت بڑی اہمیت کی صفت تھی) اس کی رحم دلی کا چرچا کرکے اطمینان دلایا تھا کہ ان کی تنخواہیں، وظیفے اور انعامات (جو ہر تاجپوشی کے موقعہ پر ایک سال یا دو سال کی تنخواہوں کی شکل میں دینے کی رسم تھی) بحال رہیں گے آخر میں ان سے بیعت کی پرزور اپیل تھی[2]۔ تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا، سب نے بیعت کر لی اور رشید کی خلافت مستحکم ہو گئی۔

رشید کے عہد میں (۱۷۰ھ تا ۱۸۲ھ) یوسف کی حیثیت نائب وزیر یا حکومت کے سکریٹری اول کی تھی یعنی وہ یحییٰ برمکی کا دست راست تھا یحییٰ کے بارے میں طبری[3] نے لکھا ہے سنہ ۱۷۰ھ میں رشید نے (بعمر ۲۱ سال) وزارت یحییٰ کو سونپ دی اور اس سے کہا میں نے رعیت کا معاملہ تمہارے سپرد کر دیا ہے اور خود آزاد ہو گیا ہوں تم اپنی صوابدید سے کام کرو جس کو چاہو عہدہ دو جس کو مناسب سمجھو معزول کرو اور حکومت اپنی رائے اور تدبیر سے چلاؤ" پھر رشید نے مہر خلافت بھی یحییٰ کو دے دی دوسری جگہ طبری کہتا ہے رشید نے یحییٰ کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

۱؎ اپنے باپ اور چچا کے عہد میں رشید بعض علاقوں کا گورنر تھا لیکن حکومت کا سارا انتظام یحییٰ کے سپرد تھا اور رشید بس عیش کرتا ٢؎ صولی ۱۵۵ ٣؎ ۱۰/۵۰

(باقی آئندہ)

مرزا غالب کی شاعری اور ان کی شخصیت

(جناب عزیز الرحمٰن صاحب جامعی مہتمم تعلیمی مرکز جامعہ ملیہ احاطہ کالے صاحب دہلی)

یہ مختصر مقالہ انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام غالب ڈے پر ۱۹ر جون کو پڑھا گیا تھا

ہندوستان میں فنل آرٹ کا مانا ہوا فنکار چغتائی جب مٹتے ہوئے ایشیائی تہذیب و تمدن کے نقوش کو نمایاں کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے تو اسے ایشیائی تہذیب کے خد و خال اور تہذیبی اور تمدنی روح مرزا غالب کے اشعار میں ملتی ہے چغتائی کو فن کاری کے لئے مرزا غالب کی شاعری میں ایک وسیع میدان ملتا ہے مصور چغتائی ایشیائی تہذیب و تمدن کے نقوش پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"شاعر ہو یا مصور وہ ایسے راہ پر گامزن ہوتا ہے جہاں ہر قدم پر کہکشاں کے تارے بکھرے پڑے ہیں جہاں کے ذرہ ذرہ میں قوموں کا مستقبل اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ پوشیدہ ہے یہ قدرت کا پیغامبر صنف نازک سے ایک گہرا لگاؤ رکھتا ہے اور زندگی کے سارے سرمایہ کو بے دریغ قدرت کی اس پر اسرار نعمت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے اور اس کے وسیلہ سے عالمگیر اوصاف، آزاد حسن، نازک نازک تمثیلیں اختراع کرتا ہے جو ملکی اور قومی کاموں میں ہمیشہ انقلاب کا باعث ہوئیں۔"

مرزا غالب اس تعریف کے پورے مستحق تھے ایشیائی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کی داستان، اس کی خوبیوں اور برائیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کو مرزا کے کلام میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ مرقع چغتائی کے پیش لفظ میں مصور نے لکھا ہے۔

مرقع شائع کرنے سے میرا مقصد ایشیائی تہذیب کی روح کو قالب پذیر کرنا ہے جس کا بہترین

علمبردار مرزا غالب تھا اس موقع کی اشاعت سے ان نقوش کو جو اب بہت مدھم پڑتے جاتے ہیں ایک نئی زندگی دینے میں مدد ملے گی۔

مصور چغتائی نے ایشیائی تہذیب و تمدن پر موقلمی کرتے ہوئے اور عشق و محبت کی زندگی میں بیتابانہ طلب و آرزو کا نقش پیش کرتے ہوئے مرزا کے اس شعر کو سامنے رکھا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مصور نے مرزا کے اس شعر کو تصویر کا جو لباس پہنایا ہے اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عالم پیری کی بے کسی اور بے بسی میں آرزوئیں اور امیدیں نہ صرف یہ کہ جوان ہی رہتی ہیں بلکہ جوانی کے مدہوش عالم کی طرح ہی لذت یاب ہونے کے لئے بے تاب ہیں تسکین نظر اور لذت یابی کی تمنا کی طرف مرزا نے نہایت ہی اچھوتے انداز میں اشارہ کیا ہے "آنکھوں میں تو دم ہے"

چغتائی نے دوسرے نقش میں "چمن کا جلوہ ہے باعث مری رنگیں نوائی کا" اس مصرع کو سامنے رکھا ہے۔ اس رنگیں نوائی میں مصور نے ایک ایسی دعائیہ تصویر بنائی ہے۔ جسے اقبال کی زبان میں یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

مرزا نے زوال آدم خاکی کے مذہبی تصور کی بجائے ایشیائی حسن و عشق میں ڈوبی ہوئی داستانوں کی زبان میں انسان کے مقام زندگی کو ایسے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ لطیف اشارہ ممکن نہ تھا۔

تیسرا نقش ایشیائی صنف نازک کے فراق کی اس غمناک داستان کو پیش کرتا ہے کہ ایشیا بھر میں ایک جوان اور حسین فرمانبردار بیوی درد فراق میں کس طرح جل جل کر زندگی کے دن پورے کرتی ہے اور اس پر بھی اس کی المناک زندگی کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

اس دردناک ایشیائی معاشرہ کو شکل دیتے وقت مصور نے مرزا کے اس شعر کو منتخب کیا

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مرقع چغتائی کے نقوش کا تذکرہ کرنے سے میرا مقصد مرزا کی شاعری کی روح کو بیان کرنا تھا باقی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ مرزا شاعر تھے یا ایک دکھیا انسان۔ مرزا نے اپنے شعوری دور سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک ایشیا میں عوامی زندگی کو زنگار رنگ مصائب میں تڑپتے ہوئے دیکھا اور آفسردہ ایک دن کہہ اٹھے

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اسدِ خستہ جاں کی بے کفن لاش حقیقت میں کروڑوں ایشیائی انسانوں کی بے کفن لاشوں کی نمائندگی کرتی ہے جنہیں زندگی میں دم بھر کے لئے بھی کبھی چین نصیب نہ ہوا لیکن اس پر بھی وہ جی رہے ہیں اس سے زیادہ حیرت انگیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

مرزا ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اس شعر میں مرزا نے اپنی زندگی کو عبرت کے لئے پیش کیا ہے۔ غور کیجئے کتنا عبرت آموز سبق ہے کہ جب اسد اللہ خاں غالب کو بادشاہ کی خوشامد اور مدح سرائی کے بغیر روٹی نصیب نہیں ہوتی اور بغیر خوشامد اور قصیدہ گوئی کے اس عظیم المرتبت شاعر و فلسفی کو بھی عزت حاصل نہیں ہے تو پھر غریبوں اور مفلسوں کو سرمایہ دارانہ معاشرہ میں قصیدہ گوئی اور خوشامد کے بغیر کس طرح عزت اور روٹی حاصل ہو سکتی

غالب مرحوم ایسے دور کی پیداوار ہیں کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مداحی کی تھی اور وہ قصائد جو عرفی اور نظیری سے مقابلہ کا دم رکھتے تھے ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کئے جا رہے تھے جس کے سر پر جہانگیر و شاہجہاں کا تاج تو ضرور تھا لیکن عرفی اور نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ نہ تھا۔

فتح دہلی کے بعد جو مصیبتیں دہلی والوں پر نازل ہوئی تھیں اور مسلمانوں کے خون کے فوارے

انگریزی سنگینوں سے بہہ رہے تھے ان کو مرزا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا تھا جو عرصہ تک دارالخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں فتح دہلی کے بعد مرزا کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ بہادر شاہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ انگریزی شمشیر چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ایسی حالت میں مرزا زندگی کی نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف غریبی اور مفلسی نے دامن تار تار کر رکھا تھا اور دوسری طرف لوگوں پر بغاوت کے الزامات لگ رہے تھے مرزا زندگی چلانے یا یوں کہئے زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لئے بادشاہ کے قصیدہ کانوں میں چلے آرہے تھے اس لئے انہیں بھی خدشہ ہو گیا کہ میں باغی سمجھا جاؤں گا ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ اشعار کہے

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

۱۸۵۷ء میں دہلی کے خونی واقعات پر دنیا بھر نے آنسو بہاتے تھے۔ مرزا جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یہ اشعار اسی غم و الم کی ترجمانی کر رہے ہیں جس غم و الم سے مرزا کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

مرزا انگریزی غدر کے بعد نہایت خود داری سے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے لیکن حکومت کے تشدد نے ہر خود دار آدمی پر زندگی کے دروازے بند کر دئے۔ مرزا شاعر تھے انھیں روزی کمانے کا کوئی دوسرا ڈھنگ ہی نہ آتا تھا اور مدت سے بادشاہی وظیفے پر زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے اسی وظیفہ کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے انگریزی حکام کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ایسے مشکل اور نازک حالات میں مرزا کو اپنی طبیعت اور مزاج کے خلاف جو فیصلہ کرنا پڑا

ظاہر ہے اس سے ان کی توقیر و عزت کم نہیں ہوئی۔ خونریز انقلابی دور میں بڑے بڑے بہادروں کو مرزا سے بھی زیادہ ناگوار فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔

مولانا آزاد مرزا کے بارہ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں "غدر کے بعد مرزا گھر سے باہر نہ نکلتے تھے اور آخر تک گھر ہی میں بند رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی سرکاری فوج حکیم محمود خاں اور مرزا غالب کے مکانوں کی حفاظت کرتی تھی انگریزی غدر کے بعد گو ضرورتِ وقت اور احتیاج نے بعض انگریزی حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا اور مدحیہ قصائد لکھواتے تھے ایک ضعیف الارادہ انسان حالات کی مجبوری سے صدہا باتیں دل کی پوری ناخوشی کیساتھ کرتا ہے مگر کبھی اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں جاتے۔"

ان قصیدہ خوانیوں کے باوجود سرکاری حلقوں میں ایک مدت تک مرزا کی وفاداری کا یقین نہ کیا جاسکا اور وہ ایک باغی ہی سمجھے جاتے رہے۔ مرزا کے لئے یہ حالت انتہائی صبر آزما تھی ایک شاعران کڑی منزلوں کا مرد نہیں ہو سکتا۔ ان حالات کی روشنی میں مرزا کا یہ شعر پڑھئے تو واقعات کی مسلسل تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

عشق و حسن کی دنیا کا جائزہ لیتے وقت بھی مرزا نے ایشیا کے معاشرہ کو سامنے رکھا ہے ایشیا کے کروڑوں درد مند دلوں سے جو آہیں شب و روز نکلتی ہیں۔ انھیں مرزا نے اس طرح محسوس کیا گویا مرزا کا دل و جگر پھٹ گیا ہے فرماتے ہیں۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرزا کے کلام اور ان کی شخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

دہلی کے غالب نہیں بلکہ ایشیائی تہذیب و تمدن کے علمبردار کو رخصت ہوئے ایک صدی کے قریب ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب آج بھی زندہ اور پائندہ ہے۔

تعمیر اردو کے زیر اہتمام اردو کے شائع کی موجودہ تحریک کے زمانہ میں آج ہندو مسلمانوں

اور سکھوں نے مل کر غالب ڈے منایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ . . . . . یہ صرف چند نوجوانوں کی زندگی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ غالب کے غیر فانی زندہ جاوید تخیلات و افکار نے پھر دہلی کی پژمردہ و افسردہ فضا میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

غالب اسکول کے متعلق مرا یقین ہے کہ یہ ایک ایسا سکوں ہے جس کے زبان و ادب، شاعری اور انشار کو زمانہ کے انقلابات اور متعصبانہ تحریکیں نہیں مٹا سکتیں۔

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

ایک مکتوب گرامی

(از جناب مولانا سید محمد میاں صاحب مرادآبادی ناظم جمعیۃ علماء ہند)

"ذیل میں ہم اپنے فاضل و محترم دوست جناب مولانا کا وہ خط شائع کرتے ہیں جو موصوف نے برہان کے گذشتہ مقالہ "پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت" کو ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کی علمی و دینی بصیرت محتاج تعارف نہیں اس لئے اس خط میں جو چند نقاط زیر بحث لائے گئے ہیں وہ کافی غور طلب ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ خط اس وقت ملا جب کہ مکتوب الیہ بیماری کے باعث صاحب فراش ہے اس لئے نہ اس کا جواب لکھا جا سکا اور نہ برہان کے لئے وہ مقالہ ہی تیار ہو سکا جس کو اس اشاعت میں آنا تھا بشرط صحت آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کی جائے گی۔ (ایڈیٹر)

محترم مولانا۔ دامت نیوضکم و عمت		السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ		مزاج گرامی

جناب کا مضمون میں نے کل ہوائی جہاز کی فرصت میں مطالعہ کیا۔

محترم مولانا۔ آپ نے اس مضمون سے اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے غور و فکر کی ایک سبیل معین کر دی۔ بہت سی جزئیات کے لئے ایک صحیح اصول پیش کر دیا۔

اسلامی حکومت کی تعریف کر کے درحقیقت نواب زادہ لیاقت علیخاں اور ان کی پارٹی پر کافی بہت بڑا احسان ہو گیا شاید یہ توجیہ ان کے سامنے بھی اس انداز سے نہ ہو گی۔ اسی طرح ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے تقسیم کے وقت اگر کوئی معاہدہ نہ بھی ہوا ہو تو نہرو لیاقت معاہدہ نے اقلیت کے آئینی اور دستوری حقوق پاکستان پر لازم کر دئے لیکن آپ کے مضمون کے مطالعہ سے ایک شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اور میری طرح خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہوا ہو گا۔ آپ کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بحالت موجودہ اس بنا پر کہ

اور عیدین کی اجازت ہے اور مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ دارالاسلام ہے حالانکہ جس عبارت سے آپ استدلال کر رہے ہیں اس میں تحت حکم ولاۃ امور نا۔ موجود ہے اس فقرہ کا جو ترجمہ آپ نے کیا ہے وہ بھی خلجان میں اضافہ ہی کردیتا ہے۔ درمختار وغیرہ کی بہت سی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے اور اکابر علماء کے فیصلوں سے بھی یہی ثابت ہے کہ جب تک مذہبی امور میں مسلمانوں کا بااختیار نظام نہ ہو۔ دارالاسلام نہیں ہے اور اگر کسی ملک میں بیبا اختیار نظام نہ ہو تو اس کا قایم کرنا ضروری ہے اور اسی بناء پر درمختار میں فتاویٰ باب قضاء میں یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایسا امیر بنائیں جو جمعہ قایم کرسکے اور نکاح وغیرہ کے معاملات انجام دے سکے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر اسی مسئلہ کو پیش کرتے رہے اور جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ نظام قضاء جس کو غالباً کلچرل اٹانمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں مسلمان حکام اور نمازوں کی آزادی انگریزی دور میں بھی تھی مگر اس زمانہ میں علماء نے ہندوستان کو دارالاسلام نہیں کہا۔ البتہ بھوپال اور حیدرآباد کو درمختار کی اس عبارت کے بموجب دارالاسلام تسلیم کرتے رہے۔

گویا۔ دارالاسلام کے لئے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ البتہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اندرونی معاملات ان کے وُلاۃِ امور اور نُوّاب کے حوالے کردیے گئے ہیں تو وہ دارالاسلام ہو جائے گا۔ اس جرح کے بعد موجودہ ہندوستان کی حیثیت کا سوال پھر باقی رہ گیا۔ دارالحرب یقیناً نہیں ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ محارب نہیں۔ مکہ کی مثال بھی صادق نہیں آتی اور مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور یہودیوں کو ملاکر سیاسی وحدت قایم کردی گئی تھی۔ مگر عدالت عالیہ۔ حضرت سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل وانصاف تھا اور اسی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے سپرد تھا۔

حبشہ میں مسلمان مستامن تھے۔ پناہ گزیں تھے۔ حبشہ کو وطن نہیں بنایا اور اس دور پناہ گزینی

میں جو حبشہ نے امداد کی اس کے عوض میں مسلمانوں نے بھی جنگ میں شاہ حبشہ کی فوجوں کی امداد
کی بموجب "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" لہذا حبشہ پر بھی ہندستان کو قیاس نہیں کر سکتے

اب ایک اہم خدمت یہ ہے کہ آپ ہندستان کی حیثیت معین کریں کتب فقہ میں دو ہی
"دار" کا تذکرہ آتا ہے دارالاسلام اور دارالحرب لیکن قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اور بھی ہوں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند میں غالبًا "الدر المنتقی"
کے حوالے سے ایک تیسرا دار بھی بیان فرمایا ہے یعنی دارالامن لیکن یہ کتاب مجھے ملی نہیں۔ اس کتاب
کا صحیح نام تو خطبہ صدارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر جناب کے پاس نہ ہو تو احقر دہلی پہنچ کر لکھ
دونگا مگر بہر حال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے دو باتیں اور بھی عرض
کر دوں۔ ان دونوں سے احقر کو مسرت ہوئی۔ کیونکہ آج تک ان دونوں خیالات میں کسی کی تائید
نہیں حاصل ہوئی تھی آپ کی تحریر سے تائید حاصل ہو گئی۔

اول یہ کہ خلافت راشدہ خیر القرون سے اس لئے آگے نہیں بڑھ سکی کہ ایسے آدمی نہیں
رہے تھے احقر کا خیال بھی یہی ہے۔

بظاہر خلافت راشدہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام ذمہ دار تقویٰ اور عبادت کے
تربیت یافتہ اور صاحب بصیرت و تفقہ ہوں

سیدالانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے جن کی تربیت کی تھی ان کا ایسا دور جس
میں اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں ہوتا وہ کم و بیش تیس سال تک رہنے والا تھا۔

سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی آپ کے بعد دیانت و امانت
کی ترقی نہ ہوگی بلکہ تدریجی تنزل شروع ہو جائیگا۔ لہذا آپ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد خلافت تیس
سال رہے گی پھر ملک عضوض شروع ہو جائے گا ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو طبعی حالات کے قیاس
پر مبنی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ فیصلہ ہر ایک خلجان کو ختم کر دیتا ہے کہ

قرون ثلاثۃ مشہود لہا بالخیر۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہو جاتے ہیں البتہ حضرت شاہ صاحبؒ بے شمار احادیث کی روشنی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کو بھی خلافت راشدہ ہی قرار دیتے ہیں البتہ خلافت راشدہ غیر منتظمہ۔ اعد حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات کے مطابق خیر القرون کے علی الترتیب یہ تین درجے ہوتے ہیں۔

۱۔ دور نبوت۔

۲۔ خلافت راشدہ علی منہاج النبوت

۳۔ خلافت راشدہ منتظمہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے

لیکن آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور کے بعد اسلامی خلافت یا دینی حکومت صحیح معنوں میں کبھی قائم نہیں ہوئی ابتدائی دور کے ساتھ تحدید پر مجھے شبہ ہے۔

دوسری بات جس سے مجھے اطمینان ہوا کہ آپ سے اس کی تائید حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ ستی کی رسم جو مسلمان بادشاہوں کے دور میں جاری رہی تو اس کا سبب مسلم حکام کی بے پرواہی اور بے اعتدالی نہیں تھی بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے رسم و رواج میں مداخلت کبھی بھی گوارا نہیں کی اگرچہ احقر کے خیال میں اصولاً اُن کے لئے لازم تھا کہ وہ اس رسم کو بند کرتے۔ کیونکہ یہ ایسا فعل ہے جو نہ صرف اسلام کی رو سے ناجائز ہے بلکہ اقوام عالم کے مسلمات کے خلاف ہے۔ ورجس طرح نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ ہوگی کہ مجوسی۔ ماں یا حقیقی بہن سے شادی کر سکے اسی طرح ستی کی رسم بھی تھی۔ تاہم اگر اس کو ختم نہیں کیا گیا تو اس کا باعث ان کا یہی تخیل تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کوئی مداخلت نہ ہونی چاہئے۔

میں نے کافی وقت سے لیا۔ اور اپنا بھی اتنا ہی وقت صرف کر دیا مگر میرا خیال ہے کہ اس طویل تحریر میں جس تحقیق کی آپ سے درخواست کی ہے اگر وہ منظور ہوئی تو مجھے بھی فائدہ ہوگا اور عام مسلمانوں کو بھی۔ محترم مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی خدمت میں سلام پیش فرما دیجئے۔ بچوں کو دعا فرما دیجئے۔

تبصرے

بزمِ صوفیہ از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے تقطیع کلاں ضخامت ۵۲۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت غالباً آٹھ روپے ہے، پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

اس کتاب میں لایق مصنف نے عہدِ تیموریہ سے قبل کے اُنیس جلیل القدر بزرگانِ دین قدس اللہ اسرارہم کے حالات و تعلیمات اور ان کے تبلیغی کارناموں کو عہدِ حاضر کے ایک مذاق شناس مؤلف کی حیثیت سے شستہ و شگفتہ انداز بیان میں پیش کیا ہے! ان بزرگوں کے اسماء گرامی یہ ہیں

شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ (د ۔ ۴۶۵ھ) حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۶۳۲ھ) خواجہ بختیار کاکیؒ (م ۶۳۴ھ)، قاضی حمیدالدین ناگوریؒ (م ۶۴۱ھ) شیخ بہاؤالدین زکریا سہروردیؒ (م ۶۵۶ھ)، شیخ صدرالدین عارفؒ (د ۶۱۱ھ ۔ ۶۸۴ھ)، خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ (د ۵۸۴ھ ۔ ۶۶۴ھ) شیخ فخرالدین عراقیؒ (م ۶۸۸ھ) شیخ امیر حسینیؒ (م ۷۲۹ھ) حضرت محبوب الٰہیؒ (د ۶۳۴ھ ۔ ۷۲۵ھ) شیخ بوعلی قلندرؒ (د ۶۰۵ھ ۔ ۷۲۴ھ)، شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ (م ۷۳۵ھ)۔ شیخ برہان الدین غریبؒ (د ۶۵۴ھ ۔ ۷۳۸ھ)، مولانا ضیاء الدین نخشبیؒ (م ۷۵۱ھ) خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ (م ۷۵۷ھ) شرف الدین احمد منیریؒ (د ۶۶۱ھ ۔ ۷۸۲ھ) سید جلال الدین بخاریؒ (د ۷۰۷ھ ۔ ۷۸۵ھ) سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ (د ۸۰۸ھ) سید محمد گیسودرازؒ (د ۷۲۱ھ ۔ ۸۲۵ھ) رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

فاضل مؤلف کتاب نے محقق و مستند واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمارے سامنے ان بزرگوں کی زندگی کا مرقع خود ان کے ملفوظات، مکاتیب اور تاریخ و تذکرہ کی معتبر کتابوں کی روشنی میں کھینچا ہے، اس کتاب کو پڑھ کر قارئین کو سلف صالحین کا وہ "اسوہ" نظر آئیگا

جس پر چل کر امت مسلمہ اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ البتہ ان ناگزیر خامیوں کے علاوہ جن کی طرف مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تقریب میں اشارہ کیا ہے بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو تشنۂ تحقیق رہ گئی ہیں چنانچہ حضرت مخدوم جہاں شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری قدس سرہ العزیز کے تذکرہ میں مؤلف کتاب کی تصریح ہے کہ ا-

"تعلیم ہی کے زمانہ میں استاذ کی دختر نیک اختر سے عقد مناکحت کی رسم ادا ہوئی جن سے تین اولاد ہوئیں ان میں سے حضرت زکی الدین زندہ رہے اور ان ہی سے نسل چلی" ص۳۵

حضرت مخدوم جہاں کی اولاد میں سے جن دو کا ذکر مؤلف کتاب نے بالکل ہی نسیا منسیا کر دیا ہے ان کے متعلق کافی چھان بین کی ضرورت تھی، اسی طرح یہ دعویٰ کہ حضرت زکی الدین ہی سے نسل چلی محتاج دلیل ہے۔

مؤلف نے مذکورہ بالا عبارت میں جو کچھ کہا ہے وہ صاحبان بہار شریف کی روایت کا خلاصہ ہے، اس کے برعکس صاحبان منیر شریف کی روایت یہ ہے کہ حضرت مخدوم زکی الدین سے نسل نہیں چلی اس لئے کہ وہ سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، بلکہ یہ نسل حضرت مخدوم جہان کی صاحبزادیوں سے چلی ہے ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام "بی بی فاطمہ" تھا جو اپنے ابن عم مخدوم شاہ اشرف بن مخدوم شاہ خلیل الدین رحمہما اللہ کے حبالۂ عقد میں آئیں، صاحبان منیر شریف کا سلسلۂ نسب ان ہی سے ملتا ہے (انوار ولایت ص۱۲۶ مصنفہ شاہ عبدالقادر ابوالعلائی بحوالہ آثار منیر ص۱۶)۔ دوسری صاحبزادی بی بی زہرہ تھیں جو حضرت قمر الدین بن مولانا میر شمس الدین مازندرانی کے عقد مناکحت میں آئیں یہ دونوں صاحبزادیاں بڑی درگاہ منیر شریف میں آسودہ ہیں جب روایتیں اس قدر مختلف ہیں تو ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی روایت کو بلا دلیل ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ مؤلف موصوف کی خانوادہ مخدوم سے گہرے تعلقات و مراسم ہیں لہذا وہ اس سلسلہ میں مزید تحقیق کریں تو بہت ممکن ہے کہ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ بہر حال کتاب اس لائق ہے کہ ہندو مسلمان، مرد عورت ہر ایک اس کو پڑھے۔ اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا

تحقیقی نوادر | تقطیع متوسط ضخامت ۱۸۰ صفحات کتابت و طباعت خاصی

یہ کتاب محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے کے جو مہارانی کالج میسور میں اردو فارسی کی لکچرر ہیں چند علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ ہے موصوفہ جیسا کہ انھوں نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے برسوں سے سید انشاء اللہ خاں انشا اور خصوصاً ان کی مشہور کتاب دریائے لطافت پر ریسرچ کر رہی ہیں چنانچہ اس مجموعہ کے اکثر مقالات اسی سلسلہ کی کڑی ہیں ان میں سے ایک مقالہ جو دریائے لطافت مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی پر تنقید سے متعلق ہے اپریل ۵۸ء کے برہان میں شائع بھی ہوچکا ہے اس میں شبہ نہیں کہ فاضلہ مصنفہ کے یہ سب مضامین اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی نظر اردو ادب کی تاریخ۔ اس کے قواعد اور زبان کی ترقی کے مختلف ادوار پر بہت گہری اور محققانہ ہے اس زمانہ میں جبکہ اردو زبان سے متعلق تحقیق کا ذوق مردوں میں بھی کم ہوتا جارہا ہے۔ جنوبی ہند کی ایک خاتون کا یہ تحقیقی کارنامہ بہت زیادہ لائق تحسین و ستائش اور مستحق داد ہے البتہ یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ محترمہ نے اس مجموعہ کے مقالہ "انشا کے [illegible] حریف" میں اپنی بحث کی زیادہ تر بنیاد کلیات سودا کے اس قصیدہ پر رکھی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

کیا حضرت سودا نے کی اے مصحفی تقصیر — کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

موصوفہ نے اس قصیدہ کو مرزا سودا کی طرف منسوب کیا ہے اور ان کی بحث کا دارومدار اسی نسبت پر ہے حالانکہ کلیات سودا مطبوعہ مطبع مصطفائی ۱۲۷۰ھ کے فارسی دیباچہ میں مرزا مرحوم کے تلمیذ ظہور علی صاحب صاف لکھتے ہیں کہ یہ قصیدہ مرزا کا نہیں بلکہ خود ان کا اپنا ہے انھوں نے دیباچہ میں دیباچہ اور یہ قصیدہ لکھ کر کلیات میں شامل کرنے کی وجہ بھی بتائی ہے اور ایک دو مقام پر نہیں بلکہ کئی جگہ اس کی تصریح کی ہے کہ یہ قصیدہ مرزا کے شاگرد کا ہے حیرت ہوتی ہے کہ موصوفہ ایسی محققہ سے اتنی بڑی فروگذاشت کیوں کر ہوگئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہنا ہے کہ مصنفہ نے ان مقالات میں انشا کی جس والہانہ انداز میں تعریف و مدح اور اس کے بالمقابل نواب سعادت علی خاں رنگین، شیخ مصحفی اور مولانا محمد حسین آزاد کی تنقیص و مذمت کی ہے وہ ایک

محقق کے شایان شان نہیں اور یہ لب ولہجہ کم از کم ایک سنجیدہ قلم خاتون کو زیب نہیں دیتا ان دو تین فروگذاشتوں سے قطع نظر محترمہ آمنہ خاتون کا ذوقِ تحقیق، فنی بصیرت، اور وسیع مطالعہ بہرنوع لایق صد آفریں ہے اور ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ سید انشا پر ان کی محققانہ کتاب اردو ادب کا ایک نہایت قیمتی شاہکار ہوگی۔

بوستان حسرت تقطیع کلاں ضخامت ۱۳۶ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت درج نہیں پتہ:۔ کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڈھ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی جو ہماری گذشتہ محفل علم و ادب کی آخری بہار ہیں چند در چند اوصاف و کمالات کے جامع ہونے کی حیثیت سے ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں جناب موصوف دولت زر کے ساتھ دولتِ علم سے بھی مالامال ہیں علم وفضل کے علاوہ اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب اور اردو فارسی کے شاعرِ شیوابیان بھی ہیں چنانچہ یہ کتاب آپ کے ہی فارسی کلام کا مجموعہ ہے موصوف شعر کبھی کبھی اور کسی خاص تقاضہ سے مجبور ہو کر ہی کہتے ہیں اس وجہ سے کلام کی مجموعی تعداد آپ کی عمر کی نسبت سے بہت کم ہے اور اس بنا پر اس مجموعہ کو ایک باقاعدہ اور کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر کے کلام کی حیثیت سے جانچنا بھی درست نہ ہوگا۔ بہر حال زبان کی شستگی اور صفائی، خیالات کی سادگی اور حسن و عشق کے راز و نیاز کی لطافتیں الفاظ کی موسیقیت اور تغزل کا سوز و گداز چند چیزیں اس مجموعہ میں جگہ جگہ نظر آئیں گی جو صاحبِ تصنیف کے ادبی و شعری مذاق کی شگفتگی اور زندہ دلی کا ثبوت ہیں

ادبیات

"آخر کب.......؟"

(جناب شمس نوید صاحب)

یہ شامِ محرم اشک و فغاں! — قرنوں کی اندھیری راتوں سے
یوں حال پہ کب تک لپکے گا ماضی کا سراسیمہ سایہ؟
اُس حادثۂ خونیں کی قسم! اُس حادثۂ خونیں کے لئے
توہینِ جرائم کارانہ ہے تیرا سرِ شکِ بے مایہ!
یہ تیرا سرِ شکِ بے مایہ تقدیر کا طوفاں کب ہوگا
آخر تو مسلماں کب ہوگا

کچھ سطح سے اونچا لایا گیا ہر روک پہ چلتے دھاروں کو
ٹھوکر میں سبک گامی کے لئے للکار نہیں تو پھر کیا ہے
لیکن وہ قدم جو ٹھوکر کے ماتم میں ٹھٹک کر رک جائے
وہ عزم و عمل کی گردن پہ تلوار نہیں تو پھر کیا ہے
خود اپنی ہلاکت کاری کی فطرت سے پشیماں کب ہوگا
آخر تو مسلماں کب ہوگا

کرتا ہے ابھی باطل حق کی رگ رگ میں وہی خوں آشامی
رکھی ہے یزیدی طاقت کی تلوار حسینی مرقد میں
اس المیۂ ماضی میں فقط کچھ "خون" مقدس بھینٹ چڑھے
اس المیۂ نو میں پورا اسلام ہے باطل کی زد میں
جس درد کا ماتم کرتا ہے اس درد کا درماں کب ہوگا
آخر تو مسلماں کب ہوگا

REGISTERED No D148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱ محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہینگی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہینگے۔

۲ محسنین: جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے، نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان بکسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائینگے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائیگا۔

۴ احباء۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلاقیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائینگی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دے دیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ / ۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا